

سہ ماہی

منہاج

جلد: ۱۰ رجب و شوال ۱۴۱۲ھ شمارہ: ۱-۲
جنوری و اپریل ۱۹۹۲ء

فقہی، علمی، تحقیقی مجلہ

سہ ماہی

منہاج

لاہور

اسلامی معیشت نمبر

حافظ غلام حسین

مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور

بدل اشتراک

فی پرچہ	= ۵۰/ روپے
سالانہ	= ۱۵۰/ روپے

بانی

مولانا سید محمد متین ہاشمی رحمتہ اللہ علیہ سابق ڈائریکٹر ریسرچ سیل

ناشر

حافظ غلام حسین قائمقام ڈائریکٹر ریسرچ سیل

طابع

لیاقت بلوچ میٹرو پرنٹرز
چیمبرلین روڈ لاہور

قیمت شمارہ ہذا ○ -/۱۶۰ روپئے

ادارہ کا مقالہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔



اسلامی معیشت نمبر

جہات	مدیر مسئول	۵
موجودہ بنکنگ اور اسلامی بنکاری	ڈاکٹر محمود الحسن عارف	۱۰
اسلامی معیشت اور سود	مولانا عبد الرحمن کیلانی	۵۷
سُود ۔ قبیح ترین جرم	ریاض الحسن نوری	۱۲۱
درجاتِ معیشت اور اسلام	ممتاز احمد سالک	۱۴۵
کسبِ معاش کا اسلامی نظریہ	ڈاکٹر حافظ محمد سلیم	۱۷۸
مضاربت قرآن و حدیث کی روشنی میں	ڈاکٹر فرید الدین	۱۹۷
اسلامی حکومت اور اس کی معاشی ذمہ داریاں	صوبیدار لطیف اللہ	۲۴۴
بیروزگاری کے مسئلے کا اسلامی حل	سید خالد محمود ترمذی	۲۷۵
اسلام میں قرضِ حسنہ کی حیثیت	مولانا مبشر احمد	۲۹۷

احتکار	پروفیسر محفوظ احمد	۳۴۳
اسلام میں بیت المال کا تصوّر	ڈاکٹر حمید اللہ	۳۵۸
اغنیاء کے اموال میں فقراء کا حق	حافظ محمد سعد اللہ	۳۸۹
ٹیکس کی شرعی حیثیت	مولانا فضل الرحمان بن محمد	۴۱۸
پاکستان میں نظامِ زکوٰۃ و عشر کی اصلاح کے لیے تجاویز و منصوبۂ عمل۔	جناب محمد ایوب	۴۳۸



جہات

پاکستان اور اسلامی نظامِ معیشت

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم اَمَّا بَعْدُ!

"سہ ماہی منہاج" کا اسلامی معیشت نمبر پیش کرتے ہوئے مجھے مسرت اور غم دونوں ایک ساتھ محسوس ہو رہے ہیں۔

"مسرت" کی وجہ تو یہ ہے کہ مرکزِ تحقیق کو وقت کے اس اہم ترین مسئلے پر ملک کے نامور علماء اور ماہرین کے "افکار" پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جو یقیناً بہت بڑی سعادت ہے۔

جبکہ "غم" کا باعث یہ ہے کہ یہ خصوصی شمارہ جس شخصیت کے فکر کا مظہر اور جس ہستی کے خواب کی تعبیر ہے وہ آج ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ میری مراد سہ ماہی منہاج کے بانی مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب۔ قدس سرہٗ سے ہے جنہیں آج بھی مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں۔ مرحوم نے یہ کہ صرف اس شمارے کا بنیادی تصور پیش کیا بلکہ اس کا بنیادی خاکہ بھی بنایا اور اس کے لیے مقالہ نگاروں کا بھی انتخاب کیا۔ مگر افسوس آج وہ ہمارے اندر موجود نہیں ہیں، اور انہیں اس خصوصی نمبر کی اشاعت کا موقعہ نہ مل سکا مگر مجھے یقین ہے کہ اپنے خواب کی اس تعبیر پر، ان کی روح عالم بالا میں ضرور خوش ہو رہی ہو گی۔

ہم یہاں کچھ عرض کرنے سے پیشتر مولانا مرحوم کا وہ اقتباس نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو انہوں نے ڈاکٹر نور محمد غفاری کی کتاب "سرمایہ دارانہ نظامِ انشورنس اور اسلام کا نظامِ کفالت عامہ" کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"عہد جدید کو عہد معاشیات کہا جاتا ہے ان معنوں میں کہ عصرِ حاضر میں جتنے انقلابات

ممالکِ عالم میں رُونما ہوئے اکثر وبیشتر ان کی اساس معاشی تھی فیوڈلزم FUDALISM کا نظام شکست وریخت کا شکار ہوا۔ بادشاہتیں رخصت ہوئیں اور ذرائع معاش میں وسعت پیدا ہوئی۔ نئی ایجادات ہوئیں، سائنس نے ترقی کی، کارخانے قائم ہوئے، رسل و رسائل ابلاغ عامہ کے سلسلے وسعت پذیر ہوتے، برسوں کے سفر منٹوں میں طے ہونے لگے۔ لاسلکی ذرائع ظاہر ہوئے پھر الیکٹرانک کا دور آگیا اور آج پوری دنیا ایک کنبہ کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ ان تمام ترقیات کو سرمایہ دارانہ نظام نے جنم دیا اور پھر پور تحفظ فراہم کیا لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ سرمایہ دارانہ نظام درحقیقت ظالم ترین استحصالی نظام ہے جس نے طبقات جنم دیے اور صرف افراد ہی کو نہیں بلکہ ملکوں کو جبر واستحصال کا شکار بنایا۔ ایسی فضا میں فطرت انسانی کے مطابق حسد اور عناد کا پیدا ہونا ضروری تھا، کیونکہ ایک طبقہ ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر حکم دیتا تھا ائیر کنڈیشنڈ کاروں میں سفر کرتا تھا، اپنے بچوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے کتوں کو بھی بہترین رزق اور تحفظ فراہم کرتا تھا اور محنت کش طبقہ ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں زندگی بسر کرتا تھا، کتّے کیک کھاتے تھے، اور محنت کش طبقے کے بچے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترستے تھے۔ ان کی پرورش کیچڑ بھری نالیوں کے کیڑوں کی طرح ہوتی تھی، تعلیم سے وہ محروم تھے۔ انصاف انہیں میسر نہ تھا جسمانی صحت کا ان کے لیے کوئی نظام نہ تھا۔ لہٰذا لازمًا اس کا ردعمل ہونا تھا اور وہ ردّعمل اشتراکیت کی شکل میں ہوا۔ اشتراکیت نے بڑے خوش کن نعرے لگائے اور اس کے جھنڈے کے نیچے پسے ہوئے عوام اکٹھا ہوگئے۔ پھر کارل مارکس کے فلسفے نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ کروڑوں انسان مارے گئے۔ طبقاتی کش مکش شروع ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کا سفینہ تقریبًا غرقاب ہوگیا ـــــ بستی بستی اور نگری نگری میں کسانوں اور مزدوروں کی تنظیمیں قائم ہوئیں جنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب اقتدار محنت کش طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ محنت کشوں کی ریاستیں بنیں اور عوام سنہری جال میں گرفتار ہوگئے۔ فکر پہ پہرے بٹھا دیے گئے، آزادیٔ اظہار چھین لی گئی مسجدوں اور گرجاؤں کو کلب گھروں اور ناچ گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ مذہب کو افیون قرار دیا گیا اخلاقی قدروں کو فرسودہ روایات قرار دے کر یکسر پامال کر دیا گیا لیکن بقول علامہ اقبال

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

گورباچوف کا دور آتے ہی الحمد للہ کہ کمیونزم کا تیا پانچا ہو گیا اور اب لینن کے بت جو روس کے چوراستوں پر ستر برس سے نصب تھے ڈھائے اور گرائے جا رہے ہیں کمیونزم کے حامیوں کو اس کی حقیقت کا پتہ چل گیا ہے مختصر یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت دونوں شکست کھا گئے ہیں اب دنیا میں کوئی ایسا نظام نہیں ہے جو طبقاتی کش مکش کو دور کرے اور عوام کی معاشی فلاح کا ضامن بنے۔ اب ساری دنیا کی نگاہیں اسلام کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اقبال نے اس کا ایک ہی حل بتایا ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار[1]

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت نے نوعِ انسانی کو اخلاقی اعتبار سے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جلبِ منفعت کے تقاضے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ انسان انسان کے خون تک کا پیاسا ہو گیا ہے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ نظام انسانیت کو دو مرتبہ بھیانک ترین جنگوں میں دھکیل چکا ہے اور اب بھی جہاں کہیں جنگ کے بادل منڈلاتے ہیں اس کی تہ میں اسی سرمایہ دارانہ ہوس کاری کا عمل دخل ہوتا ہے چنانچہ پوری دنیا ایسے نظامِ معیشت جس میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز نہ ہو، سے نالاں ہے اور ایک ایسے نظامِ معیشت کی تلاش میں ہے جو انسانی قدروں کے موافق ہو۔

اشتراکی نظامِ معیشت سوویت یونین کی شکست و ریخت کے ساتھ ہی اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہا ہے اب وہ مسلمان ممالک جو کسی نہ کسی حد تک ان دونوں معاشی نظاموں سے متاثر تھے ان میں اسلامی نظامِ معیشت کو اپنانے کی فکر پیدا ہو رہی ہے۔ اگرچہ یہ فکر ابھی تحریک کی شکل نہیں اختیار کر سکی

---

[1] سرمایہ دارانہ نظامِ انشورنس اور اسلام کا نظامِ کفالتِ عامہ ص ۱-۲

اور ابھی تک کام فکری بنیادوں پر ہی ہو سکا ہے عملی طور پر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے تاہم یہ بات بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے خوش آئند ہے۔

جہاں تک پاکستان میں اسلامی نظامِ معیشت کے اجرأ کا تعلق ہے تو یہاں اس سلسلے میں چند ایک عملی اقدام بھی کیئے گئے ہیں مثلاً زکوٰۃ و عشر کے نظام کا احیاء۔ نفع نقصان میں اشتراک کی بنیاد پر بینکاری۔ مضاربہ کمپنیوں کا اجرأ۔ بیت المال کا قیام وغیرہ۔

ان اقدامات میں سے عشر زکوٰۃ کا نظام تقریباً ناکامی کے دہانے پر کھڑا ہے اور اس میں اصلاح کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھایا جا رہا ۔ اس کا غلط استعمال لوگوں میں اس نظام سے متعلق بدگمانیاں پیدا کر رہا ہے۔ اس تجربہ میں جو خطا کے پہلو سامنے آ رہے ہیں ان کو درست کرنے کی بڑی شدید ضرورت ہے ورنہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کو ناکام کرنے کی سازش کے مترادف ہوگا۔

بیت المال کا قیام بہت اچھا اقدام ہے لیکن اس میں جو غور طلب چیز ہے وہ بیت المال کے ذرائع آمدن کا پہلو ہے اسلامی حکومت کے بیت المال سے زکوٰۃ و عشر الگ نہیں رکھے جا سکتے البتہ دیگر ذرائع آمدن بھی بیت المال میں جمع ہوتے ہیں جو اپنے اپنے طے شدہ مصارف میں صرف ہوتے ہیں۔ بیت المال کی حیثیت اسٹیٹ بنک کی سی ہے۔ جبکہ یہاں بیت المال کو صرف کچھ رقم دے کر اسے سوسائٹی کے معدودے چند افراد کی جزوی کفالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے جو کسی بھی طرح اسلامی حکومت کے بیت المال کے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔

پی۔ ایل۔ ایس اکاونٹ پر پہلے ہی رسائل میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ بات اب طشت از بام ہے کہ مارک اپ اور مارک ڈاؤن سود سے پاک صورت کاروبار نہیں ہے۔ اور یہ اسلامی مضاربت و شراکت کی کسی صُورت پر منطبق نہیں ہوتا۔ ایک بات جو اسلامی نظامِ معیشت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ اور محنت مساوی حقوق رکھتے ہیں بلکہ محنت کو ایک درجہ فوقیت حاصل ہے جبکہ بنک جمع شدہ سرمایہ پر کوئی محنت نہیں کرتا نہ تو اس سے خود فیکٹری لگاتا ہے اور نہ خود تجارت کرتا ہے بلکہ حفاظت اصل زر مع طے شدہ نسبت نفع پر آگے کسی کے حوالے کر دیتا ہے جو صریحاً سُود ہے۔

معاشیات کو اسلامی سانچے میں ڈھلنے کے لیے پاکستان میں اب تک نظری اور فکری

بنیادوں پر بہت کام ہو چکا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کے علاوہ اس موضوع پر متعدد کتب طبع ہو چکی ہیں۔ رسائل و جرائد میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے منہاج کا یہ شمارہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا مربوط فیصلہ اس بات کا مظہر ہے کہ پاکستان کے عوام میں سود کی لعنت سے چھٹکارا پانے اور اسلامی نظامِ معیشت کی آرزو کس قدر شدید ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب عملی اقدام کی طرف فوری توجہ دی جائے اور سود اور دیگر تمام غیر اسلامی طریقہ ہائے تجارت کو فی الفور کالعدم قرار دے دیا جائے اِس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس راستے میں بعض دشواریاں پیدا ہوں گی لیکن یہ تمام دشواریاں اس دشواری سے بہر حال کم ہی ہوں گی جو ہم اللہ تعالیٰ سے برسرِ پیکار رہ کر اُٹھائے ہوئے ہیں۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

غلام حسین

موجودہ بنکنگ اور اسلامی بنک کاری

ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب

عصر حاضر کے جو مسائل عالم اسلام کے لیے کھلا چیلنج رکھتے ہیں۔ان میں موجودہ بنکنگ کا "ربائی سسٹم" سب سے زیادہ اہم ہے۔ساری دنیا میں بنکوں کا جو نظام متداول اور متعارف ہے۔اس کی تمام تر اساس "ربٰو" اور سود" پر ہے۔جس کی بنا پر ساری دنیا میں یہ خیال راسخ اور مستحکم ہوگیا ہے کہ "سودی" نظام کو اپنائے بغیر کسی بھی بنک کو چلانا ممکن نہیں ہے اور یہ کہ "غیر ربائی بنک کاری" کا تصوّر محض ایک مفروضہ ہے۔

چاہیے تو یہ تھا، کہ اس کے جواب میں اسلامی دنیا میں ردعمل ہوتا اور "مسلم ماہرین معاشیات" اس سوال کا تسلی بخش حل پیش کرتے، لیکن اب تک یہ معاملہ "مبادیات" پر توجہ دینے سے آگے نہیں بڑھا۔اور بدقسمتی کی بات ہے، کہ قدیم و جدید نظام تعلیم کی تفریق نے، اس مسئلے کو مزید الجھا کے رکھ دیا ہے۔جدید تعلیم یافتہ لوگ عربی اور دین نہیں سمجھتے اور عربی اور دینیات جاننے والوں کو "جدید اقتصادیات نہیں آتی۔جس کا نتیجہ ہے کہ "دیندار" حلقے صرف شور مچانے سے سے آگے نہیں بڑھتے۔اور جدید دور میں صرف شور مچا کر، کسی مسئلے کو حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ جبکہ "جدید تعلیم یافتہ ذہن اس مسئلے کی اہمیت اور اس کی نزاکت سے کماحقہ واقف و آشنا نہیں ہے۔انہیں یہ احساس نہیں ہے کہ یہ مسئلہ عصر حاضر میں اسلام کے مستقبل لیے کتنا بنیادی مسئلہ ہے۔کیونکہ بڑی حد تک موجودہ دور میں اسلام کی تمام خامیوں اور خوبیوں کو ثابت کرنے کا راز اسی مسئلے کے حل میں مضمر ہے۔ اگر تو مسلمانوں نے یہ مسئلہ حل کر لیا، تو جدید دنیا یہ باور کرے گی، کہ اسلام کے پاس "موجودہ مسائل" کا تسلی بخش حل موجود ہے اور اگر بدقسمتی سے وہ اس مسئلے کے

حل میں ناکام رہے، تو دنیا کبھی ان کی بات پر کان نہیں دھرے گی۔

دوسری جانب "مسلمان حکومتیں" دوسری حکومتوں کے زیراثر اتنی "بے حس" ہیں۔ کہ ان کے پاس اس مسئلے پر توجہ دینے کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔ انتہا یہ کہ اسلام کے نام پر جو تحریک اٹھتی ہے، اس میں بھی اس مسئلے پر مداھنت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور اقتدار میں اسلامائزیشن کے عمل کے دوران میں صرف یہ ہوا، کہ بنکوں کے بچت کھاتوں (SAVING ACCOUNT) کا نام بدل کر، نفع ونقصان کا کھاتہ (PROFIT/LOSS SAVING ACCOUNT) رکھ دیا گیا۔ گویا انہوں نے مُردے کو کفن پہنا کر، یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے اس مسئلے کو حل کر دیا ہے۔ جبکہ اسلامی جمہوری اتحاد کی موجودہ حکومت نے "بنکنگ" سمیت، موجودہ "اقتصادی نظام" کو شریعت بل سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ یہی حال عرب ممالک سمیت باقی اسلامی ملکوں کا ہے، جو بڑی مستعدی سے یورپ کے سودی نظام کو اپنا نجات دھندہ سمجھ کر، اس کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں، کہ یورپ کے تمام بڑے بڑے بنک انہی کے سرمائے سے چل رہے ہیں، اگر عرب دنیا اپنا سرمایہ نکلوا لے، تو یورپ کے بہت سے بنک دیوالیہ ہو کر رہ جائیں۔

یہ حالات اس طویل اور سیاہ رات کی غمازی کر رہے ہیں، جو اسلامی دنیا پر چھائی ہوئی ہے اور جو ابھی چھٹنے کا نام نہیں لیتی اور جس کی ظلمتوں کی گہرائی ہر آئے دن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ :

- کیا دنیا سے اس ظلم، اور زیادتی کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا۔ جو دنیا کے بڑے بڑے ساہوکاروں اور بنیوں نے شروع کر رکھی ہے۔
- کیا اسلام کا اقتصادی نظام محض ایک مفروضہ ہے؟
- کیا اسلام کے پاس جدید مسائل کا تسلی بخش حل موجود نہیں ہے؟

یہی وہ سوالات ہیں، جن کا جواب مسلمانوں کی موجودہ نسل کو پیش کرنا ہے اور اگر اس نے ان سوالوں کا تسلی بخش جواب پیش نہ کیا۔ تو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا وہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ جو ہمارے بزرگوں اور اکابرین نے دیکھا تھا، اور جس کی تعبیر ہم ایک مدت سے تلاش

کر رہے ہیں۔

اس تمہید کے بعد عین مناسب ہوگا کہ پہلے اس علمی سرمائے پر نظر ڈال لی جائے، جو اب تک "غیر ربائی بنک کاری" کے عنوان سے ترتیب دیا جا چکا ہے۔ اور پھر یہ دیکھا جائے، کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔

جدید بنکنگ کی تاریخ

آگے بڑھنے سے قبل بہتر ہوگا۔ کہ ہم موجودہ بنکوں کی تاریخ اور ان کے پس منظر پر نظر ڈال لیں، تاکہ ہمیں پتہ چل سکے، کہ یہ بنک کیسے اور کیونکر معرض وجود میں آئے اور ان کی تعمیر و ترقی میں کتنے انسانوں کا خون ناحق شامل ہے۔

جب ہم بنکوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو بقول ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA کے مقالہ نگار (T.S.G.W) ہمیں نظر آتا ہے کہ جدید صنعتی دور میں تین طرح کے بنک موجود ہیں اور دنیا کی موجودہ معاشی ترقی میں دونوں ہی کا حصہ ہے اسی لیے اب بنکوں کی موجودگی ہر معاشرے کی اقتصادی زندگی کی روح رواں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

ان میں سے ایک قسم "تجارتی" یا کمرشل بنکوں کی ہے۔ کمرشل یا تجارتی بنک رقم، یا رقم کے قائم مقام، مثلاً چیک، رسید ات، بل ہنڈی وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں، اس کے گاہکوں میں انفرادی سطح سے لے کر، پرائیویٹ فرموں، تجارتی کمپنیوں اور بڑے بڑے اداروں تک سبھی شامل ہوتے ہیں۔ تجارتی بنک اپنے ذاتی سرمائے اور لوگوں کی امانتوں سے کاروبار کرتے ہیں۔ لوگوں کو بھاری سود پر قرض دیتے ہیں۔ کمپنیوں اور فیکٹریوں کے لیے شرح سود یا شراکت کی اساس پر سرمایہ مہیا کرتے ہیں اور ایک محدود سی رقم، خود ان کے پاس جمع رہتی ہے۔ جو رقوم واپس لینے والوں کو واپس کی جاتی ہے۔

کمرشل یا تجارتی بنک ہمیشہ اس اصول پر کام کرتے ہیں کہ لوگ جتنا سرمایہ جمع کراتے ہیں۔ اتنا سرمایہ وہ واپس نہیں لیتے۔ جس کے نتیجے میں بنک کے پاس اپنے ذاتی سرمائے کے علاوہ لوگوں کی امانتوں کا بہت سا روپیہ جمع ہوجاتا ہے اور یہی سرمایہ اس کے تجارتی اور منافع بخش اغراض کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

حاصل ہونے والے منافع میں سے، تجارتی بنک کچھ منافع اپنے گاہکوں کو واپس کر دیتا ہے

اور باقی منافع اس کے ذاتی مصرف میں مصروف رہتا ہے۔

۲۔ بنک کی دوسری قسم مرکزی بنک (یا CENTRAL BANK) کی ہوتی ہے، یہ بنک عام طور پر حکومت کی تحویل میں ہوتا ہے۔ اس بنک کے ذریعے حکومت اپنے سکے کو کنٹرول کرتی ہے۔ اور یہی بنک، تجارتی یا کمرشل بنکوں کو ملک کی کرنسی دیتا اور دوسری کرنسیوں سے اپنی کرنسی کا تبادلہ وغیرہ کرتا ہے۔

۳۔ بعض اوقات، بنک، تجارتی بنکوں کو "فنانس کمپنیز" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ تجارتی کمپنیاں درحقیقت سرمایہ لگانے (INVESTMENT) کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی تجارتی کمپنیاں "رقم" (MONEY) کا کاروبار نہیں کرسکتیں[1]

۲۔ بنک کا ماضی

بنکنگ کا تصوّر کسی نہ کسی صورت میں زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے مگر اس زمانے کی بنکنگ کی زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ عہد نبوی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ اپنی امانتیں جمع کراتے تھے، یہ بھی بنک ہی کی ایک صورت تھی، یہ ایک بات ہے کہ اسے موجودہ بنکنگ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اسی لیے فقہ کی کتابوں میں "کتاب الودیعہ" (امانت رکھوانے) کا مفصل ذکر ملتا ہے۔ موجودہ بنکنگ کی تاریخ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے[2] اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ اس زمانے میں لوگ زیادہ تر اپنی دولت سونے کی شکل میں جمع کیا کرتے تھے اور رفتہ رفتہ لوگوں نے سونے چاندی کے ان ڈھیروں کو اپنے پاس رکھنے کو خطرناک گردانتے ہوئے اسے سناروں کے پاس جمع کرانا شروع کر دیا یہی "سنیارے" اور ساہوکار ابتدائی دور کے "بنکر" ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر سکوں اور سونے چاندی کو جمع کرتے، ان کے باہمی تبادلے۔ ان کی کوالٹی اور معیار کو برقرار رکھنے یا اس کے جانچنے کا کاروبار کرتے تھے۔

اس زمانے میں بنکوں کی ایک اور قسم "دوکاندار بنکوں" (MERCHANT BANKERS) کی تھی، جو اشیاء (goods) اور رقم کی رسیدات دونوں کا کاروبار کرتے تھے۔

---

[1] دیکھئے: Encyclopaedia Britannica، مقالہ BANK، ۲: ۲۰۰، ایڈیشن ۱۹۵۰ء
[2] ایضاً

یہ بنک اپنے گاہک سے رقم وصول کر کے، اسے دور دراز علاقے میں اس شخص تک بھی پہنچاتے تھے، جسے اس نے رقم بھیجنا ہوتی تھی لیے

یہ ساہوکار رقوم وصول کر کے جو رسیدات جاری کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ رسیدات خرید و فروخت اور قرضوں کی ادائیگی وغیرہ کے لیے ایک آدمی سے دوسرے آدمی کی طرف منتقل ہونے لگیں۔ لوگوں کو یہ بات آسان نظر آتی تھی کہ وہ سونار سے سونا نکلوانے کے بجائے، سونے کی رسید ایک دوسرے کو دے دیں، اور رسید دینے کے معنیٰ گویا سونا حوالہ کر دینے کے تھے۔ اس لیے وہ اصل سرمایہ، جو سونے کی شکل میں بنک کاروں / سنیاروں کے پاس محفوظ رکھا جاتا تھا، اسے بہت کم نکلوانے کی نوبت آتی تھی۔

تجربہ سے "بنک کاروں" کو معلوم ہوا کہ ان کے پاس لوگوں کی امانتوں کا جو سونا جمع ہے۔ اس کا بمشکل دسواں حصّہ نکلوایا جاتا ہے، باقی حصّے ان کی تجوریوں میں بے کار پڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے اسے لوگوں کو بطور قرض دے کر اس پر سود وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ایک وقت میں دو طرح سے لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ایک تو اس طرح وہ لوگوں سے اس سونے کی حفاظت کا معاوضہ وصول کر لیتے تھے۔ اور ثانیاً اس طرح کہ وہ اسے " سود " پر دیکر نفع کماتے تھے۔

بعدازاں انہوں نے ایک اور قدم کے طور پر قرض کے لیے بھی کاغذی رسیدیں ہی چلا دیں، اور جب انہوں نے دیکھا، کہ ان کا یہ تجربہ کامیاب رہا ہے، تو انہوں نے ان کے پاس سونے کے نو فیصد محفوظ حصّوں پر ۹۰٪ کی جعلی رسیدیں بنا کر "زر کاغذی" کی حیثیت سے چلا دیں اور یوں قرض کے کاروبار کو وسعت دی۔ اس جعل سازی کے ذریعہ سے ان لوگوں نے ۹۰ فیصد جعلی روپیہ بالکل بے بنیاد کرنسی کی شکل میں بنایا اور خواہ مخواہ اس کے مالک بن بیٹھے اور اس کا سود وصول کرنے لگے۔ حالانکہ اس کے عوض اشیاء اور خدمات حاصل کرنا کسی اصول اخلاق و معیشت

و قانون کی رو سے جائز نہیں ہے۔ نتیجتاً یہ بنک کار / سنار اس فریب کاری سے ملک کی ۹۰ فیصد دولت کے مالک بن گئے۔ اور انہوں نے کمال عیاری سے بادشاہ اور امراء اور وزراء تک سب کو اپنے دامِ تزویر میں پھانس لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکومتیں بذاتِ خود اپنی مالی مجبوریوں اور اندرونی مشکلات کی عقدہ کشائی کے لیے ان سے بھاری قرض لینے لگیں۔ اس وقت یہ لوگ اپنی دولت کے ذریعے ملک پر چھا گئے اور انہوں نے ہر طرح کی طاقت اور قوت حاصل کر لی۔ تا آنکہ حکومت نے ان بنک کاروں کا یہ حق مان لیا کہ وہ نوٹ جاری کریں، اور ان کے جاری کردہ نوٹ باقاعدہ زر کاغذی کی حیثیت سے کاروبار کی دنیا میں چلنے لگے۔

جس دور میں یہ جدید بنک کاری اس جعلی سرمایہ سے طاقت پکڑ کر سر اٹھا رہی تھی یہ دور مغربی یورپ میں صنعت و حرفت کے سیلاب بے بہا کے اٹھنے اور اس کے طاقت پکڑنے کا دور تھا۔ یورپ صدیوں کے خوابِ غفلت کے بعد آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا اور اپنے ساز و سامان کے ساتھ پوری دنیا پر چھا جانے کا عزم رکھتا تھا، جس کے زیرِ اثر مغربی ملکوں میں فیکٹریوں، کارخانوں اور مختلف تعلیمی اور مالیاتی اداروں کا جال بچھایا جا رہا تھا۔ اس تمام منصوبے کو سرمائے کی "حاجت" تھی۔ نئی نئی صنعتیں اور تجارتیں اپنے آغاز کے لیے سرمایہ مانگ رہی تھیں۔ پہلے چلتے ہوئے کاروبار اپنی ترقی اور پیش قدمی کے لیے بڑی اور روز افزوں مقدار میں سرمائے کے طالب تھے۔ ان سب کاموں کے لیے خود منصوبہ سازوں کا اپنا ذاتی سرمایہ بہر حال ناکافی تھا۔ اب لامحالہ دو ذرائع تھے جن سے یہ خونِ حیات اس تمدنِ جدید کے نوخیز شباب کی آبیاری کے لیے بہم پہنچ سکتا تھا:

اوّلاً: وہ سرمایہ جو سابق سناروں اور حال کے ساہوکاروں کے پاس تھا۔

ثانیاً: وہ دولت جو متوسط اور خوش حال طبقوں کے پاس ان کی پس انداز کی ہوئی آمدنیوں کی شکل میں جمع تھی۔

اس میں سے پہلی قسم کا جو سرمایہ ساہوکاروں کے قبضہ میں تھا، اس لیے اس کا ایک پیسہ بھی حصہ داری کے اصول پر کسی کام میں لگنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ تو صرف اور صرف اسی شرط پر قرض دیتے تھے، کہ خواہ قرض لینے والوں کو نفع ہو یا نقصان، بہر حال وہ بنک کاروں کو ایک

طے شدہ شرح کے مطابق سود دیں گے۔

جبکہ دوسرا ذریعہ ہی ایسا تھا کہ جس سے معاشی کاروبار اور تعمیر و ترقی کے کاموں کے لیے سرمایہ آسکتا تھا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ عین انصاف ہوتا۔ مگر ان بنک کاروں نے اپنی منفی سوچ کے ذریعے، معاشرے سے خون کی یہ صحت بخش مقدار بھی چھین لی۔ وہ اس طرح ـــــــ کہ ان ساہوکاروں نے سود کا لالچ دے کر تمام ایسے لوگوں کا سرمایہ بھی اپنے پاس کھینچنا شروع کر دیا جو اپنی ضرورت سے زیادہ آمدنی بچار کھتے تھے، یا اپنی ضرورتیں روک کر کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے یہ کیا کہ پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کو باور کرا دیا۔ کہ یہ بنک انہی کی خدمت کے لیے ہیں، اور یہ کہ لوگوں کو اس زحمت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح تو انھیں خود حساب کتاب رکھنا ہوگا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس طرح سے انھیں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے بجائے وہ اپنی رقمیں ان کے پاس جمع کرا دیں ہم وہ ان کے سرمائے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ انھیں بالمقطع ایک مقررہ شرح سے سود ادا کر دیا کریں گے۔

اس چال سے ۹۰ فیصدی، بلکہ اس سے بھی زیادہ پس انداز رقمیں بنک کاروں کے دست تصرف میں چلی گئیں اور یہ لوگ قریب قریب پورے قابل حصول سرمائے پر قابض ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے یہ بات قریب قریب ناممکن بنا دی کہ ان کی مقرر کردہ شرح کے سوا، کسی دوسری شرط پر کسی بھی کام کے لیے کہیں سے کوئی سرمایہ مل سکے۔ یہ راستہ چونکہ آسان بھی ہے اور "سہل الوصول" بھی۔ اس لیے کہ اس میں کسی خار مغیلاں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ اس لیے لوگ اس طریقے کے عادی ہو گئے۔ اور انھیں کاروبار میں شرکت کے بجائے، سرمائے کا ایک لگا بندھا نفع وصول کرنے کی چاٹ لگ گئی۔

اس طریق کار نے قلم اور سیف، دونوں کی حکمرانی کا دور ختم کر دیا اور اس کی جگہ "یہی کھاتے" کی فرماں روائی قائم کر دی۔ غریب کسانوں اور مزدوروں سے لے کر بڑے سے بڑے صنعتی و تجارتی اداروں تک اور بڑی حکومتوں اور سلطنتوں تک سب کی ناک میں ایک غیر مرئی نکیل پڑ گئی اور اس کا سرا ساہوکار کے ہاتھ میں آگیا۔

اس کے بعد اس گروہ نے ایک قدم اور اٹھایا اور اپنے کاروبار کو وہ شکل دی جسے اب جدید

بنکنگ کہا جاتا ہے۔ پہلے یہ کاروبار عموماً انفرادی سطح پر تھا۔ اگرچہ بعض ساہوکار گھرانوں کا مالیاتی کاروبار بڑھتے بڑھتے عظیم الشان اداروں کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جن کی شاخیں دور دراز مقامات پر قائم ہو گئی تھیں، لیکن بہر حال یہ الگ الگ گھرانے تھے اور اپنے ہی نام پر کام کرتے تھے۔ جب یہاں کے خلاق اور زہین دماغوں نے یہ سوچا۔ کہ کیوں نہ ان انفرادی اداروں کو شہری، صوبائی، ملکی اور پھر بین الاقوامی سطح پر منظم کیا جائے۔ اور نہ صرف اپنے شہر، بلکہ پورے صوبے پورے ملک اور بلکہ تمام ممالک کی دولت کو ہتھیایا جائے، تاکہ زمین کے کسی بھی گوشے پر، ان کی مرضی کے بغیر کوئی دانہ کاشت کیا جا سکے اور نہ کوئی لقمہ کھایا جا سکے۔ اس طرح یہ بڑے بڑے بنک معرض وجود میں آئے جو آج تمام دنیا کے نظام مالیات پر قابض و متصرف ہیں۔

اس جدید دور میں بنکنگ کا مختصر الفاظ میں طریق کار یہ ہے کہ چند صاحب سرمایہ لوگ مل کر ایک ادارہ ساہوکاری قائم کرتے ہیں جس کا نام بنک ہے۔ اس ادارے میں دو طرح کا سرمایہ استعمال ہوتا ہے۔ ایک حصّہ داروں کا سرمایہ جس سے کام کی ابتدا کی جاتی ہے۔ دوسرا امانتداروں یا کھاتہ داروں (DEPOSITORS) کا سرمایہ جو بنک کا کام اور نام بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملتا جاتا ہے اور اسی کی بدولت بنک کے اثر اور اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک بنک کی کامیابی کا اصل معیار یہ ہے کہ اس کے پاس اس کا اپنا ذاتی سرمایہ (یعنی حصّہ داروں کا لگایا ہوا سرمایہ) کم سے کم ہو اور لوگوں کی رکھوائی ہوئیں رقمیں زیادہ سے زیادہ ہوں۔

مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ بنک اپنا سارا کام تو چلاتا ہے امانتداروں کے روپے سے جن کا دیا ہوا سرمایہ بنک کے مجموعی سرمائے میں ۹۰ - ۹۵ فیصد بلکہ ۹۸ فیصد تک ہوتا ہے، لیکن بنک کے نظم و نسق اور اس کی پالیسی میں ان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ چیز بالکل ان حصّہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو بنک کے مالک ہوتے ہیں اور جن کا سرمایہ مجموعی سرمائے کا صرف دو تین یا چار یا پانچ فیصد ہوا کرتا ہے۔ امانت داروں کا کام صرف یہ ہے کہ اپنا روپیہ بنک کے حوالہ کر دیں اور اس سے ایک خاص شرح کے مطابق سود لیتے رہیں۔ اس سے آگے کسی بھی معاملے میں وہ کچھ نہیں بول سکتے۔ اس کا تعلق صرف حصّہ داروں سے ہے۔ وہی منتظمین کا انتخاب کرتے

ہیں، وہی پالیسی کا تعین کرتے ہیں، وہی نظم و نسق اور حساب کتاب کی نگرانی کرتے ہیں اور انہیں کے منشا پر اس امر کا فیصلہ منحصر ہوتا ہے کہ سرمایہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ پھر حصّہ داروں میں سب یکساں نہیں ہوتے۔ متفرق چھوٹے چھوٹے حصّہ داروں کا اثر بنک کے نظام میں برائے نام ہوتا ہے۔ دراصل چند بڑے بھاری حصّہ دار ہی سرمائے کی اس جھیل پر قابض ہوتے ہیں وہی اور اس پر تصرف کرتے رہتے ہیں۔

بنک اگرچہ بہت سے چھوٹے بڑے کام کرتا ہے جن میں سے بعض یقیناً مفید، ضروری اور جائز بھی ہیں، لیکن اس کا اصل سرمائے کو سود پر چلانا ہوتا ہے۔ تجارتی بنک ہو یا صنعتی یا زراعتی، یا کسی اور نوعیت کا، بہر حال وہ خود کوئی تجارت یا صنعت یا زراعت نہیں کرتا بلکہ کاروباری لوگوں کو سرمایہ دیتا ہے اور ان سے سود وصول کرتا ہے۔ اس کے منافع کا اصلی اور سب سے بڑا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ امانت داروں سے کم شرح سود پر سرمایہ حاصل کرے اور کاروباری لوگوں کو زیادہ شرح پر قرض دے۔ اس طریق سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ حصّہ داروں میں اسی طرح تقسیم ہو جاتی ہے جس طرح تمام تجارتی اداروں کی آمدنیاں ان کے حصّہ داروں میں مناسب طریقہ سے تقسیم ہوا کرتی ہیں لے

۳ - اسلامی بنک کاری - کیسے اور کیونکر؟

اس تمہید سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی۔ کہ سودی بنکاری "عہد قدیم" کے سود خور مہاجنوں اور یہودی ساہوکاروں کے کاروبار ہی کی ایک ترقی یافتہ اور جدید صورت ہے، جس کے ذریعے انہوں نے معاشرے کے سفید پوش لوگوں کو لوٹنے اور ان کے سرمائے سے اپنی تجوریاں بھرنے کا لامحدود اختیار حاصل کر لیا ہے۔ اور ہر آنے والا دن اس استحصالی نظام میں مزید قوت اور شدت پیدا کر رہا ہے۔

ایک غریب اور محنت کش انسان رات دن ایک کر کے، ساری ساری رات پہرہ دے کر اور

دیکھئے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا ؛ مقالہ بنکنگ
نیز ابو الاعلیٰ مودودی : سود : ۱۴۰ - ۱۳۸

اپنی فصلوں سے جو محدود سی آمدن حاصل کرتا ہے ۔ بنکوں کا موجودہ نظام اس کے اور اس کے بچوں کے منہ سے روزی کا آخری لقمہ بھی چھین لیتا ہے ۔ اور وہ محنت کشوں کی بچائی ہوئی رقم دوبارہ سرمایہ دار کے حوالے کر دیتا ہے ، جو اس کے ذریعے بڑی بڑی فیکٹریاں اور ادارے قائم کرکے ۔ اسی کو لوٹنے کا ایک اور ذریعہ حاصل کرلیتا ہے ۔ اس طرح بنکوں کا موجودہ نظام مکمل طور پر لوٹ کھسوٹ اور استحصالی نظام کے اس پروگرام کا حصہ ہے ۔ جو یورپ کے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت (capitalism) کا ایک تحفہ ہے ۔

لیکن دوسری جانب اس کی ضرورت و اہمیت اور اس کی افادیت و منفعت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ موجودہ نظامِ معیشت میں بنکوں کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے ، جس کے بغیر گذارہ کرنا ممکن نہیں ہے ۔ اور دنیا کا کوئی ملک اور کوئی ادارہ بھی ان کے بغیر کامیابی سے نہیں چل سکتا ۔ اس لیے اس مسئلے کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے ۔

بنکوں کے نظام کو " اسلامی خطوط " پر استوار کرنے کے تین راستے ہیں : ایک راستہ تو یہ ہے کہ موجودہ بنکوں کو قطعی طور پر سودی کاروبار سے روک دیا جائے ، اور دوسرا راستہ یہ ہے ۔ کہ غیر سودی کاروبار کرنے والے نئے بنک قائم کیے جائیں ۔ اور ان کو سودی بنکوں کی موجودگی میں مسابقت کے ساتھ چلایا جائے ۔ تیسری صورت یہ ہے ۔ کہ بنکوں کو سودی اور غیر سودی دونوں طرح کے کھاتے کھولنے کی اجازت دی جائے ۔ تاکہ لوگ اپنی مرضی کے مطابق ان میں اپنی رقوم جمع کرا سکیں ۔

ان میں سے دوسرا طریقہ اگرچہ موزوں ترین ہے ۔ لیکن تکنیکی اعتبار سے اس پر عمل کرنا مشکل ہے ۔ اب لے دیکے پہلا اور آخری طریقہ رہ جاتا ہے ۔ ان میں سے مؤخر الذکر طریقہ جلد ناکام ہونے کی امید کی جا سکتی ہے ۔ اس لیے کہ بقول ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لوگوں کے لیے جب کوئی چور دروازہ (Black Market) باقی رہے گا ۔ تو لوگ اسی کو ترجیح دیں گے ۔ لہٰذا آزمائشی عرصہ گذارنے کے بعد ۔ پہلا طریقہ ہی موزوں ترین ہوگا ۔

اب ہم اس سلسلے میں پیش کی جانے والی تجاویز اور آراء پر نظر ڈالتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں ۔ کہ ان پر شرعی اور فنی نقطۂ نظر سے کس حد تک عمل کرنا ممکن ہوگا ۔

۱۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تجاویز

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اپنی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام کی بدولت"، اسلام کے اقتصادی نظام پر لکھنے والوں میں اوّلیت کا شرف رکھتے ہیں، انہوں نے ۱۳۵۸/۱۹۳۹ء میں یہ کتاب لکھی۔ اس میں انہوں نے "بنک" کے عنوان سے جو بحث کی ہے۔ اس میں بنک کی قباحتیں اور اس کی برائیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جس میں آپ لکھتے ہیں:

"لیکن اس خوشنما رنگ وارں میں جو مارسیاہ پوشیدہ ہے اور ظاہر رنگین میں زہر قاتل مستور ہے۔ اگر اس کی تحلیل کی جائے، اور اس کو بے نقاب کیا جائے۔ تو یہ کہنا پڑے گا۔ کہ بنکوں کا وجود اس لیے ہے۔ کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ پونجی میں بے پناہ اضافہ ہو، اور ... دولت سمٹ سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محصور ہو جائے"۔ (ص ۳۳۰)

مولانا نے۔ بنکوں کے موجودہ سودی نظام کی جگہ اجتماعی کمپنیوں کا نظریہ پیش کیا ہے۔ انکے خیال میں اگر امداد باہمی کے نام سے ایسی کمپنیاں قائم کر دی جائیں۔ جو مفید ہونے کے اعتبار سے وہی کام کریں۔ جو دور جدید میں کوآپریٹیو سوسائٹیاں، کرتی ہیں، لیکن اس کے لین دین میں سود کو ہرگز دخل نہ ہو۔ اور اصل سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور عملہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے منافع کے جائز طریقے اپنائے جائیں۔ اس کے لیے، انہوں نے اس کے ممبر افراد پر ہلکے سے ٹیکس کی تجویز پیش کی ہے۔ اور اس کے لیے پہلے ان سے استصواب رائے کر لیا جائے۔ اور جائز طریقے سے نفع حاصل کرنے کے لیے سوسائٹی کی رقوم کو مضاربۃ، معاوضہ اور شرکت وغیرہ کے اصول پر، بہتر مدات میں سرمایہ کاری کی جائے"۔ (۳۳۲ - ۳۴۰)

مولانا نے موجودہ بنک کاری کے متبادل کے طور پر جو نظریہ پیش کیا ہے، آئندہ اس موضوع پر لکھنے والوں نے زیادہ تر اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور اسلامی بنک کی قریب قریب وہی ذمہ داریاں اور وہی حدود بیان کی ہیں۔ جو مولانا کی اس مختصر اور جامع تحریر سے نمایاں ہوتی ہیں۔

اسلامی بنکنگ کے لیے مفتی محمد شفیع۔ قدس سرہٗ العزیز کی تجاویز

مفتی محمد شفیع قدس سرہ نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، میں اپنے مقالے "ربوا" میں اسلامی بنکنگ کے حق میں حسب ذیل مفید تجاویز دی ہیں! آپ لکھتے ہیں:

عہد حاضر کے علماء میں یہ سوال زیر بحث رہا ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں بنکنگ کا طریق کار کیا ہوگا؟ جب کہ آج کل بنکوں کا سارا نظام انٹرسٹ پر قائم ہے۔ اس سوال کے جواب میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تفصیل جزئیات سے قطع نظر اصولی طور پر غیر سودی بنک کاری کی جتنی تجویزیں اب تک سامنے آئی ہیں ان میں یہ بات مشترک ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں بنک کاری ربا کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر قائم ہوگی، اس کی مختصر تشریح درج ذیل ہے:

ابتداء میں سرمایہ لگا کر جو لوگ بنک قائم کریں گے وہ حصہ دار (SHARERS) کہلائیں گے پھر عوام کی جو جو امانتیں بنک میں جمع ہوں گی وہ دو قسموں پر مشتمل ہوں گی، ایک عند الطلب قرضے (CURRENT ACCOUNT) اور دوسرے مد مضاربت (FIXED DEPOSIT)۔ سیونگ اکاونٹ غیر سودی نظام بنکاری میں عند الطلب قرضوں کے اندر شامل ہو جائے گا۔

عند الطلب قرضوں میں تمام رقوم بنک کے پاس (فقہی نقطہ نظر سے) قرض ہوں گی کھاتہ دار ہر وقت بذریعہ چیک ان کی واپسی کا مطالبہ کر سکے گا اور ان پر کوئی منافع کھاتہ دار کو نہیں دیا جائے، موجودہ نظام بنکاری میں بھی اس مد پر کوئی خاص منافع نہیں دیا جاتا، البتہ مضاربت کے کھاتہ دار ایک معین مدت کے لیے، جو تین ماہ سے ایک سال تک ہو سکتی ہے، رقم رکھوائیں گے پھر اس رقم سے بنک جو منافع حاصل کرے گا اس میں متناسب طور سے (PROPORTIONATELY) شریک ہوں گے۔

سیونگ اکاونٹ کو عند الطلب قرضوں میں شامل کرنے پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس سے بچتیں بنک میں جمع کرنے کا محرک ختم ہو جائے گا، لیکن جدید تحقیقات کی رو سے سیونگ اکاونٹ کھلوانے کا اصل محرک بچت کا جذبہ ہوتا ہے، منافع کا جذبہ نہیں، اس لیے یہ تبدیلی کوئی عملی مشکل

پیدا نہیں کرے گی۔

عند الطلب قرضوں اور مضاربت کھاتہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی رقوم میں سے ایک حصہ بنک مد محفوظ (RESERVE) میں رکھ کر باقی سرمایہ کاروباری افراد کو شرکت یا مضاربت کے اصول پر دے گا۔ کاروباری افراد اس سرمائے کو صنعت یا تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل کریں گے اس کا ایک طے شدہ متناسب حصہ، مثلاً پچیس فی صد یا تینتیس فی صد بینک کو اصل رقم کے ساتھ ادا کریں گے اور بینک یہ منافع اپنے حصے داروں اور کھاتہ داروں کے درمیان طے شدہ متناسب حصّوں کی صورت میں تقسیم کریں گے، فرانس اور جرمنی میں بعض بینک شرکت کے اصول پر سرمایہ لگاتے رہے ہیں، اسی اصول کو غیر سودی بینکاری میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ بینکوں کا ایک نہایت اہم عمل قصیر المیعاد (کم میعاد) قرضے جاری کرنا ہے۔ جس پر وہ مختصر شرح سے سود وصول کرتے ہیں، یہ قرضے چند ہفتوں، چند دنوں، بلکہ بعض صورتوں میں چند گھنٹوں کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں اور موجودہ صنعتی و تجارتی دور میں انکا حصول بہت اہمیت رکھتا ہے، انہیں قصیر المیعاد قرضوں کی ایک شکل ہنڈی بھنانا بھی ہے۔

ان قرضوں کی مدت اتنی مختصر ہوتی ہے کہ انھیں شرکت یا مضاربت کے اصول پر حاصل کرنا عملی پیچیدگیوں کا باعث بنے گا، اس لیے غیر سودی بینکاری میں یہ قرضے بلا سود جاری کیے جائیں گے، البتہ ان کے حساب وکتاب کے اخراجات کی تکمیل اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ہر قرض کی درخواست کے لیے ایک فارم ہوگا جو قرض مانگنے والوں کو قیمتاً فراہم کیا جائے گا اور قیمت میں قرض کی مقدار کی کمی، زیادتی سے کوئی فرق نہ رکھا جائے گا، ہنڈیاں بھنانے والوں کی درخواستوں پر عام قرضوں کے مقابلے میں زیادہ فیس وصول کی جا سکتی ہے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ بینک کے لیے غیر سودی قرض دینے کا محرک کیا ہوگا؟ اور وہ کس بنیاد پر یہ رقم ایک قطعی غیر نفع بخش کام میں لگائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غیر سودی نظام بینکاری میں ہر بینک کو اس کی امانتوں کا اکثر حصہ غیر سودی قرض کی صورت میں حاصل ہوگا، اس لیے کہ جدید بینکوں کا تجربہ یہ ہے کہ عند الطلب کھاتہ میں جمع کی جانے والی رقمیں بحیثیت مجموعی طویل المیعاد امانتوں (FIXED DEPOSITS) کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہیں، عموماً،

اوّل الذکر رقمیں امانتوں کا ساٹھ فی صد اور مؤخر الذکر امانتوں کا چالیس فیصد ہوتی ہیں۔ ان ساٹھ فیصد رقوم کا ایک حصّہ محفوظ (RESERVE) میں رکھ کر باقی تمام سرمائے کو بینک کے نفع بخش کاموں میں لگایا جا سکتا ہے، مرکزی بینک، عام بینکوں کو اس عظیم سہولت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت اسی صورت میں دے گا جب وہ خود قصیر المیعاد قرضے بلا سود جاری کرنے پر رضامند ہوں۔

مذکورہ طریق کار کے علاوہ غیر سودی نظام میں بینک اپنے وہ تمام وظائف بھی جاری رکھے گا جو وہ اجرت پر انجام دیتا ہے مثلاً مقفل صندوق (LOCKER) رکھنا، سفری چیک، بینک ڈرافٹ اور لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنا، تجارتی اموال کو بلٹی کے ذریعے منگوانا بیع وشراء کی دلالی کرنا اور کاروباری مشورہ دینا وغیرہ۔ ان تمام خدمات کو بدستور جاری رکھ کر ان پر اجرت وصول کی جائے گی۔

یہاں غیر سودی بینکاری کا انتہائی اجمال خاکہ پیش کیا گیا ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں ماخذ میں دی ہوئی کتابیں[1]

استدراک مفتی محمد قدس سرہٗ نے موجودہ بینک کو اسلامی قالب میں ڈھلنے کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں، وہ انتہائی اہم، جامع اور مفید ہیں۔ البتہ چونکہ وہ ذاتی طور پر معاشیات کے ماہر نہیں تھے، اس لیے وہ اس موضوع زیادہ تفصیل بیان نہیں کر سکے۔ انہوں نے جب کہ اپنے مضمون کے آخر میں صراحت کی ہے۔ یہ مضمون زیادہ تر دوسرے ماہرین معیشت سے نقل کیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر محمد اکرم اور ملا حسین ملا ٹھوی وغیرہم کی تجاویز

اوپر مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، اور مفتی محمد شفیع وغیرہم کے حوالے سے جن تجاویز کا ذکر آیا ہے۔ ہندوستان کے ایک معروف سکالر اور ماہر معیشت ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اس پر "مبسوط" کتاب تیار کر کے۔ اسے حتمی اور بہتر صورت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس اعتبار سے ان کا کام بہت اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔

پاکستان کے متعدد ماہرین معیشت جن میں ڈاکٹر محمّد اکرم صاحب کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ ان تجاویز کو معیشت، مفید اور قابل عمل قرار دیا ہے، اور اپنی کتب میں

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱۰: ۱۷۹، ۱۸۰۔

ان کے پیش کردہ خاکے کو پیش کیا ہے۔ اس لیے یہ خاکہ اب تک کیے جانے والے خاکوں میں سب سے بہتر اور مفید ہے۔ اسی لیے اگر آئندہ دور میں کبھی بھی صحیح اسلامی بنکاری کے قیام پر پیش رفت ہوئی، تو اس کے لیے اس خاکے کو اساس ٹھہرایا جائے گا۔

اس کا خلاصہ۔ ڈاکٹر محمد اکرم صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

۱۔ **بینک کا قیام:** غیر رباٰئی بینک کا قیام شرکت عنان[1] کی بنیاد پر وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ افراد کا کوئی کاروباری ادارہ غیر محدود ذمہ داری کی بنیاد پر غیر رباٰئی بینک قائم کر سکتا ہے۔ یہ حضرات اپنے ذاتی سرمائے کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی بینک میں حصہ دار بنا سکتے ہیں۔ نفع میں شرکت کی کوئی بھی نسبت طے کی جا سکتی ہے؛ البتہ سرمائے کی نسبت سے نقصان میں شرکت "شرط لازم" ہے۔ اس میں زیادہ اہم بات غیر محدود ذمہ داری کی ہے۔ شریعت میں شرکا کی ذمہ داری غیر محدود رکھی گئی ہے تاکہ باہر کے لوگوں کے مفاد کو ضرب نہ لگے[2]۔ دور حاضر میں تمام بنکوں کی ذمہ داری محدود ہے۔ اسلامی ریاست میں محدود ذمہ داری کی بنیاد پر بینک کے قیام کے لیے لازم ہوگا کہ فقہاء کا اس پر اجماع ہو، لہٰذا اس مسئلے پر مزید غور وخوض کی ضرورت ہے[3]۔

---

[1] اسلام میں جن طریقوں سے کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ان میں "شرکت" کا طریقہ بھی شامل ہے۔ شرکت، کی تین اقسام ہیں، جن میں سے ڈاکٹر صاحب نے "شرکت عنان" کا ذکر کیا ہے جس کی رُو سے دو یا دو سے زیادہ افراد باہم مشترکہ طور پر کوئی کاروبار شروع کرنے کے لیے سرمایہ جمع کرتے ہیں، اور اس میں ایک خاص تناسب یا شرح سے وہ کاروبار کے منافع میں شریک ہوتے ہیں۔

[2] نجات اللہ صدیقی: غیر سودی بنک کاری، لاہور، ص ۱۵ - ۱۹۔

[3] یہ تجویز ڈاکٹر محمد اکرم کی ہے۔ تاہم بینک کے حصہ داروں کی محدود یا لامحدود ذمہ داری کا مسئلہ غور طلب ہے۔ اس لیے کہ عصر حاضر میں ہر ادارہ "محدود ذمہ داریوں" کے ساتھ چلایا جا رہا ہے اور اگر "شرائط معاہدہ" میں محدود ذمہ داریوں کی تحدید کر دی جائے، تو حدیث "المسلمون عند شروطہم" کے تحت شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کی اجازت ہے۔

۲۔ بینک کا کاروبار : غیر ربائی بینک مندرجہ ذیل اقسام کے کاروبار کرے گا:
ا۔ کمیشن دے کر انجام دی جانے والی خدمات، ایک جگہ سے دوسری جگہ رقوم / مال کی منتقلی لاکرز کی فراہمی، ٹریولرز چیک، گاہکوں کے بلوں کی ادائیاں، بلٹیاں چھڑانا، مالیاتی امور میں مشورے دینا اور گاہکوں کے حصص کی خرید و فروخت وغیرہ شامل ہیں یہ خدمات "ربائی بنکاری" میں بھی بنک کمیشن پر انجام دیتے ہیں۔ "غیر ربائی نظام" میں یہ خدمات انجام دینا شریعت کے کسی ضابطے کے خلاف نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان مفید امور کو غیر ربائی بینک بھی ادا کر سکے گا۔

ب۔ شرکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری : غیر ربائی بینک کاروباری حضرات کو شرکت کی بنیاد پر سرمایہ فراہم کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ نفع و نقصان میں شرکت کی نسبت پہلے سے طے کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ بینک اپنے امانتداروں کی رقم کو سرمایہ کاری کے لیے دے گا، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ معاہدہ شرکت میں بینک کی ذمہ داری صرف اس سرمائے تک محدود ہو، جو وہ سرمایہ کاری کے لیے دے۔ یہ بات بینک کا اعتبار قائم رکھنے کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ بینک اپنے سرمائے کی حفاظت کے لیے اگر چاہے تو کاروبار کے انتظامی امور میں دخل دینے کا متعین حق معاہدے میں طے کر سکتا ہے، لیکن عملاً بینک کا ایسا دخل بہت زیادہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس سے بینک کے اصل کاروبار میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ آج کل کے تجارتی بینک کسی کاروبار میں شرکت کے اصول پر کوئی سرمایہ کاری نہیں کرتے، لہٰذا ان کا دائرہ عمل عام طور پر ابتدائی چھان بین تک محدود رہتا ہے اور ایک دفعہ قرض دینے کے بعد انہیں کاروبار کے معاملات میں نگرانی کا کوئی حق نہیں رہتا۔ اس کے برعکس غیر ربائی بینک کو کسی حد تک اس نگرانی کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اس لیے ان کو لازماً ایسا عملہ ہمہ وقتی بنیادوں پر رکھنا ہوگا جو انتظامی امور میں مہارت رکھتا ہو۔ یہ بات تو واضح ہے کہ بینک اس طرح کی سرمایہ کاری بہت چھوٹے پیمانے کے کاروباروں میں نہیں کر سکتا بلکہ بڑی سرمایہ کاری کے منصوبوں میں شرکت کی بنیاد پر کاروبار کے لیے مخصوص بینک وجود میں آئیں اور عام تجارتی بینک روزمرہ تجارتی ضروریات کے لیے کام کرتے رہیں[1]

---

[1] غیر سودی بنکاری، ص ۲۴ - ۲۸

۳۔ مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ کاری : بینک شرکت کے علاوہ مضاربت کی بنیادوں پر بھی سرمایہ کاری کر سکتا ہے۔ مضاربت کے معاہدے میں بینک رب المال (سرمایہ کار) ہوگا اور کاروباری شخص مُضَارِب[1] بینک کے سرمائے سے مضارب کاروبار کرے گا۔ نفع میں فریقین ایک مقررہ نسبت سے شریک ہوں گے، لیکن نقصان کی صورت میں نقصان صرف بینک کا ہوگا اور مضارب کا نقصان یہ ہوگا کہ اس کی ساری محنت ضائع گئی۔ بینک اور مضارب نفع کی شرح متعین کرنے میں بالکل آزاد ہوں گے۔ لیکن عملاً اسلامی معیشت میں طلب اور رسد کی قوتوں کے عمل سے ایک رائج شرح (RATEMRKET) وجود میں آجائے گی اور بینک اس رائج شرح پر کاروبار کرے گا۔ اس شرح کو مرکزی بینک بھی متعین کر سکتا ہے اور مختلف کاروباروں کے لیے یہ شرح مختلف بھی ہو سکتی ہے۔

مضارب کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ بینک کے سرمائے کے علاوہ اپنے سرمائے کو بھی کاروبار میں لگا سکے۔ اس صورت میں تمام نفع کو سرمائے کی بنیاد پر دو حصّوں میں بانٹا جائے گا۔ پھر اس نفع کو جو بینک کے سرمائے پر ہو، بینک اور مضارب آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ یہی معاملہ اس سرمائے کے ساتھ بھی ہوگا جو مضارب کسی دوسرے ذریعے سے قرض حسن یا مضاربت یا شرکت کی بنیاد پر حاصل کرے۔ ان سب صورتوں میں بینک کے نقطۂ نظر سے اس کے سرمائے کے علاوہ باقی تمام سرمایہ مضارب کا شمار ہوگا، خواہ اس نے اسے کسی بھی ذریعے سے حاصل کیا ہو۔ یہ مضارب کا اپنا ذاتی معاملہ ہے کہ وہ دوسرے فریقین سے نفع کی تقسیم کا کیا فارمولہ طے کرتا ہے۔ اگر مضاربت کے معاہدے میں مضارب کسی چالو کاروبار کا مالک ہو تو بینک کی سرمایہ کاری کے وقت اس کاروبار کی مالیت کا اندازہ لگانا ضروری ہوگا کیونکہ اس کے بغیر بینک اور کاروبار کے باہمی تناسب کا پتا نہیں چل سکتا اور یہ ایک مشکل امر ہے۔ اگرچہ اس کا عمومی قاعدہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ کاروبار کے تمام اثاثوں کی قیمت میں سے اس کی واجبات منہا کر دی جائیں، لیکن اصل دشواری یہ ہے کہ اثاثوں کی قیمت کس بنیاد پر لگائی جائے؟ کیا یہ قیمت اثاثوں کی اصل قیمت

---

[1] یہ دونوں اصطلاحیں فقہی ہیں "مضاربۃ" میں دو فریق باہم کر کاروبار کرتے ہیں: ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اُسے رب المال کہتے ہیں جبکہ دوسرا شخص کاروبار کرتا ہے۔ اسے مضارب کہتے ہیں

منفی فرسودگی ہو، یا وہ جو انھیں بیچنے کی صورت میں اس وقت مارکیٹ میں مل سکتی ہے (یعنی MARKET VALUE) یا وہ جو انہیں اس حالت میں بازار سے خریدتے وقت لگے (یعنی Replacement)۔ یہ بہت ہی مشکل سوالات ہیں اور ان کا کوئی حتمی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ قانونی طور پر مختلف قسم کے کاروباروں کے لیے مختلف بنیادیں رکھ دی جائیں۔ اس کے لیے اجتہاد کی بھی ضرورت ہوگی اور قانون کی بھی۔

ایک مسئلہ مضاربت کے معاہدے کی مدت کا ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہر معاہدہ مضاربت میں اس کی مدت کا تعین اور اس مدت کے خاتمے پر نفع و نقصان کا فیصلہ کرلیا جائے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ صرف عام کے طور پر سال کو دو یا تین یا چار حصّوں میں بانٹ لیا جائے اور عام طور پر، مضاربت ۶، ۳، یا ۴ ماہ کی مدت کے لیے ہو، جس کے خاتمے پر فریقین چاہیں تو اسی مدت کے لیے اس کو مزید بڑھا سکیں۔ مختلف کاروباروں کے لیے یہ مدت مختلف بھی ہوسکتی ہے۔ اصل میں اہم بات نفع و نقصان میں تعین کی سہولت ہے۔

• ۔ مشترکہ سرمائے کی کمپنی میں سرمایہ کاری: بنک اپنے سرمائے کو مشترکہ سرمائے کی کمپنیوں کے حصص خریدنے میں لگا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بنک حکومت کے شرکت حصص یا مضاربت حصص میں اپنا سرمایہ لگا سکتا ہے، جو حکومت مختلف منصوبوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے جاری کرے گی اور جو آج کل کے ربائی بلوں (INTEREST BEARING BILLS) کا بدل ہوگا۔ اسلامی معیشت میں سٹاک ایکسچینج کے پورے کاروبار کو بھی شریعت کی روشنی میں استوار کیا جائے گا تاکہ اس میں سٹہ، ربٰو اور دیگر کاروباری مفاسد کا خاتمہ ہوسکے۔

• ۔ قرض حسنہ: نفع بخش کاموں میں روپیہ لگانے کے علاوہ غیر ربائی بنک کی ایک اہم ذمہ داری اپنے گاہکوں کو قرض حسنہ کی سہولتیں فراہم کرنا ہے۔ قرض حسنہ کی یہ سہولت صرف ان مواقع کے لیے ہے جن میں بنک کے لیے مضاربت یا شرکت کا کوئی معاہدہ کرنا ممکن نہیں اور لامحالہ یہ مواقع بہت ہی تھوڑے عرصے کے لیے درکار رقوم تک محدود ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی کاروبار کو ایک دن، ایک ہفتہ، یا ایک ماہ کے لیے بھی کوئی رقم درکار ہو

تو یہ بینک ہی کے لیے مفید ہے کہ کسی ایسے کاروبار میں مضاربت یا شرکت کا پیمان کرے جس کے معاملات میں اس کا دخل صرف چند دنوں کے لیے ہو اور نہ کاروباری حضرات کے لیے یہ کوئی سود مند صورت ہے کہ وہ اتنے قلیل عرصے کے لیے بینک کو شریک یا رب المال بنالیں۔ ایسی صورتوں میں وہ بنک سے قرض حسنہ کی درخواست ہی کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینک ایسے مواقع پر قرض حسنہ دینے کے لیے سرمایہ کن ذرائع سے حاصل کرے گا؟ ہمارے خیال میں، بینک کے کھاتہ داروں میں ایک طبقہ ہمیشہ ایسے لوگوں کا موجود رہے گا۔ جو شرکت و مضاربت کی بنیاد پر کوئی سرمایہ بینک کے حوالے کر کے کسی نقصان کا خطرہ مول لینا نہ چاہیں گے۔ ایسے لوگ اپنا سرمایہ بچت کھاتوں میں بینک کے پاس قرض حسنہ کے طور پر رکھ دیں گے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے سرمائے کا ایک کثیر حصّہ کبھی بینک سے نہیں نکلواتے، لہٰذا بینک کے لیے ممکن ہوگا کہ روز مرہ ضروریات کے لیے ایک قلیل حصّہ نقد کی صورت میں رکھیں اور باقی سرمائے کو اپنے تصرف میں لے آئیں۔ مرکزی بینک کی طرف سے یہ لازم کیا جائے گا کہ بینک بچت کھاتوں کا ایک حصہ (مثلاً ۱۰ فیصد) نقد رکھیں، دوسرا حصّہ (مثلاً ۵۰ فیصد) قرض حسنہ کی سہولتیں دینے کے لیے رکھیں اور باقی (مثلاً ۱۰ فیصد) کو مضاربت یا شرکت کی بنیاد پر منفعت بخش کاروبار میں لگائیں۔ مرکزی بینک کی طرف سے تناسب معیشت میں زر کی طلب و رسد کے پیش نظر وقتاً فوقتاً بدلا جاتا رہے گا۔

اس بات کا امکان ہے کہ چونکہ قرض حسنہ کی کوئی لاگت نہیں، لہٰذا کاروباری حضرات بہت بڑی تعداد میں قرض حسنہ لینے کی طرف رجوع کریں۔ اس طرح بینک میں ایسی درخواستوں کا بے پناہ ہجوم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں بینک کو اختیار ہوگا کہ وہ اس سلسلے میں ان لوگوں کو ترجیح دیں جن کے ساتھ ان کے کاروباری روابط زیادہ ہیں۔ اسی طرح بینک کوئی اور معیار بھی مقرر کر سکتا ہے، جس پر درخواستوں کو رد یا قبول کیا جائے۔

یہاں بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ خود بینک کے لیے قرض حسنہ دینے کی کیا ترغیب ہے؟ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور موثر ثابت ہوں گے:

۱۔ مرکزی بینک کی طرف سے ضابطہ طے کیا جائے کہ ہر بینک بچت کھاتوں کا ایک حصّہ قرض حسنہ کے لیے وقف کرے اور باقی کو (نقد ریزرو کے بعد) مضاربت یا شرکت کی بنیاد

پر کسی نفع بخش کاروبار میں لگائے۔ بینک کو لوگوں کے سرمائے سے نفع کمانے کی یہ سہولت اس شرط پر دی جاسکتی ہے کہ بینک خود بھی قرض حسنہ کی سہولت کے لیے کچھ سرمایہ فارغ رکھے۔ اگر کوئی بینک قرض حسنہ کی مقدار میں کمی کرے، یا بالکل بند کر دے تو مرکزی بینک اسی تناسب سے اسے بچت کھاتوں میں رقوم رکھنے کے حق سے محروم کر سکتا ہے۔

۔ مرکزی بینک اپنے تاریخی کردار "آخری وائن Lendero/The last resort اور بینکوں کے بینک" کے تحت تجارتی بینکوں کو قرض حسنہ کی سہولت دے گا۔ مرکزی بینک کیطرف سے تجارتی بینکوں کو قرض حسنہ کی یہ سہولت لی مقدار پر سے مشروط اور معلق ہو گی جو تجارتی بینک عام لوگوں کو قرض حسنہ کے طور پر دیں گے۔ اگر کوئی بینک اپنی کیفیت نقدی (Liquidity position.) کو بہتر بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہی مناسب ہوگا کہ وہ مرکزی بینک کی سہولت قرض حسنہ کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

۳۔ اسی طرح خود بینک کے کاروبار کے نقطہ نظر سے گاہکوں کو قرض حسنہ کی سہولت فراہم کرنا اس کی ساکھ قائم کرنے کے لیے بھی موزوں ہوگا۔ بینکوں میں باہمی مسابقت کے لیے بھی قرض حسنہ کی سہولت ایک عامل کے طور پر کام کر سکتی ہے[1]

"قرض حسنہ" پر ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر محمد اکرام صاحب کی مذکورہ تصریحات پر یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے، کہ قرض حسنہ کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کے طرز عمل سے استفادہ کیا جاسکتا ہے مؤرخین نے صراحت کی ہے، کہ یہ عہد فاروقی میں "بیت المال" کا ایک حصہ قرض حسنہ کے لیے مخصوص تھا۔ جس میں سے دو طرح کے قرض جاری کیے جاتے تھے: ذاتی ضروریات کے لیے امکان تعمیر مکان، مرمت، بیاہ شادی وغیرہ ۔ یہ قرض حسنہ" محدود مدت کے لیے جاری کیا جاتا تھا۔ قرض کی دوسری صورت یہ تھی۔ کہ تجارت کے لیے قرض جاری کیا جاتا تھا اس سلسلے میں حضرت عمر فاروق کی حکمت عملی یہ تھی، کہ تاجر کو "قرض" نفع و نقصان کی بنیادی پر جاری کیا جاتا تھا۔ اور اس میں جو منافع ہوتا، اس میں سے نصف بیت المال کا اور نصف قرض لینے والے کا۔" (ڈاکٹر محمد حمید اللہ: مقالہ عمر، در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، بذیل مادہ)۔

لہٰذا عہد جدید میں بھی اس کو محدود کیا جا سکتا ہے، رہا یہ مسئلہ کہ تاجر حضرات کو مختصر مدت کے لیے نفع و نقصان کی بنیاد پر قرض جاری کیا جا سکتا، تو ہمارے خیال میں یہ رائے درست نہیں ہے، اکثر کاروباری حضرات مختصر مدت کے لیے بھی قرض بر بنائے نفع و نقصان میں شرکت، کو لینا پسند کریں گے۔

بینک کے وسایل سرمایہ: جس سے وہ بینک اپنے کاروبار کے لیے مندرجہ ذیل ذرائع سے سرمایہ فراہم کرے گا۔

(۱) شرکائے بینک کا اپنا سرمایہ جس سے وہ بینک کا آغاز کریں گے،

(۲) مضاربت کے کھاتے: بینک کا دوسرا اہم ذریعہ مضاربت کے کھاتہ داروں کا سرمایہ ہوگا۔ کھاتے مضاربت کے اصول پر کھولے جائیں گے۔ ان کی کم سے کم مدت تین ماہ یا چھ ماہ رکھی جائے گی۔ مدت معاہدہ ختم ہونے سے قبل رقم بینک سے واپس نہیں لی جا سکے گی۔ کھاتہ دار اور بینک کی حیثیت مضاربت اور رب المال کی ہوگی۔ بینک اپنے تمام منافع میں سے مضارب کھاتہ داروں کے کل سرمائے پر منافع کا حساب لگائے گا اور اس میں ہر کھاتہ دار اس کو کے سرمائے کے متناسب سے شریک کرے گا، لیکن بینک کو نقصان کی صورت میں یہ نقصان کھاتہ داروں کا ہوگا، جو ان کے سرمائے کے تناسب سے وضع کیا جائے گا۔

(۳) بچت کھاتے: بینک کا تیسرا اہم ذریعہ بچت کھاتوں میں رکھی ہوئی رقوم ہوں گی یہ بچت کھاتے ان لوگوں کے ہوں گے جو بینک سے مضاربت کرکے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے اور ہر وقت اپنے پیسے کو نکلوانے کی آزادی برقرار رکھنا چاہتے ہیں ایسے لوگوں کا پیسہ بینک کے پاس قرض حسنہ کے طور پر ہوگا۔ بینک ان کے سرمائے کا ایک حصہ مزید قرض حسنہ کے لیے رکھ کر باقی کو نفع بخش کاموں میں لگانے کا مجاز ہوگا۔ بینک کو ایسے کھاتوں پر کسی قسم کی اجرت یا محنتانہ وصول کرنے کا حق نہیں ہوگا کیونکہ وہ ان رقوم کے ایک حصے کو نفع بخش کاموں میں لگا رہا ہوگا۔

(۴) تخلیق زر: بینک اپنی ساکھ کے اعتبار پر تخلیق زر کا رائج الوقت عمل بھی کرے گا۔ موجودہ زمانے میں بینک اعتبار کی بنا پر اپنے نقد اثاثوں سے کئی گنا زیادہ رقوم ربٰو پر قرض دے

دیتے ہیں۔ اصل میں تخلیق زر کا یہ عمل ربو کا مرہون منت نہیں بلکہ اس کی اصل لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ سب کے سب اپنا سارا روپیہ یکمشت نہیں نکلوالتے اور ان کا یہ یقین ہے بینک کے پاس ان کا پیسہ محفوظ ہے اور وہ اسے ہر وقت لے سکتے ہیں۔ یہ اعتبار بینکاری کی جان ہے۔ اس کے بغیر موجودہ دور میں ربائی بینک بھی نہیں چل سکتے۔ غیر ربائی بینک کے لیے بھی ایسا اعتبار قائم لازم ہوگا، لہٰذا غیر ربائی بینک بھی تخلیق زر کا عمل جاری کر سکے گا اور اس سے اپنے وسائل میں اضافہ کر سکے گا[1]

---

[1] استدراک: ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کی مذکورہ رائے، محل نظر ہے۔ اس لیے کہ شرعی نقطۂ نگاہ سے، زیر نظر صورت میں بینک کی حیثیت محض ایک "امانتدار" (مودع الیہ) کی ہوگی، اس لیے کہ یہ لوگ (ا) نہ تو بینک کے لیے "رب المال" ہیں اور (ب) نہ ہی اس کے ذریعے سرمایہ کاری کرنے والے۔ یہ لوگ تو بینک کے ذریعے محض اپنی رقوم کی حفاظت چاہتے ہیں۔ اس لیے جب تک ان کے سرمائے سے مذکورہ بالا کاروبار کرنے، یا ان کی رقوم کو، قرض حسنہ پر دینے کی اجازت نہ لے لی جائے، اس وقت تک بینک کے لیے اس تصرف کی شرعاً اجازت نہیں ہے، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں کتاب الودیعہ کے تحت ایسی ہی تصریحات ملتی ہیں، لہٰذا اس صورت میں بینک کے سامنے دو راستے ہوں گے۔

ا۔ یا تو وہ اپنی ذمہ داری پر، کھاتہ داروں سے انکی رقوم منفعت بخش کاروبار میں لگانے کی اجازت لے، تو ایسی صورت میں وہ انکے سرمائے سے کاروبار کر سکتا ہے، لیکن عند الطلب یا میعاد گذرنے پر، انکا سرمایہ واپس کرنا بینک کی ذمہ داری ہوگی۔ اس صورت میں بینک کی حقیقت ایک "قرض خواہ" کی اور "کھاتہ دار کی حقیقت "مقروض" (قرض دہندہ) کی ہوگی۔

ب۔ اور اگر کوئی کھاتہ دار اپنا سرمایہ بینک کی ذمہ داری پر نہیں دیتا، بلکہ بینک کے پاس امانت رکھواتا ہے۔ تو ایسی صورت میں بینک اسکے کھاتے میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ اور ایسے کھاتہ دار سے اس کی رقوم کی حفاظت وصیانت کے عوض "حفاظتی رقم" لینے کا مجاز ہوگا۔ اور نقصان کی صورت میں ذمہ داری خود کھاتہ دار کی ہوگی، بینک کی نہیں، ایسے کھاتہ دار کی رقم بینک اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا۔
کھاتہ دار سے اگر حفاظت کے لیے کچھ معاوضہ وصول کیا جائے، تو اس سے اسکو مضاربت یا شراکت کے کھاتوں میں رقوم جمع کرانے کی ترغیب ملے گی۔

۴ ۔ مرکزی بینک : اسلامی ریاست میں تجارتی بینکوں کے ساتھ مرکزی بینک کا قیام بھی لازم ہوگا بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ مرکزی بینک کے کنٹرول اور رہنمائی کے بغیر تجارتی بینک کا کامیابی سے چلنا ناممکن ہے ۔ اسلامی ریاست کا مرکزی بینک قریب قریب وہ تمام وظائف انجام دے گا جو کہ موجودہ دور کے مرکزی بینک انجام دیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر یہ معیشت میں قانونِ زر کی تخلیق کا واحد اجارہ دار ہوگا ، یہ بینکوں کا بینک ہوگا ، جس میں تمام بینک اپنے کھاتے کھولیں گے ۔ یہ بینکوں کی آپس کی حسب فہمی کے لیے " کلیرنگ ہاؤس " (Clearning House) کا کام دے گا ، یہ بینکوں کے لیے " آخری دائن " کے فرائض انجام دے گا ، یہ ریاست کے ترقیاتی کاموں کے لیے سرمائے کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہوگا اور معیشت میں زر اور اعتبار کی رسد کو کنٹرول کرے گا ۔ ان میں سے تقریباً تمام وظائف ایسے ہیں جو موجودہ دور میں صرف ربٰو کی شرح کو گھٹا بڑھا کے عمل میں آتے ہیں ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر ربائی مرکزی بینک اس اہم فریضے سے کیسے عہدہ برآ ہوگا؟ ذیل میں ہم ان اقدامات کا ذکر کرتے ہیں جن کے ذریعے غیر ربائی مرکزی بینک معیشت میں زر اور اعتبار کی رسد کو مطلوبہ پیمانے پر رکھ سکتا ہے :

۱ ۔ شرکت یا مضاربت حصص کی خرید و فروخت ؛
۲ ۔ بینکوں کے نقد سرمائے کی شرح میں تبدیلی ؛
۳ ۔ بینکوں کے مرکزی بینک میں محفوظ سرمائے کی شرح میں تبدیلی ؛
۴ ۔ بچت کھاتوں میں نقد قرض حسنہ کے لیے سرمائے اور مضاربت کے لیے سرمائے کے لیے تناسب رد و بدل ؛
۵ ۔ مرکزی بینک کی طرف سے تجارتی بینکوں کو ان کے قرض حسنہ کی بنیاد پر مزید قرض حسنہ دینے کی شرح میں تبدیلی ؛
۶ ۔ آخر دائن کی حیثیت سے تجارتی بینکوں کو قرض کی سہولتوں میں کمی بیشی ؛
۷ ۔ مضاربت کھاتہ دار اور تجارتی بینک کے درمیان شرح مضاربت میں تبدیلی ؛
۸ ۔ تجارتی بینک اور کاروباری حضرات کے درمیان شرح مضاربت میں تبدیلی ؛

۹ ۔ اخلاقی ترغیب ؛

۱۰ ۔ راست اقدام ؛

۔غیر ربائی بینکاری کے چند اہم مسائل : غیر ربائی بینکاری کا جو اجمالی خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس پر بہت سے سوالات وارد کیے جا سکتے ہیں ۔ ذیل میں ہم ان سوالات پر بحث کریں گے اور کچھ تجاویز پیش کریں گے ، جن پر مزید گفت و شنید کی ضرورت ہے ۔

۱ ۔ موجودہ معیار دیانت اور نفع و نقصان کی تقسیم : غیر ربائی بینکاری پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ موجودہ معیار دیانت کے ساتھ اگر کوئی بینک لوگوں سے شرکت و مضاربت کی بناپر مالی بینک لوگوں سے شرکت و مضاربت کی بنا پر مالی لین دین کرے کا تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو دیانتداری سے اپنے حسابات کا انکشاف کریں گے اور زیادہ لوگوں کی خواہش ہوگی کہ وہ اپنے اصل منافع کو چھپالیں ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض عملی دنیا کے مشاہدے پر مبنی ہے اور اگر کوئی ایسا انتظام نہ کیا جائے جو لوگوں کو دیانت پر پابند کرے تو بینک کی کارکردگی خطرناک حد تک متاثر ہو سکتی ہے اس کا اصل حل تو لمبے عرصے کی منصوبہ بندی کے ذریعے لوگوں کی ذہنی تربیت اور ایمانی حالت کا ارتقا ہے ، لیکن اس نصب العین کے حصول تک کے درمیانی عرصے کے لیے مندرجہ ذیل تجویز پر غور کیا جا سکتا ہے ۔

حکومت تمام تجارتی شعبوں کے لیے ایسے معاشرتی مطالعے اور تجزیے کا مستقل بندوبست کرے جو کہ مارکیٹ کے اتار چڑھاو بین الاقوامی تجارت ، ملکی پیداوار ، مزدوروں کی کارکردگی اور لاگت پیدائش جیسے عوامل و عناصر کو پیش نظر رکھ کر تمام کاروباروں کے متعلق رپورٹیں شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کرے ۔ یہ رپورٹیں ہفتہ وار ، پندرہ روزہ یا ماہوار ہونی چاہئیں اور انکے ذریعے کاروبار میں اوسط منافع کی شرح کا معیار مقرر کر دیا جائے ، جو ہر اعتبار سے ایک معتدل معیار ہونا چاہیے ، یعنی یہ نہ تو ایک بہت زیادہ مستعد آجر کا معیار ہو اور نہ ایک تن آسان اور بگڑے ہوئے آجر کا ۔ اس شرح کو متعین کرتے وقت حکومت کم سے کم معیار نگرانی (MINIMUMVIGILANCE) کے اصول پر کام کرے ، یعنی ہر کاروباری کے لیے لازم ہو کہ وہ بینک کے سرمائے پر کم سے کم معیار

کے مطابق نگرانی کرے اور اسے ضائع نہ کرے۔ یہ کم سے کم معیار کھلے طور پر شائع کیا جا سکتا ہے، جس میں ہر آجر کے لیے مختلف مواقع میں جب کم سے کم کاروباری صلاحیت کی ضرورت ہے، اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔

بینک کے سرمائے کی واپسی کے وقت جو آجر اس اوسط منافع کی شرح سے کم شرح کا اعلان کرے اس کے حسابات کی تفصیلی چھان بین بینک کا فنی عملہ کرے۔ اگر پڑتال کے دوران پتا چلے کہ آجر نے بینک کے سرمائے پر کم سے کم نگرانی کا اصول استعمال نہیں کیا، تو بینک اس کا اعلان کردہ منافع کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔ جھگڑے کی صورت میں ثالثی عدالتوں میں مقدمہ لے جایا جا سکتا ہے۔

اگر یہ ثابت ہو کہ منافع تو اصل میں اتنا ہی ہے جتنا کہ کاروباری ظاہر کر رہا ہے (یعنی وہ اخفا سے کام نہیں لے رہا) تو بینک کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ وہ اس ظاہر کردہ نفع میں سے بھی اپنا حصّہ قبول کرے، لیکن آئندہ کے لیے بینک ایسے کاروباری کو سرمایہ فراہم کرنے پر پابندی لگا سکتا ہے۔ ایسے کاروباریوں کے نام بھی بینکوں کے گزٹ میں شائع کیے جا سکتے ہیں تاکہ دوسرے بینک ان سے ہوشیار رہیں۔

اسی طرح اگر کوئی کاروباری بینک کے سرمائے پر نقصان ظاہر کرے تو بھی بینک کو اختیار ہوگا کہ حسابات کی تفصیلی پڑتال کرائے۔ پڑتال کے دوران میں اگر کسی بد دیانتی اخفا یا عدم خلوص کا ثبوت مل جائے تو بینک کو اختیار ہوگا کہ وہ کاروباری کے ظاہر کردہ حسابات کو ماننے سے انکار کر دے۔ اس صورت میں سارا نقصان اس کاروباری کو برداشت کرنا پڑے گا۔

بد دیانتی، حسابات میں گڑبڑ مال کے ضیاع کی دانستہ کوشش، وغیرہ اقدامات کو قانوناً سخت سزا کا مستوجب بھی قرار دیا جا سکتا ہے تاکہ لوگ ان کی طرف راغب نہ ہوں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ جن صورتوں میں کسی کاروباری کے حسابات کے پڑتال کی ضرورت آئے گی وہ حسابات اس کاروباری شخص کے اخراجات پر جانچے جائیں گے تاکہ بینک کے اخراجات بھی کم سے کم رہیں اور لوگ بھی اس پوچھ سے بچنے کے لیے حسابات میں گڑبڑ نہ کریں۔

۲۔ بچت کی رسد: غیر ربائی بینک پر یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ ربو نہ ملنے کی صورت

میں لوگ بینک میں اپنی بچتیں نہیں رکھا کریں گے کیونکہ اب ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ وہ یا تو انہیں بچت کھاتے میں رکھیں اور کوئی ربوٰ نہ کمائیں یا پھر مضاربت کی بنیاد پر رکھیں اور نقصان کا خطرہ مول لیں اور ہر وقت رقم نکلوانے کی سہولت سے دستکش ہو جائیں۔ لہٰذا عام لوگ بینک میں اپنی بچتوں کو رکھنے سے احتراز کریں گے۔

دراصل یہ خطرہ پے در پے غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ اول تو یہ بات ہی طے نہیں کہ لوگ بچت ربوٰ کمانے کے لیے کرتے ہیں۔ بچت کے بہت سے محرکات ہیں، جن میں سے ربوٰ صرف ایک ہے بلکہ خود مغربی معاشرے میں جمع کیے گئے اعداد و شمار کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ شرح سود میں تبدیلی سے بچتوں کے معیار پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا [1]

دوم اگر کسی معیشت میں ربوٰ کے تمام راستے بند ہو جائیں تو اس جدید دور میں لوگ اپنی بچتوں کا کیا کریں گے؟ ان کے لیے تین ہی راستے کھلے ہیں: یا وہ کاروبار کریں، یا انہیں مضاربت یا شرکت کی بنیاد پر بینک کو دے دیں، یا پھر بینک میں امانت قرض حسنہ کے طور پر رکھ دیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن نہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس دور میں کوئی شخص اپنی بچت کو گھر میں گڑھا کھود کر اس میں دبا دے گا، خاص طور پر ایک اسلامی معیشت میں، جہاں کاروبار کی بہت ترغیب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لوگوں کو اپنا سرمایہ کاروبار میں لگانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

● ہنڈیوں میں کٹوتی: واجب الوصول ہنڈیوں میں رائج الوقت کٹوتی صریحاً ربوٰ ہے۔ ایک غیر ربائی بینک اس معاملے میں کیا رویہ اختیار کرے گا؟ کیا وہ ہنڈیوں کو بھنانے کا دستور ہی رائج نہ کرے گا۔ یا ان کو پوری رقم پر (بغیر کٹوتی کے یا قرض حسنہ کے طور پر) بھنایا جا سکے گا؟ اگر یہ قرض حسنہ ہے تو کیا بینک ان تمام مطالبات سے عہدہ برا ہو سکے گا جو اس سلسلے میں اس کے گاہکوں کی طرف سے اس پر کیے جائیں گے۔

اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے، یعنی بینک اس کو ایک خدمت خلق

---

[1] زر اور اعتبار کمیشن رپورٹ، نیو یارک ۱۹۶۴ء، ۱۳ تا ۲۱، نیز ریڈ کلف کمیٹی رپورٹ مطبوعہ لندن ص ۵۶

سمجھ کر قرض حسنہ کے طور پر پوری رقم کے عوض بھنانے کا بندوبست کرے گا، لیکن معاشی نقطہ نظر سے یہ بات زیادہ دل کو نہیں لگتی، لہٰذا ایک دوسری تجویز یہ ہے کہ بینک واجب الوصول ہنڈیوں کو بھنانے کا انتظام کریں اور اس میں جو کٹوتی مقررہ شرح سے کی جائے وہ بینک کے لیے قرض حسنہ کے طور پر ہو اور بینک اسے اس تناسب سے استعمال کرے جس تناسب سے اس نے کسی گاہک کو ہنڈی کے ذریعہ مالی مدد دی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کٹوتی کا نرخ دس فیصد ہے اور ایک ہنڈی برائے ۱۰۰۰ روپے تین ماہ کے بعد واجب الوصول ہے تو بینک آج ۹۰۰ روپے نقد ادا کرے" جو کہ گھر یا بینک کی طرف سے اس شخص کو تین ماہ کے لیے قرض حسنہ ہے اور اس کے ساتھ ہی اس حسن سلوک کے جواب میں وہ شخص بینک کو ۱۰۰ روپے ۲۷ ماہ ($\frac{900 \times 3}{100}$) تک کے لیے قرض حسنہ کے طور پر دے، جسے بینک یہ مدت گزرنے کے بعد شخص مذکور کو واپس کر دے۔ قرض حسنہ کی یہ مدت کٹوتی کی شرح اور بل کی مدت کے حساب سے طے ہونی چاہیے۔ یہ ایک باہمی احسان کا معاملہ ہے، جس میں شرعی اعتبار سے کوئی نقص معلوم نہیں ہوتا۔

• ۔ صارفین کے قرضے : مذکورہ بالا غیر ربائی بینک کی ضروریات کے قرضوں کا ذکر نہیں آیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صارفین کو ضرورت کے لیے قرض حسنہ دینے کا کیا طریقہ ہوگا؟ عام طور پر صارفین کی تعداد بہت زیادہ اور ان کے مطلوبہ قرض کی رقم بہت قلیل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انہیں یہ قرض روزمرہ ضروریات کے لیے درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک تجارتی بینک کو ان بے شمار چھوٹے چھوٹے گاہکوں سے قرض حسنہ کی بنیاد پر معاملہ کرنے میں بے حد دشواری لاحق ہو سکتی ہے اس سلسلے میں ایک تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ غیر ربائی صارفین کے سٹورز (STORES) ان کو قرض حسنہ دینے کا بندوبست کریں۔ یہ سٹور عام لوگوں کو قرض حسنہ دیں گے۔ بعض صورتوں میں تجارتی بینک ان سٹورز کے ساتھ مضاربت بھی کر سکتا ہے۔ اس کا انحصار اس مدت پر بھی ہے جس کے لیے کسی سٹور کو بینک سے روپیہ درکار ہو۔

• ۔ ضمانت برائے اصل نفع ونقصان : اس سلسلے میں حسب ذیل سوالات اٹھائے جاتے ہیں؛

(۱) کیا حکومت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ یہ ضمانت دے کہ اگر غیر سودی بینک کو نقصان اٹھانا پڑے تو اس صورت میں بھی عند الطلب کھاتے داروں کا پورا سرمایہ محفوظ رہے گا (چاہے

حکومت کو اپنے پاس سے ادا کرنا پڑے)۔

(۲) کیا بینک کو نقصان ہونے کی صورت میں حکومت ان کھاتے داروں کے نقصان کی تلافی کرے گی جنہوں نے اپنی رقوم بینک میں نفع و نقصان میں حصّہ داری کے اصول پر رکھی تھیں۔

(۳) اگر ایک خاص شرح سے کم نفع ہو تو کیا حکومت اس کمی کی (الف) ہر حال میں تلافی کرے گی، یا (ب) اس حال میں تلافی کرے گی جب یہ نقصان کسی اتفاقی یا قدرتی وجہ سے ہوا ہو یا (ج) اس حال میں تلافی کرے گی کہ اس کی وجہ یا تو حکومت کی پالیسی ہو یا غیر متوقع ملکی یا بین الاقوامی عوامل؟ اگر اس قسم کی ضمانتیں دی جا سکتی ہیں تو کیا یہ ضمانتیں حکومت کے بجائے بیمہ کمپنی بھی دے سکتی ہے؟

سوالات کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس مفروضے پر کئے گئے ہیں کہ شرکت و مضاربت کی شکل میں بینکاری پر لوگوں کا اعتماد قائم رکھنے کے لیے حکومت کسی طرح سے یہ ضمانت دے دے کہ ایسے نئے تجربے میں کسی نقصان کا احتمال نہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل معروضات قابل توجہ ہیں:

۱۔ جہاں تک بینکاری کے لیے نئے نظام پر اعتماد قائم کرنے کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اگر یہ اعتماد نہ ہو تو بینکاری کا تجربہ سرے سے آزمایا ہی نہیں جا سکتا۔ اعتماد کی صرف یہی ایک صورت نہیں کہ حکومت اصل زر کے تحفظ یا نقصان نہ ہونے کی بدیہی ذمہ داری اپنے سر لے۔ آج کل کاغذ کے کرنسی نوٹ گردش میں ہیں۔ جب اوّل اوّل یہ گردش میں آئے تو انہیں سونے چاندی میں تبدیل کرایا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ حکومتوں نے یہ تبادلہ بالکل ختم کر دیا۔ اب محض رسم کے طور پر ہر نوٹ پر تبادلے کی ضمانت کے الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ نوٹ سونے چاندی میں تبدیل نہیں کئے جا سکتے، تاہم نوٹ پر مرتسم الفاظ بہر حال ایک ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح کی ضمانت کی ایک مثال زر کی تاریخ میں یہ واقعہ ہے کہ جب ہٹلر کے بعد جرمنی میں قیمتیں دس لاکھ گنا تک چڑھ گئیں تو لوگ بوریوں کی بوریاں مارک کی لیے پھرتے تھے، لیکن کوئی چیز نہ خرید سکتے تھے اس وقت کی حکومت نے تمام موجودہ کرنسی کو ختم کر دیا اور ایک نیا سکّہ، جس کا نام رینٹن مارک (RENTAN MARK) تھا، جاری کیا اور اعلان کیا کہ اس سکّے کے

کے پیچھے پورے ملک کی زمین ضمانت ہے[1] ظاہر ہے کہ یہ ایک لفظی کھیل تھا، لیکن اس ضمانت سے لوگوں کا اعتماد نئی کرنسی پر قائم ہوگیا۔ لہٰذا غیر ربائی بینکاری میں بھی حکومت کو لازم ہوگا کہ وہ مجمل الفاظ میں تمام نظام کی کامیابی کی ضامن بنے، تمام ربائی کار و بار سختی سے بند کرے اور قانون کے پورے تحفظ کے ساتھ اس نظام کو رائج کرے۔ ان اقدامات سے لوگوں کا اعتماد قائم کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ رہا یہ سوال کہ حکومت اصل زر، نفع کی ایک خاص مقدار، یا نقصان کے واقع نہ ہونے کی ضمانت دے تو یہ سارے معاملے کو ربائی رنگ دے گا، جس میں کہ ہم آج کل مبتلا ہیں۔

۳۔ تاریخ اسلام میں ایسے نقصانات کی تلافی کا ایک انتظام ملتا ہے اور اگر ضروری ہو تو اس انتظام کو دوبارہ رائج کیا جاسکتا ہے۔ اس کی اجمالی شکل یہ ہے کہ جس شخص کو اپنے نقصان کی تلافی مقصود ہو، وہ بیت المال کو اس کی درخواست دے اور اس درخواست میں اپنے تمام مالی کوائف اور مدد کے استحقاق کی وجوہ تفصیل سے بیان کرے۔ پھر بیت المال اپنے وسائل کی حد تک (نہ کہ پورے نقصان کی حد تک) اس کی اعانت کر دے، لیکن یہ اعانت ہر معاملے میں اس کا استحقاق ثابت ہونے کے بعد ہی کی جاسکے گی۔ اس میں کوئی بالمقطع قسم کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

۴۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے سرمائے کے تحفظ کے لیے اسلامی اصولوں پر استوار ایک باہمی انشورنس کمپنی (Mutual Insurance Company) میں اپنے سرمائے کا بیمہ کرالیتا ہے تو یہ ایک جائز صورت ہے اس صورت میں اس شخص کو بیمہ کمپنی کو ایک پریمیم الگ سے دینا ہوگا۔ یہ ضمانت بینک کی طرف سے نہ ہوگی، البتہ بینک اس کا واسطہ بن سکتا ہے کہ ایسے تمام کھاتہ داروں کا پریمیم ایک گروپ کی شکل میں کمپنی کو ادا کر دے۔ نقصان کی صورت میں صرف نقصان کی حد تک کمپنی وہ نقصان پورا کرے گی اور اگر اصل زر محفوظ رہے تو کمپنی کے ذمے کوئی حق کسی فرد کا ثابت نہیں ہوگا۔

قرضوں کا نیلام: بعض ماہرین کا خیال ہے کہ بینک لمبے عرصے کے لیے پیدا واری قرضوں

---

[1] An outline of money : Crother P.6

پر مقررہ شرح سے سود لینے کے بجائے اپنے قرضوں کا نیلام کریں۔ اس کی فرضی مثال یہ ہے کہ بینک "الف" کے پاس دس کروڑ روپیہ لمبی مدت کے لیے قرض دینے کو دستیاب ہے۔ بینک مدت اور رقم کے لحاظ سے اسے مختلف اجزا میں تقسیم کر دیتا ہے:

پچاس لاکھ روپیہ ۳ سال کے لیے

پچاس لاکھ روپیہ ۷ سال کے لیے

ایک کروڑ روپیہ ۵ سال کے لیے

پچیس پچیس لاکھ کے آٹھ اجزا دس دس سال کے لیے اور

دو کروڑ روپیہ چار سال کے لیے۔

بینک ٹنڈر طلب کرتا ہے کہ جو شخص مقررہ مدت گزارنے کے بعد سرمایہ اور سرمائے کا زیادہ سے زیادہ نفع فیصد دینے کی پیش کش کرے گا، اسے یہ رقم دے دی جائے گی۔

یہ معاملہ اول تا آخر ایک ربائی معاملہ ہے۔ عام ربائی معاملے اور اس میں صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں ربٰو کی شرح مدیون مقرر کر رہا ہے۔

اس طرح کا کوئی اقدام صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے کہ ٹنڈر میں مدیون اپنے نفع کا جو حصّہ بینک کو دینے کا پابند ہو اس کا اظہار کرے، یعنی یہ اصل زر پہ نہ ہو بلکہ متوقع نفع کا کوئی حصّہ ہو۔ اس طرح کا کوئی ٹنڈر بینک کے لیے اسی صورت میں سودمند ہو سکتا ہے جب خود نفع کا کوئی یکساں تصوّر سب کے لیے استعمال کیا جا سکے، لہٰذا اگر بینک یہ طے کر دے کہ لاگت پیدائش میں کون کون سے عناصر ہوں گے اور نفع کا تعین کیسے کیا جائے گا تو پھر بعض صورتوں میں تقابل ممکن ہوگا[1] ان صورتوں میں بہت سے دوسرے عوامل از قسم کاروباری تجربہ، ماضی کی کارکردگی، بینک

---

[1] استدراک: لیکن ایک مسئلہ اس کے باوجود محل نظر ہے، وہ یہ کہ ایسی صورت میں متوقع نفع محض ایک "تصوراتی" شئ ہوگا۔ جو فی الوقت موجود نہیں ہے۔ اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے غیر موجود شئ کی فروخت جائز نہیں ہے۔

اور کاروبار کے باہمی تعلقات، ضمانت، مدت واپسی، وغیرہ بھی نظر انداز نہیں کیئے جا سکیں گے۔[1]

۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد "اسلامی نظریاتی کونسل" کو ہدایت کی کہ وہ پاکستان میں "اسلامی بینک کاری" کے متعلق سفارشات اور تجاویز مرتب کر کے حکومت کو پیش کرے، چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل نے نومبر ۱۹۷۷ء میں پاکستان کے معروف ماہرین معاشیات اور ممتاز بینکاروں پر مشتمل ایک پینل تشکیل دیا۔ جس نے فروری ۱۹۸۰ء میں اپنی سفارشات حکومت کو پیش کیں۔ یہ سفارشات بلاسود بینکاری رپورٹ کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

یہ سفارشات و تجاویز اس لحاظ سے منفرد اور اپنی مثال آپ ہیں، کہ اس کی تیاری میں پاکستان کے ممتاز اور ذہین دماغوں نے باہم مل بیٹھ کر کام کیا ہے اور یہ جامع رپورٹ تیار کی ہے۔ یہ رپورٹ مجموعی طور پر گو ایک منفرد کاوش ہے۔ لیکن بعض مسائل پر اس میں خصوصی توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کے بعض مندرجات محل نظر بھی ہیں۔ بہر حال اس رپورٹ کے اہم مندرجات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ نگرانی ا۔ "نئے نظام کے تحت بینک ایسی پارٹیوں کو نفع و نقصان کی بنیاد پر سرمایہ فراہم کریں گے، جن کے کھاتوں کا آڈٹ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کر سکیں۔ جن پارٹیوں کے حسابات کا آڈٹ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ نہ کر سکیں انہیں ملکیتی کرایہ داری۔ بیع موجل یا پٹہ داری انتظامات کے تحت امداد مہیا کی جائے گی۔ چھوٹی چھوٹی پارٹیاں جو حساب کتاب نہ رکھ سکتی ہوں۔ انہیں عام شرح منافع۔ ملکیتی کرایہ داری یا بیع موجل کی سکیم کے تحت مالی امداد مہیا کی جائے گی" (پیرا نمبر ۶۰۲)
نئے نظام کے تحت سرمایہ کاری کے معاہدے بینکوں کو ان منصوبوں کی واقعی کارکردگی کی نگرانی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے؛ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی؛ غیر سودی بینک کاری، مطبوعہ، لاہور، ڈاکٹر محمد اکرام؛ مقالہ علم (معاشیات) در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ۱۴/۱۴-۱۴/۱: ۴۵۴-۴۵۵،
بلاسود بینکاری۔ مطبوعہ لاہور۔

سونپیں گے، جن میں انہوں نے سرمایہ کاری کی ہوگی تاکہ ان کے مفادات محفوظ رہیں۔[۱] (ب-۲-۸)
بینک بجائے خود انفرادی طور پر و دیگر مالیاتی اداروں کے تعاون سے نئے منصوبے بناسکتے ہیں اور ایسے منصوبوں کے لیے مطلوبہ پلانٹ اور مشینری کے خریدنے کے لیے رقم "نیلامی سرمایہ کاری" کے تحت فراہم کر سکتے ہیں۔[۲]

۲- ورکنگ (WORKING)

بینک مختلف لوگوں کو جس طرح سرمایہ فراہم کریں گے، اس کے بارے میں کونسل کی سفارشات حسب ذیل ہیں:

ا- زرعی قرضہ جات: کسانوں کو قلیل المیعاد سرمایہ فراہم کرتے وقت تجارتی بینکوں کو گزارہ یونٹ سے کم اور گزارہ یونٹ سے زیادہ مالکان اراضی کے مابین فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ "گزارہ یونٹ" کے مالکان کو نقد یا جنس کی صورت میں کسی معاوضہ کے بغیر "خصوصی قرضوں کی سہولت" کے ذریعے امداد دی جاسکتی ہے۔ گزارہ یونٹ کے مالکان کو نقد یا جنس کی صورت میں کسی معاوضہ کے بغیر قرضوں کی سہولت کے ذریعے مالی امداد دی جاسکتی ہے، عام طور پر ایسے قرضے بینکوں کے ان فنڈز سے دیے جانے چاہئیں، جو غیر سودی بنیادوں پر جمع کیے گئے ہوں۔ تاہم اگر ایسے فنڈز ناکافی ہوں، تو حکومت بینکوں کو متعلقہ صورت میں ان کی "اوسط شرح منافع" کی بنیاد پر ان قرضوں کے عوض مالی امداد دے سکتی ہے، (پ-۲-۶)

---

[۱] ان سفارشات کے ذریعے اسلامی نظریاتی کونسل نے بینکوں کے نگرانی کے نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ جو ایک اچھی تجویز ہے۔ اس لیے کہ اسی نگرانی اور آڈٹ پر "اسلامی بینکاری" کے نظام کی اساس رکھی جائے گی۔ موجودہ بینک چونکہ نفع ونقصان کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رکھتے، لہٰذا ان کا کام صرف اپنی شرح سود کی وصولی تک محدود رہتا ہے۔ جبکہ اسلامی بینکاری میں بینک، "سرمایہ کار" (رب المال) یا مضاربت کی حیثیت سے براہ راست اس کی ورکنگ میں شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا نگرانی اور آڈٹ کو بہتر بنانے کی اہمیت از خود واضح ہے۔

[۲] سرمایہ کاری کی نیلامی کے جواز و عدم جواز پر آئندہ صفحات میں (شیخ محمود احمد صاحب کی تجویز کے تحت) بحث ہوگی۔

گزارہ یونٹ سے زیادہ اراضی کے مالکان کو مختصر مدت کے لیے "بیع موجل" یا بیع سلم کے تحت سرمایہ فراہم کیا جا سکتا ہے لے (پ ۲ - ۱۷)

درمیانی اور طویل مدت کے لیے سرمایہ کاری زرعی مشینری، و آلات کی خرید و مرمت، کنوؤں کی کھدائی، ٹیوب ویلوں کی تنصیب، زمین کی اصلاح، گودام، سٹور، پولٹری اور ڈیری فارموں کی تعمیر کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ زرعی شعبہ میں درمیانی اور طویل المقاصد سرمایہ کاری کے لیے سود کی جگہ کسی ایسے متبادل طریقے کو رائج کرنا جو شریعت کے مطابق ہو، ممکن نہیں ہے بس مختلف مقاصد کے لیے مختلف متبادل طریقے اختیار کرنے پڑیں گے، (پ ۲ - ۱۸، ۲ - ۲۴)

ب - تجارتی قرضہ جات / سرمایہ کاری: نئے نظام کے تحت ایسے خوردہ فروشوں کو جو اپنے کاروبار کا باقاعدہ حساب کتاب نہیں رکھ سکتے، بیع مؤجل کے تحت، یا خصوصی قرضوں کی سہولت کی بنیاد پر ایسے فنڈز سے قرضے دیے جا سکتے ہیں، جو بینک نے بلاسودی بنیاد پر جمع کیا ہو۔

لے یہاں کونسل نے کاشتکاروں کو جو بیع مؤجل یا بیع سلم کے تحت قرض فراہم کرنے کی جو سفارش کی ہے، وہ غور طلب ہے: بیع "بیع سلم" کی کچھ شرائط ہیں، جن میں سے ایک شرط یہ ہے۔ کہ اس میں دونوں طرف نقدی / سکے نہ ہوں لہٰذا اس صورت میں یہ لازم آتا ہے، کہ حکومت کاشتکاروں سے، ان کی "جنس" قبل از وقت رقم ادا کر کے، قدرے کم قیمت پر خرید لے۔ اور زمینداروں کو قیمت قبل از وقت دیدے۔ اس کی دوسری شرط یہ ہے۔ کہ اس میں وقت کی تعیین بیع کے وقت جانی چاہئیں۔ لہٰذا یہ اس کے لیے "مدت مجہول" نہیں ہو سکتی تیسری شرط یہ ہے۔ کہ اس کے "بدل" یا قیمت پر مجلس میں قبضہ ضروری ہے۔ گویا جس مجلس میں معاہدہ ہو اسی مجلس میں انہیں رقم ادا کر دی جائے۔ جبکہ "بیع مؤجل" میں معاملہ برعکس ہوتا ہے، یعنی "مبیع" پہلے اور قیمت بعد میں۔ لہٰذا اس تجویز پر مذکورہ شرائط کی روشنی میں عمل کیا جا سکتا ہے تاہم زیادہ بہتر یہ ہے۔ کہ زمینداروں کو قرض۔ قرض حسنہ کے طور پر دیا جائے۔

اگر یہ فنڈ ان کی مدد کے لیے کافی نہ ہو، تو حکومت ان خصوصی قرضوں کے عوض تجارتی بینکوں کو اس دوران میں ان کی اوسط شرح منافع کی بنیاد پر امداد مہیّا کرے۔ جہاں بینکوں کی جانب سے تجارتی شعبے میں اقراض زر، اوورڈرافٹ اور عند الطلب قرضوں اور ہنڈی بھنانے کی صورت میں سرمایہ کاری کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں وہی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے، جس کی سفارش صنعتی شعبے کی رواں سرمائے کی ضرورتیں پوری کرنے کے ضمن میں اوپر کی گئی ہے لیٹر آف کریڈیٹ کی صورت میں بینک اپنی خدمات کے عوض کچھ معاوضہ وصول کر سکتے ہیں اور ان کے لیے نفع ونقصان میں شرکت ضروری نہیں ہوگی (پیراگراف ۲-۲۳)

ٹرکوں، بسوں، بڑی گاڑیوں اور پرائیویٹ کاروں کی خرید کے لیے بنک "ملکیتی کرایہ داری" یا "بیع مؤجل" کے نظام کے تحت سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں۔ (پ ۲-۲۵)

تعمیر مکانات کے لیے تجارتی بینک وہی طریقے کار اپنا سکتے ہیں جس کی سفارش کونسل نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے لیے کی تھی، اور جسے مذکورہ کارپوریشن اختیار کر چکی ہے۔ (۲-۲۴)

محنتی اور ہونہار طلبا کو تعلیمی مقاصد کے لیے بلا سود قرضے دیے جا سکتے ہیں آفت زدہ علاقوں کے لوگوں کو وفاقی زکوٰۃ فنڈ سے قرضے دیے جا سکتے ہیں؛ اس کے علاوہ صارف کو پائیدار اشیاء کی فراہمی کے لیے جو اقتصادی طور پر جائز ہو "بیع مؤجل" یا "ملکیتی کرایہ داری" کے تحت محدود پیمانے پر سرمایہ فراہم کیا جا سکتا ہے (پ ۲-۲۷؛ ۲۸)

۳- بینکوں کی بچتیں / امانتیں / منافع

۱- امانتیں جمع کرانے والوں کے اعتماد کو کسی ٹھیس سے محفوظ کے لیے۔ نیز بینکوں کی طرف سے چلائی گئی بچت اسکیموں کی کامیابی کے لیے مختصر عبوری مدت میں بینکوں میں امانتیں جمع کرانے کا موجودہ طریقہ جاری رہنا چاہیے (پ ۲-۲۹)

۲- نئے نظام میں بچت کھاتوں اور میعادی امانتوں پر قابل تقسیم منافع بینکوں کے نفع ونقصان کی بنیاد پر مختلف شرح سے واجب الادا ہوگا (۲-۳)

۳- نئے نظام میں کے تحت امانتوں کے عنوان نیز ان سے متعلق قوانین اور طریق کار

حتی الامکان تبدیل نہیں ہونے چاہئیں۔ تاکہ الجھنیں پیدا نہ ہوں، تاہم بنیک کاری کی اصطلاح میں بعض تبدیلیاں موجودہ نظام میں انقلاب لانے کی راہ میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں، بینکوں کو اس بات کی بھی مکمل آزادی رہنی چاہیے کہ وہ امانتوں کو مختلف مدات میں لگا سکیں۔ امید کی جاتی ہے۔ کہ امانتوں کو نئے نظام کے مطابق ڈھالنے کے بعد جس طرح حکومت اس وقت قومیائے گئے بینکوں کی امانتوں کی ضمانت دیتی، اسی طرح عبوری مدت میں بھی دیتی رہے گی۔ (پ ۲۱ - ۳۳)

۴۔ نئے نظام میں کم منافع دینے والے بینکوں کی طرف امانتوں کی منتقلی روکنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ قومیائے گئے بینکوں میں جمع شدہ تمام امانتوں کا کل منافع ایک جمع کر لیا جائے، اور پھر اسے جملہ امانتداروں میں یکساں شرح سے تقسیم کیا جائے[1] (پ ۲ - ۳۴)

۵۔ بینکوں کے مابین کاروبار نفع ونقصان میں حصہ داری کی بنیاد پر جاری رکھا جائیگا۔ (پ ۲-۳۵)

---

[1] یہ دفعہ اسلام کے قانون مضاربت اور قانون شراکت دونوں کی روح کے منافی ہے۔ اس لیے کہ جب بینک (الف) کے امانت داروں کے حصے میں منافع مثلاً دس فیصد آرہا ہو، تو اسے بینک (ب) کے ساتھ ملاکر، انھیں کم حصہ دینا۔ ان کی ملکیت میں تصرّف کرنا ہے، جسکی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح یہ دفعہ بینکوں کے درمیان مسابقت کے جذبے کو ختم کرنے کا بھی باعث ہوگی، اس لیے کہ جب انھیں معلوم ہوگا۔ کہ دوسرے بینکوں کے ساتھ مل کر اس کے منافع بھی یکساں ہو جائیں گے۔ تو وہ منافع کے حصول کے لیے زیادہ محنت اور دماغ سوزی سے کام نہ لیں گے۔ اس لیے ہمارے خیال میں بینکوں کے درمیان مسابقت کا جذبہ باقی رکھنا ضروری ہے اور اگر کسی بینک کی بہتر کارکردگی، بہتر اخلاقی معیار اور بہتر خدمات کی بنا پر اس کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہو جائے، تو یہ بات اسلامی بینک کاری کے منافی نہیں ہے۔ البتہ حکومت کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے، کہ آیا کوئی بینک "سودی" کاروبار کے ذریعہ تو کاروبار کو وسعت نہیں دے رہا جو اسلامی بینک کاری کے لیے واقعی خطرے کی بات ہوگی۔

۴۔ اسٹیٹ بینک (STATE BANK) کا کردار

اسٹیٹ بینک (STATE BANK) تجارتی بینکوں کو اپنی مال کاری کی مختلف اسکیموں کے تحت اور اس کے علاوہ ان کی نقد پذیری کی عارضی قلتیں دور کرنے کے لیے مالی امداد فراہم کرتا ہے۔ نئے نظام کے تحت عام طور پر ایسی امداد نفع ونقصان میں حصہ داری کی بنیاد پر فراہم کی جائے گی۔

(پ/ ۲ - ۳۶)

۲ - پاکستانی بینکوں کی غیر ملکی شاخوں نیز اندرون ملک تجارتی بینکوں جن میں غیر ملکی کرنسی جمع ہوتی ہے اور بیرون ملکوں کے ساتھ پاکستانی بینکوں کا لین دین بعض خاص صورتوں میں سود کی بنیاد پر جاری رہے گا۔ غیر سودی آمدنی کو سودی آمدنی سے علیحدہ رکھنے کے لیے پاکستانی بینکوں کا انتظام ایک علیحدہ کارپوریشن کے سپرد کر دیا جائے، اور غیر ملکی کرنسی میں جمع کردہ امانتیں بھی اس کی تحویل میں دے دی جائیں، اس کارپوریشن کو مقامی امانتیں جمع نہیں کرنی چاہئیں۔ (پ/ ۲ - ۳۸)

۵۔ شیخ محمود احمد کی تجاویز

اسلامی نظریاتی کونسل کی مذکورہ بالا کمیٹی میں شیخ محمود احمد بھی شامل تھے۔ انہوں نے کمیٹی کی سفارشات پر، جو بعد میں " بلاسود بینکاری رپورٹ " کے نام سے شائع ہوئیں، مختلف اعتراضات کیے اور بعض مثبت تجاویز بھی پیش کیں۔ مگر کونسل نے اکثریت کی رپورٹ بعض ترمیموں کے ساتھ منظور کر لی اور شیخ صاحب کا اختلافی " نوٹ "، منظور نہ کیا۔ اور نہ ہی اپنی رپورٹ میں اسے اہمیت دی۔

لہ اس شق میں نظریاتی کونسل نے پاکستانی بینکوں کی غیر ملکی شاخوں، نیز اندرون ملک کی ایسی شاخوں جنہیں غیر ملکی کرنسی جمع کرنے کی اجازت ہے۔ کو سودی کاروبار جاری رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ جو اگرچہ فی الوقت پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں کی ضرورت ہے لیکن بہر حال اس سے ایک چور دروازہ (Black Market) باقی رہ جاتا ہے۔ اور فی الوقت پاکستان کے تمام بینکوں کو غیر ملکی کرنسی میں کھاتے کھولنے کی اجازت ہے! اور غیر ملکی کرنسی کا حصول بھی آسان ہے، اس لیے یہ چور دروازہ تمام اسلامی بینک کاری کو تلپٹ کر سکتا ہے۔

شیخ صاحب نے اپنا یہ اختلافی نوٹ "سود کی متبادل اساس" ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے ۱۹۸۶ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں شیخ صاحب نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر مفصّل اور مدلل بحث کی ہے۔

اسی کتاب میں سود کی متبادل اساس کے طور پر حسب ذیل "صورتوں" پر بحث کی گئی ہے:

۱۔ پہلی مجوزہ اساس: سروس چارج | اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ بینک اپنے کھاتہ داروں سے ان کی امانتوں کی حفاظت کے لیے "مصارف" وصول کرے۔ یہ مصارف بہت معمولی نوعیت کے ہوں گے۔ اسلامک ڈویلپمنٹ بینک اور ایران اس اساس کو قبول کر چکے ہیں[1] مگر مجموعی طور پر یہ اساس قبول کرنا ممکن نہیں ہے[2]

۲۔ دوسری مجوزہ اساس: قرضوں اور بچتوں کا انڈیکس | یعنی سکے کی قیمت جتنی گرے اسی اعتبار سے قرض اور بچتوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ تاہم رپورٹ کے مطابق مختلف تعمیری سمتوں میں منافع ایک جیسا نہیں ہے۔

۳۔ تیسری مجوزہ اساس: کرایہ کاری | تیسری یہ ہے۔ کہ صنعت کاروں کو قرض دینے کے بجائے ایسے کارخانے یا مشینیں خرید کر دے دی جائیں، جن کو وہ اپنی صنعتوں میں استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ یہ مشینیں کرایہ پر دی جائیں گی۔ اور کرایہ کا تعین کرتے ہوئے گھسائی کے علاوہ منافع کا عنصر شامل کر لیا جائے گا۔ شیخ صاحب نے اس اساس کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ اس تجویز میں رپورٹ کے مرتبین نے قرض کی رقم کو مشین کی شکل دے دی ہے۔ جو سود ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ پھر اسلام نے جن اشیاء کے کرائے کو لینا جائز قرار دیا ہے، مشینیں اس میں شامل نہیں ہیں[3]

---

[1] سود کی متبادل اساس، ص ۵۹ - ۶۲

[2] ایضاً : ۶۲

[3] ایضاً : ۶۲ - ۶۸

۴۔ چوتھی مجوزہ اساس: سرمایہ کی نیلامی اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں اس اساس کو لمبے اور درمیانی مدت کے قرضوں کے لیے استعمال کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے، جس کا طریقہ یہ ہوگا۔ کہ تمام بینک ایک مشترک ادارہ بنالیں گے۔ اور سرمایہ کاری کی کوئی سکیم جو صنعت کار لائیں یا بینک خود ایسی اسکیم بنائے، اسے نیلام کر دیں گے۔ نیلامی سے قبل اس کی کم از کم قیمت مقرر کر دی جائے گی، جس میں بینک کے مصارف کے علاوہ اس کے ۸ فیصد منافع بھی شامل ہوں گے۔ اس نیلامی کے نتیجے میں بینک کو وہ قیمت مل جائے گی، جو وہ چاہتا ہے۔ لیکن شیخ صاحب کے بقول یہ بھی "سود" ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے، اور پھر اس سے مہنگائی کم ہونے کا وہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جو اسلامی معیشت میں ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے[1]

۵۔ پانچویں مجوزہ اساس: مرابحہ اسلامی نظریاتی کونسل نے غیر منقولہ سرمایہ کاری، متوسط اور چھوٹے پیمانے پر ایسی فرموں کے لیے جو باقاعدہ حساب نہیں رکھ سکتیں، بڑے زمینداروں کے لیے چھوٹی مدت کے قرضے پر وغیرہ پر "بیع مرابحہ" کی متبادل تجویز پیش کی ہے، جس سے مراد یہ ہے۔ کہ بینک کوئی شئے خرید کر، اپنے ایجنٹ کی معرفت، اسے ایک مناسب گراں قیمت پر، آگے کسان کو فروخت کر دے۔ مثال کے طور پر وہ کھاد کی ایک بوری اپنے ایجنٹ کی معرفت ۵۰ روپے پر خرید کر، آگے ۵۵ روپے پر فروخت کرے۔ جس کی اسلام نے اجازت دی ہے، لیکن کیا بیع مرابحہ۔ اُدھار پر ہو سکتی ہے؟ شیخ صاحب کے خیال میں یہ بھی سود ہی کی ایک شکل ہے اور یہ بھی اصل مسئلے کا حل نہیں ہے[2] تاہم ہمارے خیال میں شیخ صاحب کی یہ رائے محل نظر ہے۔

۶۔ چھٹی مجوزہ اساس: قسطوں میں خریداری اس تجویز کی رُو سے بینک کو یہ اختیار حاصل ہوگا۔ کہ وہ اس کی خرید کردہ ہوئی شئے

---

[1] متبادل اساس ۔ ۶۸ ۔ ۷۰

[2] ایضاً : ۷۱ ۔ ۷۵

کی جب تک پوری قیمت قسطوں میں وصول نہیں کر لیتا۔ اُس وقت وہ اس شئے کا کرایہ بھی وصول کرتا رہے گا۔ یہ تجویز صنعت وحرفت کی پائیدار اشیاء کی حرفی ضروریات اور دیگر مطلوبہ اشیاء کی خریداری وغیرہ کے لیے پیش کی گئی ہے۔ بقول شیخ صاحب یہ تجویز بھی سود ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے[1]

۷۔ ساتویں مجوزہ اساس: نفع و نقصان میں اوسط منافع کی سطح پر شرکت

چونکہ اسلامی نظریاتی کونسل کی مذکورہ رپورٹ کے مرتبین کے ذہن وفکر پر "سود" اور "منفعت" کا تصوّر غالب تھا، اس لیے انہوں نے ہر مسئلے میں ممکنہ نفع کو پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر تجویز کا ماحصل یہ ہے کہ حکومت ایک ایسا ادارہ قائم کرے۔ جو ہر صنعت اور کاروبار پر اوسط شرح منافع تخمینہ مقرر کرے، اور تمام تجارتی بینک اسی تخمینی شرح کے مطابق لوگوں اور صنعت کاروں کو قرض دیں۔ لیکن اربابِ بصیرت پر، یہ بات مخفی نہیں ہے کہ "معین منافع" سود ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ لہٰذا یہ تجویز اسلام کے قانونِ عدل کے مطابق نہیں ہے[2]

۸۔ آٹھویں مجوزہ اساس: متبادل قرض کا تصوّر

یہی تجویز ہے، جو شیخ صاحب کے نزدیک مذکورہ بالا تمام تجویزوں سے بہتر اور مناسب ہے، انہوں نے اس کے حق میں بہت سے دلائل پیش کیے ہیں۔

اس تجویز کا ماحصل یہ ہے۔ کہ ہر قرض کے مقابل مقروض سے ایک متبادل قرض۔ جو قرض کی رقم کی ایک کسر ہو، لے لیا جائے۔ اور کسر کی کمی وقت کے مضاعف سے پوری کی جائے، اس تجویز کے پس منظر میں یہ نکتہ ہے، کہ مثلاً درج ذیل سب قرض برابر قدر و قیمت رکھتے ہیں:

ایک سال کے لیے ۱۰۰۰ روپے
دو سال کے لیے ۵۰۰ روپے
چار سال کے لیے ۲۵۰ روپے

---

[1] متبادل اساس: ۷۵ - ۸۱
[2] ایضاً: ۸۱ - ۳۳

پانچ سال کے لیے ۲۰۰ روپے
دس سال کے لیے ۱۰۰ روپے

گویا اگر ایک قرض خواہ ایک ہزار روپیہ ایک سال کے لیے مانگتا ہو، تو اس کی حیثیت اور ملک کی بینکاری کی پالیسی کے مطابق قرض دیجیے، اس سے متبادل قرض پانچ سال کے لیے دوسو روپیہ لیا جائے، تو قرض کی اساس فراہم ہو گئی۔ کیونکہ جو ایک فریق نے لیا ہے۔ اسی کے برابر دوسرے فریق کو فراہم کر دیا ہے، اس طرح ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہے۔ مقروض ایک سال کے بعد بینک کو ایک ہزار روپیہ واپس لوٹا دے گا۔ اور اس میں کوئی اضافہ شامل نہیں کرے گا، اسی طرح بینک پانچ سال کے بعد مقروض کے دوسو روپیہ اسے یا اس کے وارثوں کو لوٹا دے گا۔ اور وہ کسی قسم کی بڑھوتری ادا نہیں کرے گا۔

شرعی نقطۂ نظر سے اس تجویز پر پہلا اعتراض یہ ہے۔ کہ "قرض" کے "عوض" قرض ہے اور مؤطا امام مالک کی روایت کی رُو سے۔ جس دین کے عوض دین کی بیع سے منع فرمایا گیا ہے۔ ممنوع ہے، تاہم بقول شیخ صاحب زیرِ نظر صورت اس ممانعت کی زد میں اس لیے نہیں آتی۔ کہ اس میں ربوٰ یعنی سود کا معاملہ نہیں ہے۔ اور کتب فقہ کی رُو سے مذکورہ ممانعت ربا کی صورت میں ہے۔ جب قرض خواہ قرض دہندہ سے یہ کہے۔ کہ "مجھے اتنی مہلت اور دے دو اور قرض کی اتنی رقم اور بڑھا لو"[1]

تاہم اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے، تو شیخ صاحب کا جواب مذکورہ" اعتراض" کو ختم نہیں کرتا، اس لیے کہ انہوں نے فقہ کے جس جزئیے کا حوالہ دیا ہے، وہ مختلف ہے اور اگر قرض لینے کے لیے قرض دینے کو شرط ٹھہرا دیا جائے، تو اس صورت میں یہ معاملہ مذکورہ حدیث کے تحت داخل ہوگا۔

۲۔ اس اساس پر دوسرا اعتراض یہ نقل کیا گیا ہے۔ کہ یہ" کل قرض جرّ منفعةً فهو ربا" (قرض سے جو نفع حاصل ہو، وہ ربا (سود) ہے)، کی روشنی میں ربا ہی کی ایک شکل ہے۔ شیخ صاحب

---

[1] متبادل اساس : ۸۳-۸۸

نے اگرچہ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا مودودی کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ لیکن مسئلہ حدیث کے کمزور یا ضعیف ہونے کا نہیں ہے۔ بلکہ "ربوٰ"،"سود" کی تعریف کا ہے اور یہ امر واقعہ ہے۔ کہ اکثر محدثین، مفسرین، فقہاء اور محققین نے اس حدیث کو یا "اثر" کو ربوٰ (سود) کی تعریف کے طور پر قبول کیا ہے، اس لیے شرط قرار دینے کی صورت میں بہر حال یہ ایک "ربوٰ" ہی کی ایک شکل ہے۔ بایں ہمہ ہمارے خیال میں شیخ صاحب کی مذکورہ تجویز، جو اگرچہ شک و شبے سے بالاتر نہیں ہے۔ مگر اسے محدود سطح پر اپنایا اور اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اختتام

اسلامی بینک کاری کے عنوان پر سطور بالا میں اسلامی نظریاتی کونسل اور شیخ محمود احمد صاحب کے حوالے سے بہت سی تجاویز زیر بحث لائی گئی ہیں، ان میں سے ہر ایک تجویز تفصیل طلب ہے اور غور کی متقاضی ہے۔

ہمارے خیال کے مطابق "اسلامی بینک کاری" کے لیے مؤخر الذکر سمیت کسی ایک تجویز کو بھی متبادل اساس کے طور پر قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بجائے، اسلامی بینک کاری بیک وقت ایک سے زائد تجاویز پر عمل کر کے ہی شروع کی جا سکتی ہے۔ اس لیے موجودہ بینکوں کی طرح اگر اسلامی بینک میں بھی مختلف کھاتے کھولے جائیں تو عین مناسب ہوگا۔ ان کھاتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ کرنٹ اکاؤنٹ: یا رواں کھاتہ

یہ کھاتہ ایسے لوگوں کے لیے ہوگا، جو بینک میں لمبی مدت کے لیے اپنی رقم جمع نہیں کرانا چاہتے اور وہ بینک سے اپنی رقوم کی حفاظت کے متقاضی ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بینک "پہلی مجوزہ اساس سروس چارج" کے مطابق معاملہ کرے۔ جیسا کہ اس وقت بھی اگر "کرنٹ اکاؤنٹ" میں کم رقم ہونے کی صورت میں اکاؤنٹ ہولڈر کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن تمام نظام کے لیے اس کو اساس بنانا ممکن نہیں ہے۔

ل اس تجویز پر مزید بحث و تمحیص کی ضرورت ہے۔ اہل علم کو اس تجویز پر بحث کے لیے پیش قدمی کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسی طرح کسی شئے کے حسن و قبح کا پتہ چل سکتا ہے۔

ب ۔ نہ نفع نہ نقصان کی بنیاد پر بچت کھاتے لیکن اگر کچھ لوگ بینک کو بینک چارجز ادا نہ کرنا چاہیں اور وہ اپنی رقم کی حفاظت بھی چاہیں تو ان کے لیے بینک "نفع نہ نقصان" کی بنیاد پر ایسے کھاتے جاری کر سکتا ہے، جس کے حامل (BEARER) کو اپنی رقم کی حفاظت بھی حاصل ہو سکے، اور اسے اپنی رقم کی حفاظت کے لیے مزید رقم بھی ادا نہ کرنا پڑے۔

بینک ایسی رقوم کو "قرض حسنہ" کے فنڈ میں ڈال سکتا ہے، اور اس رقم سے "متبادل قرض" کی اساس پر متبادل قرض حاصل کر سکتا ہے، تاکہ اس رقم کی حفاظت سے بینک کو بھی نقصان نہ ہو۔ اور اس کی حفاظت کے لیے ایک بنیاد بھی مہیا ہو سکے۔

ج ۔ بچت کھاتے (SAVINGS ACCOUNT) اس کے ساتھ بینک بچت کھاتے بھی کھولے گا۔ جس میں ایسے لوگوں کی رقوم رکھی جائیں گی۔ جو اپنی رقم کسی نفع بخش کاروبار میں لگا کر، نفع کمانا چاہتے ہوں۔ اس مقصد کے لیے بینک اسلام کے قانون "مضاربت" اور "قانون شرکۃ" سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ان ذرائع سے بینک کو جو نفع ہو، وہ یکساں شرح کے ساتھ کھاتہ داروں میں تقسیم کر دے۔

مضاربہ اور شرکۃ کی ایک صورت یہ ہے۔ کہ کھاتہ دار کسی ایک دوکان یا فیکٹری میں کلی طور پر بینک کی وساطت سے سرمایہ کاری کرے۔ مقصد یہ ہو، کہ اسے بینک کی طرف سے نگرانی اور آڈٹ کی وہ تمام سہولتیں حاصل ہو جائیں، تو تنہا اسے حاصل ہونا ممکن نہیں ہیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے، کہ چھوٹے چھوٹے کھاتہ داروں کے گروپ قائم کر کے، ان کے مجموعی سرمایہ سے بینک کاروبار کرے اور مدت گزارنے کے بعد، بینک ضروری اخراجات نکال کر، منافع ان کے مابین تقسیم کر دے۔

ایران میں اسلامی بینک کاری کو مکمل طور پر اسلام کے "قانون مضاربت" پر مبنی کیا گیا ہے، جو بینک کاری کے مستقبل کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔

د ۔ بینک کے کاروبار آخر میں اس سوال کا جواب بھی ہمیں تلاش کرنا ہوگا، کہ "اسلامی بینک" متبادل کرنسی اساس پر کام کرے گا۔ اس ضمن میں مختلف اقدامات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے جو تجاویز دی ہیں، انہیں "اساس"

بنایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، اسلامی نظریاتی کونسل نے بڑی صنعتوں کے لیے:

۱۔ کرایہ کاری کی تجویز پیش کی ہے، جس سے مراد یہ ہے، کارخانہ دار، جب ان مشینوں کی "اصل قیمت" اقساط میں ادا نہ کردیں، اس وقت ان سے ایک مقررہ شرح سے اس "مشین" کا کرایہ وصول کیا جائے۔ یہ تجویز اگرچہ پوری طرح اعتراضات سے مبّریٰ نہیں ہے اور شیخ محمود احمد صاحب نے اسے "سود" ہی کی دوسری صوُرت قرار دیا ہے، لیکن سود کو ختم کرنے کے لیے آخر کسی نہ کسی صوُرت کو تو متبادل اساس بنانا ہوگا۔ اور اگر ماہرین فقہ اسلامی "کرایہ کاری" کی تجویز کو بحث و تمحیص کے بعد، جائز قرار دیں، تو ایسی صوُرت میں، اس کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔

رہا یہ کہنا کہ مشینوں کو کرائے پر لینا مختلف فیہ ہے۔ درست نہیں ہے، اس لیے کہ شریعت کے عام قواعد کی رُو سے کسی بھی شئے کو کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ حتّٰی کہ بعض ایسی اشیاء کو بھی کرایہ پر دینا اور لینا جائز ہے۔ جن کی خرید و فروخت نہیں ہے۔ مثلاً کسی "آزاد شخص" کو کچھ مدت کے لیے یا کسی کام کے لیے "اجارہ" پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جسے عرف عام میں ملازمت یا صنعت و حرفت کہا جاتا ہے۔ البتہ چونکہ یہاں بیع اور اجارہ دونوں صوُرتیں یکجا ہو رہی ہیں۔ جو قواعد شرع کی رُو سے ناجائز ہیں۔ اس لیے ماہرین فقہ اسلامی کو یہاں اجتہاد یا غور و خوض کی ضرورت ہوگی۔ اگر وہ اس کو جائز قرار دیں، تو فبہا ورنہ اس تجویز کو رد کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ مرابحہ:

اسی طرح بیع مرابحہ۔ والی تجویز:

بیع مرابحہ کی صوُرت یہ ہے۔ کہ کوئی شئ مثلاً دس روپے پر خرید کر، ۵۵ روپے میں فروخت کر دی جائے اور قیمت اُدھار وصول کی جائے۔ یہ بیع تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ البتہ اس کے لیے ضروری ہے۔ کہ دو میں سے ایک شئ مجلس ہی میں وصول کر لی جائے، اور قیمت کی وصولی کے لیے وقت کی تعیین کر لی جائے، تاکہ یہ "بیع سلم" کے تحت جائز قرار پا سکے۔

کاشتکاروں اور چھوٹے دوکانداروں کے لیے اس اصول پر، معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ بینک اپنے ایجنٹ کی معرفت ان سے معاہدہ کرے اور اسی کی وساطت سے انہیں اشیاء (بصورت اعیان) مہیا کرے اور انھیں اس کی خرید کے لیے رقم نہ دے۔ بیع مرابحہ کی تفصیلات کتب فقہ

میں موجود ہیں ۔ اس مقصد کے لیے ان کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے ۔

۳- اس نفع ونقصان میں حقیقی شرکت : یا مضاربہ

بنکنگ کے نظام کو نفع پر استوار کرنے کے لیے بنک کو اسلام کے قانون شرکت اور قانون مضاربہ سے وسیع بنیادوں پہ کام کرنا ہوگا ۔ اس لیے کہ ان دونوں اساسات میں بنکنگ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے ۔ بشرطیکہ صدق دل اور خلوص نیت سے ایسا کیا جائے ۔

بنک کے موجودہ نظام میں نفع ونقصان میں برائے نام شرکت کا لیبل ضرور لگا دیا گیا ہے ۔ مگر اس سے آگے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے، کہ ان بنیادوں پہ وسیع تر کام کی بنیاد رکھی جائے اور اسلام کے ان قوانین سے بھرپور استفادہ کیا جائے ۔

اوپر ذکر آچکا ہے ۔ کہ ایران میں بنک کاری کے لیے قانون مضاربہ کو اساس قرار دیا گیا ہے اور ایران کے موجودہ بنک اسی اساس پر کام کر رہے ہیں ۔

لہذا اس میدان میں ایران کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ ہمارے برادر ملک "سعودی عرب" اور ہمارے ہمسایہ ملک "چین" میں بھی بنکنگ کا اندرونی نظام غیر سودی بنیادوں پر استوار ہے ۔ اس مقصد کے لیے ۔ ان ممالک کے تجربات بھی ہمارے لیے رہنمائی کا کام دے سکتے ہیں ۔

خلاصہ بحث

اوپر صفحات میں اس عنوان پر جو کچھ لکھا گیا ہے ۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

۱ ۔ بنکنگ کا نظام مکمل طور پر اصلاح طلب ہے اور اس میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے ۔

۲ ۔ "اسلامی بنک کاری" پر نظریاتی اور فکری طور پہ بہت سا مواد تیار ہو چکا ہے، ضرورت اس امر کی ہے ۔ کہ اس کو اپنا کر، عملی تجربے کی شکل دی جائے ۔

۳ ۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے "غیر سودی بینکاری رپورٹ" کے نام سے جو رپورٹ تیار کی ہے، تو اس کی بہت سی باتیں تنقیح طلب ہیں ۔ اگر حکومتِ وقت واقعی اس مسئلے میں مخلص ہے، تو اس مسئلے پہ دوبارہ کوئی کمیشن بٹھائے جو مکمل غور وخوض کے بعد اس مسئلے پر دوبارہ رپورٹ پیش کرے ۔

۴ ۔ وفاقی شرعی عدالت نے موجودہ بنکنگ کے خلاف جو فیصلہ دیا ہے ۔ حکومت اس فیصلے کے مضمرات سے بچنے کے بجائے ۔ اس پر عمل کرنے کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی تیار کرے ، جو اس فیصلے کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرے ۔

۵ ۔" اسلامی بینک کاری " کے موضوع پر اور اس کی جزئیات پر لکھنے کے لیے اہل قلم اور اہل فکر کو دعوت دی جائے ، جو اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار کریں ۔ اسی طرح اس پر منصوبہ بندی کے لیے ، کسی محکمہ کے ذریعے عوام ۔ علماء ، قانون والوں اور ماہرین سے مشاورت بھی طلب کی جا سکتی ہے اس طرح اس موضوع پر کام کرنے کے لیے ایک وسیع بنیاد قائم ہو جائے گی ۔

۶ ۔ اسلامی بینک کاری پر " اجتہاد " کی بھی ضرورت ہے تاکہ نئے مسائل کا ، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل تلاش کیا جا سکے ۔

ماخذ و مصادر

۱۔ قرآن مجید، محمد فواد عبد الباقی: معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، بذیل مادہ ربوٰ؛ کتب تفسیر۔

۲۔ کتب احادیث نبویہ، بالخصوص عشرۂ متداولہ۔ A. J. WESINCK: معجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی، مطبوعہ۔ بیروت۔ بذیل مادہ ربوٰ، صدقہ، ہبہ وغیرہ۔

۳۔ Encyclopaedia Britanica ایڈیشن 1956 مادہ: Banaking

۴۔ Encyclopaedia of Islam مطبوعہ لیڈن مادہ RIBA

۵۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، مقالہ ربوٰ۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔

۶۔ ابن القیم: علام الموقعین، مطبوعہ دمشق،

۷۔ ابن رشد: بدایۃ المجتہد، مصطفیٰ البابی قاہرہ ۱۳۷، ۲: ۱۲۸۔

۸۔ ابن قدامہ: المغنی، دار المنار، قاہرہ ۱۳۶۷۔

۹۔ الکاسانی: بدائع الصنائع، مطبوعہ قاہرہ ۵: ۱۸۰۔ ۱۸۴۔

۱۰۔ انور اقبال قریشی: اسلام اور سود، لاہور ۱۹۷۱ء

۱۱۔ ظفر احمد عثمانی: کشف الدجی امداد الفتاویٰ، ۳: ۱۳۰۔ مطبوعہ کراچی ۱۳۷۳ھ

۱۲۔ مفتی محمد شفیع: محمد تقی عثمانی: مسئلہ سود، کراچی ۱۳۹۰ھ

۱۳۔ ایضاً: اسلام کا نظام تقسیم دولت، کراچی ۱۹۶۸ء

۱۴۔ نجات اللہ صدیقی: غیر سودی بینکاری، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۵۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی: سود، لاہور ۱۹۶۱ء

۱۶۔ ایس اے: غیر سودی بینکاری، کراچی۔
۱۷۔ ڈاکٹر محمد اکرام: غیر سودی بینکاری، لاہور
۱۸۔ ایضاً علم (معاشیات)، (مقالہ)، در اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ۱۴/۱۔
۱۹۔ شیخ محمود احمد: اسلام کا نظریۂ سود اور بینکاری، در ثقافت لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء (۳۰۔۳۳)
۲۰۔ ایضاً: سود کی متبادل اساس۔ لاہور کلب روڈ لاہور ۱۹۸۶ء۔
۲۱۔ جعفر شاہ پھلواری: کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت۔ لاہور ۱۹۵۰ء۔
۲۲۔ سید یعقوب علی شاہ: چند معاشی مسائل اور اسلام۔ لاہور ۱۹۶۷ء
۲۳۔ محمد اسحاق صدیقی: مشین پر زکوٰۃ، در بینات کراچی، ج ۲۰ شمارہ ۴۔
۲۴۔ ڈی ایم قریشی: بلا سود بینکاری، لاہور۔
۲۵۔ مناظر احسن گیلانی: اسلامی معاشیات لاہور۔
۲۶۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی: اسلام کا اقتصادی نظام۔ لاہور
۲۷۔ مظفر حسین ملاٹھوی: بلا سود بینکاری، کراچی۔ ۱۹۸۸ء
۲۸۔ نوائے قانون سود بنکنگ نمبر، شائع کردہ ڈاکٹر عبد المالک عرفانی، اکتوبر ۱۹۹۱ء (ج ۲ شمارہ ۱۰)
۲۹۔ اسلامی نظریاتی کونسل بلا سود بینکاری رپورٹ۔ لاہور۔

اسلامی معیشت اور سود

مولانا عبد الرحمٰن کیلانی

اسلام نے انسان کی معاشی فلاح کے لیے جو نظام پیش کیا ہے وہ اتنا مکمل اور جامع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس کی ہدایات سے خالی نہیں ہے۔ انسان زندگی کی بقاء اور دنیاوی آرام کے لیے کماتا ہے، اس سلسلہ میں معاشرہ کے جو فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں اسلام اس میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ ذیلی تقسیم کو اگر درخور اعتناء نہ سمجھا جائے تو اس وقت پوری دنیا میں تین قسم کے نظام ہائے معیشت رائج ہیں۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام، دوسرا کمیونزم اور تیسرا اسلام کا فلاحی نظام۔ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے۔ وہ اپنا دم توڑ چکا ہے اور خود اس نظام کا داعی روس اس کی ناکامی کو تسلیم کر چکا ہے اور اس میدان میں پٹ چکا ہے۔ لہٰذا یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ رہا سرمایہ دارانہ نظام، تو یہی نظام معیشت سب سے پرانا ہے اور آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں اور اسی طرح پاکستان میں بھی رائج ہے۔ اور تاہنوز تجربات کے دور سے گزر رہا ہے۔ لیکن اسے فلاحی نظام کہنے والے اور اس کے داعی اس سے کوئی فلاح حاصل نہیں کر سکے بلکہ ان کے مسائل میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ وہ ناقابل حل ہیں۔

سرمایہ داری نظام کے دو پہیے ہیں جن پر یہ گھومتا ہے۔ ایک سود، دوسرا ٹیکس۔ ان دو پہیوں کے، یا ان میں سے کسی ایک کے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کے چلنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو پہیوں پر چلتے ہوئے وہ جن لوگوں کو وسائلِ زندگی مہیا کرتا ہے، ان میں سے کچھ لوگ دوسروں کا استحصال تو نہیں کر رہے؟ اگر ایک طبقہ استحصال کر رہا ہو اور خوشحال بنتا جا رہا ہو اور دوسرے طبقہ کا استحصال ہو رہا ہو اور وہ کمزور سے کمزور تر ہو رہا ہو تو ایسا نظام فلاحی نہیں کہلا سکتا بلکہ بلاشبہ استحصالی نظام ہے۔

سود کی زد ہمیشہ کمزور طبقہ پر پڑتی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں۔ رہا ٹیکس تو اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امراء سے وصول کیا جاتا ہے لیکن اگر ٹیکس کے پورے نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ٹیکسوں کا بار بھی بالآخر اور زیادہ تر غریب طبقہ پر ہی پڑتا ہے۔ ٹیکس اس وقت ہمارے زیر بحث نہیں۔ البتہ اس کی حقیقت میں کسی دوسرے مضمون میں پوری شرح و بسط سے پیش کر چکا ہوں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں سود، جو اس نظام کا پہلا پہیہ ہے، ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی سود معاشرے کے اندر بدترین خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ سُود لینے والا، سُود دینے والے پر کبھی رحم نہیں کھاتا، وہ اس کی مالی پوزیشن کو کبھی مدِ نظر نہیں رکھتا وہ اس کی استطاعت کو کبھی نہیں دیکھتا اگر اسے کچھ غرض ہوتی ہے تو صرف یہ کہ اس نے جو روپیہ سُود پر قرض دیا ہے اس پر اُسے زیادہ سے زیادہ نفع وصول ہو۔ کوئی دیوالیہ ہو یا تباہ ہو، کسی کی عزت نیلام ہو، کوئی کوڑی کوڑی کا محتاج ہو، اس کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ اس کا دل پتھر کی مانند سخت ہوتا ہے۔ وہ اصل زر میں تو تاخیر برداشت کرسکتا ہے مگر سُود پر نہیں کرسکتا۔ وُہ ایک مدت ختم ہونے کے بعد دوسری مدت پر اصل زر جمع سُود پر پھر سُود وصول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتا ہے۔

یہ وہ استحصالی نظام ہے جس میں امیر تو امیر تر ہوتا جاتا ہے اور غریب، غریب تر ایک طبقے کے پاس دولت کے انبار جمع ہو جاتے ہیں اور دوسرا محتاج تر ہوتا جاتا ہے۔ ایک طبقہ محنت کئے بغیر دولت سمیٹتا جاتا ہے، دوسرا سخت محنت کے باوجود اپنی محتاجی سے مکمل نہیں سکتا۔ سرمایہ دار کو اس کے سرمایہ پر کبھی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کا سرمایہ بڑھتا رہے گا اور اس کے نقصان کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ سُودی قرضے لینے والے چاہے افراد ہوں یا حکومت دونوں استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سود پر قرض دینے والے ملک امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں اور سود پر قرض لینے والے غریب سے غریب تر۔ آج کے دَور میں سب سے بڑا سرمایہ دار اور سُود خور اور نظام سرمایہ داری کا علمبردار ملک امریکہ ہے۔ جس نے بے شمار ممالک کو سُود پر قرض دے رکھا ہے۔ جن میں سے ایک پاکستان بھی ہے۔

سُود کی حرمت میں تدریج

جس دَور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اس دور میں عرب اور اس کے گرد کے ممالک میں سُود ایسے ہی رائج تھا جیسے موجودہ زمانہ میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ شراب اور سُود عرلوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور ان دونوں معاشرتی بُرائیوں کا بتدریج استیصال کیا گیا۔ پہلے ذہنی طور پر مسلمانوں کو چھوڑنے پر آمادہ کیا گیا۔ اور بالآخر ان کی حرمت کے احکام نازل ہوئے۔ سود سے متعلق جو پہلی آیت نازل ہوئی، وہ درج ذیل ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰/۳۱)

"اور جو رقوم تم سُود پر دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال و دولت سے بڑھیں تو یہ اللہ کے اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتیں۔ اور جو زکوٰۃ (وصدقات وغیرہ) اللہ کی خوشنودی کے لیے دیتے ہو۔ تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

یہ سورۂ روم کی آیت ہے جو مکی دور میں نازل ہوئی تھی جس وقت اسلام اور مسلمانوں پر مصائب و افلاس کے پہاڑ ٹوٹے پڑے تھے اور اسلامی ریاست کے قیام کا تصوّر بھی معدوم تھا، سُود کا رواج عام تھا اور زکوٰۃ ابھی تک فرض نہیں[1] ہوئی تھی۔

اس آیت میں سُود اور زکوٰۃ کا فرق اور ان کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ سُود پہ دی ہوئی رقم جو بظاہر تمہیں بڑھتی نظر آتی ہے وہ بالآخر معاشرہ کی تباہی پر منتج ہوگی جیسے اللہ خوب جانتا ہے اور جو تم صدقات زکوٰۃ یا قرض حسنہ اللہ کی خوشنودی کی خاطر ایثار کے جذبہ سے دیتے ہو یہی چیز بالآخر بار آور ثابت ہوگی۔ گویا اس آیت سے زمین تیار کرنا، سُود سے نفرت دلانا اور صدقات وخیرات کی دلانا مقصود تھا۔

اس کے بعد سورۂ آل عمران کی مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ یہ مدنی دَور کا آغاز ہے جبکہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آچکا تھا۔

---

[1] زکوٰۃ مدنی دَور میں ۳ھ میں فرض ہوئی۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳/۱۳۰)

"اے ایمان والو۔ سُود مت کھاؤ جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

اس آیت میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ سُود گناہ سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس سے بچو اور اگر ایسا نہ کرو گے تو شاید تمہاری نجات ہی نہ ہو۔

اس دور میں مدینہ اور خیبر کے یہود بکثرت سُودی کاروبار کرتے تھے۔ اور مسلمانوں میں سے سُود پر قرض لینے والے تو بہت تھے لیکن سود پر دینے والے کم ہی تھے۔ گویا مسلمانوں میں سُودی لین دین کا سلسلہ جاری تھا۔ انہیں آئندہ محتاط رہنے کا حکم دیا گیا۔ تاہم سابقہ سُودی معاملات معاہدات ابھی باقی تھے۔

مدینہ میں یہود بالخصوص ان کے قبیلہ بنو قینقاع کا ذریعہ معاش یہی سُود تھا اور یہودیوں میں سے یہی لوگ زیادہ مالدار تھے۔ یہود کی حرام خوری کا ذکر قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سود ان پر بھی حرام تھا۔ تاہم ان میں بھی ماہرینِ معاشیات اور دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو معاشرہ سے سود کے اخراج کو ناقابل عمل قرار دیتا تھا۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ سرمایہ کے عامل پیداوار ہونے کی حیثیت سے سُود اور بیع میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲/۲۷۵)

"جو لوگ سُود کھاتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے کوئی آسیب زدہ ہو اور مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یہ اس لیے جو وہ یہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو سُود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص تک اللہ تعالیٰ کی نصیحت

پہنچ گئی اور سُود سے باز آگیا) تو جو پہلے ہوچکا وہ اس کا۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے ذمہ ہے۔ اور جو شخص پھر بھی سُود دے تو یہی لوگ دوزخی ہیں جو ہم اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جو لوگ سود کو عقلی دلائل سے معاشرہ کے لیے ضروری ثابت کرنا چاہتے ہیں اور سود اور بیع کو ایک مقام پر لے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مثال اس پاگل سے دی ہے جسے سُود کے لالچ نے عقل و فکر اور اخلاقِ فاضلہ سے عاری بنا دیا ہو۔ ایسے لوگ اگر کوئی دلیل سوچ سکتے ہیں تو محض اپنے فائدے کی مگر معاشرہ پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان سے وہ بالکل اندھے ہو جاتے ہیں۔ جو شخص پاگلوں کی سی باتیں کرتا۔ عرب اس کے متعلق کہتے کہ اسے کوئی شیطان یا جن (یا آسیب) چھو گیا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے لیے یہی محاورہ استعمال کیا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس سے پہلے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔ صدقات، خیرات مستحقین کے حقوق اور قرضِ حسنہ کے متعلق احکام بہت پہلے نازل ہونا شروع ہو چکے تھے، بالفاظ دیگر شخصی حاجات کے متبادل راستہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اس آیت کے سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجارتی قرضوں کے سُود سے متعلق ہے جسے آج کی زبان میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔

بعد ازاں آخری مرحلہ کا وقت بھی آگیا اور سُود کا کلیۃً حرام قرار دیا گیا اور اس لعنت ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا پورا طریق کار سمجھا دیا گیا: ارشاد باری ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲ / ۲۷۸ تا ۲۸۰)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور سُود کے بقایا جات چھوڑ دو اگر تم فی الواقعہ مومن ہو۔ اور اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم باز آجاؤ تو تم اپنے راس المال کے حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم ہو۔ اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی گنجائش تک مہلت دو۔ اور اگر معاف ہی کر دو

تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے ۔ اگر تم سمجھو!

ان آیات میں سُود کے مکمل خاتمہ کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کا حل بتایا گیا ہے جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے :

ا ۔ سُود کے بقایاجات کو فوری طور پر چھوڑنا ہوگا ۔ یہ مقروض سے ہمدردی ضرور ہے، لیکن قرض خواہ کے ساتھ ظلم نہیں ہے ۔ اس کے پاس یہ رقم ضرورت سے زائد تھی ۔ اگر اس فاضل رقم کو اس کے کسی ضرورتمند بھائی نے کچھ عرصہ کے لیے استعمال کرلیا تو چنداں مضائقہ نہیں لہٰذا اسے اصل رقم سے زائد (سُود) لینے کی ہوس ترک کر دینا چاہیئے ۔

۲ ۔ قرض خواہ کو اصل رقم واپس ملنا چاہیے ۔ عدل و انصاف کا یہی تقاضا ہے ۔ مقروض کا یہ کوئی حق نہیں کہ اصل رقم ہی دبا بیٹھے ۔

۳ ۔ اگر مقروض اصل رقم بھی ادا کرنے کے قابل نہیں تو اسے تنگ اور مجبور نہ کیا جائے ۔ بلکہ اسے اس کی گنجائش تک مہلت دی جائے ۔

۴ ۔ اور اگر تنگ دست مقروض کو یہ قرض معاف کر دیا جائے تو یہ بات تمہارے لیے اجر و ثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ آپس میں جذبۂ اخوت اور ہمدردی بڑھے گا ۔ سُود خوار اور مقروض کے درمیان نفرت کی جو دیوار حائل ہوتی ہے وہ گر جائے گی اور اس کی بھلائی میں تمہاری اپنی بھلائی بھی مضمر ہے ۔

یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چار ماہ قبل نازل ہوئیں ۔ گویا سُود کی قطعی حرمت آپ کی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی اسی بات سے عرب میں سُود کی ہمہ گیریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

انہی دنوں آپ حج کے لیے تشریف لے گئے جو حجۃ الوداع کے نام سے موسوم ہے اور اس دوران آپ نے جو نہایت اہم امور پر مشتمل اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا اسے خطبہ الوداع کہا جاتا ہے ۔ یہ خطبہ تمام دنیا کے لیے ایک بنیادی منشور کی حیثیت رکھتا ہے ۔ جسے آپنے تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے مسلمانوں کے عظیم اجتماع میں ارشاد فرمایا اور جس کی تشہیر کے لیے تمام مسلمانوں کو تاکید کی گئی ۔ کیونکہ یہ خطبہ ایک حیثیت سے آپ کا وصیت نامہ تھا ۔ اس کی ایک شق یہ بھی تھی ۔

وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ ، وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَا عَبَّاسِ ابْنِ عبد الْمُطَّلِبِ فَاِنَّهٗ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ [1]

"اور دورِ جاہلیت کے تمام سُود موقوف کئے جاتے ہیں۔ اور سب سے پہلے میں (اپنے چچا) عباس بن مطلب کے جملہ سودی بقایا جات موقوف کرتا ہوں۔

آپ نے یہ اعلان ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے فرمایا۔ لہٰذا یہ ایک آرڈیننس کی حیثیت رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا آغاز آپؐ نے اپنے گھر سے کیا۔ آپ کے چچا عباس بن عبد المطلب وسیع پیمانہ پر شخصی اور تجارتی قرضے دیا کرتے تھے۔ اس آرڈیننس کے تحت ان کے علاوہ باقی لوگوں کی سُودی رقمیں بھی از خود منسوخ قرار پاگئیں۔

سُود کے متعلق ارشاداتِ نبویؐ

قرآن کریم کی ان آیات کے نزول کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کی ذہنی تربیت فرما رہے تھے۔ سُود سے شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

عن جابر قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اٰکِلَ الرّبوا و موکلہ وکاتبہٖ وَشَاھِدَیْہِ وقال ھم فیہ سواء [2]

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُود لینے والے پر، تحریر کرنے پر اور دونوں گواہوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

گویا شراب کی طرح سُود بھی تمام متعلقہ افراد کو اپنی حرمت کی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ان سب کو برابر کا مجرم قرار دیتا ہے۔ اس حدیث کی رو سے سُودی کاروبار کرنیوالے اداروں کے عملہ کی کمائی حرام قرار پاتی ہے۔ جن میں سے کچھ افراد کی حیثیت تو کاتب یا لکھنے والے کی ہوتی ہے اور باقی افراد کی حیثیت گواہوں کی ہوتی ہے۔ یہ ادارے خواہ بنک ہوں۔ قومی بچت کے مراکز ہوں

---

[1] مسلم کتاب الحج ۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

[2] مسلم کتاب المساقات والمزارعت ۔ باب الرّبا ۔

بیمہ کمپنیاں ہوں، سرکاری ہوں، نیم سرکاری ہوں یا نجی ہوں اور خواہ لوگ انفرادی طور پر سودی لین دین کرتے ہوں ان سب کا یہی حکم ہے۔

اب اس جرم کا اندازہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنیے۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دِرْهَمُ رِبًا يَاكُلُهُ الرَّجلُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَّ ثَلٰثِيْنَ زَنْيَةً [1]

"جو شخص سود کا ایک درہم کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ درہم سود کا ہے تو اس کا گناہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔"

اور ایک دفعہ یوں فرمایا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا، اَيْسَرُهَا اَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ [2]

"سود کے ستر حصے ہیں۔ ان میں سب سے کمتر حصہ ایسا ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔"

حرمتِ سود میں شدت کی وجوہ

یہاں ایک سوال از خود ذہن میں ابھرتا ہے۔ جو یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے کئی گناہ ایسے ہیں جو سود سے بُرے ہیں۔ مثلاً شرک، قتلِ ناحق، زنا، چوری، ڈاکہ وغیرہ۔ شرک ایسا گناہ ہے جو اکبر الکبائر ہے۔ جس کے متعلق قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ صراحت آئی ہے کہ مشرک کی کبھی نجات نہ ہوگی باقی جرائم ایسے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدود و قصاص کے احکام نازل فرمائے ہیں لیکن اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی تہدید اللہ تعالیٰ نے صرف سود کے متعلق سنائی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسند احمد۔ دارمی بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا فصل ثالث۔

[2] ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا۔ فصل ثالث

نے بھی سُود کے متعلق ایسے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں جو اور کسی گناہ کے متعلق استعمال نہیں فرمائے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سود اسلامی تعلیمات کا نقیض اور اس سے براہِ راست متصادم ہے اور اس کا حملہ بالخصوص اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام پر ہوتا ہے۔

اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام سے تصادم

اسلام بھی ایک دوسرے کا بھائی بن کر رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ہمیں آپس میں مروت، ہمدردی، ایک دوسرے پر رحم اور ایک دوسرے پر ایثار کا سبق سکھلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اخوت و ہمدردی کا سبق دیا۔ اور ایک دوسرے کے جانی دشمن معاشرے کی وحی الٰہی کے تحت اس طرح تربیت کی کہ وہ فی الواقعہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی اور مونس و غمخوار بن گئے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم احسان شمار کرتے ہوئے اس کا یوں تذکرہ فرمایا کہ:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ (۳/۱۰۳)

"اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔"

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥

"اور (اللہ تعالیٰ نے ہی) ان (صحابہ کرامؓ) کے درمیان الفت پیدا کر دی۔ اگر آپ (اس طریق کار کے علاوہ) دنیا بھر کی دولت بھی خرچ کرتے تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں الفت پیدا کی۔ بلاشبہ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

اور یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھر کی محنت و تربیت کا ماحصل تھا۔ جبکہ سُود انسان میں ان صفت سے بالکل متضاد صفات یعنی بخل، حرص، شقاوت قلبی اور لالچ پیدا کر دیتا ہے جو اسلامی روح کی عین ضد ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کے معاشی نظام کا تمام تر ماحصل یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے اور اس گردش کا بہاؤ امیر سے غریب کی طرف ہو۔ اسلام کے نظام زکوٰۃ و صدقات کو اسی لیے فرض قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کا قانونِ میراث اور حقوق باہمی بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں جبکہ سودی معاشرہ میں دولت کا بہاؤ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی سُود اسلام کے پورے معاشی نظام کی عین ضد ہے۔

غور فرمائیے کہ اس سُود کی زد کہاں تک پہنچ رہی ہے۔ اگر ایک اسلامی معاشرہ سے اس کے معاشرتی اور معاشی نظام کو تبدیل کر دیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ آیا ایسے معاشرہ کو اسلامی کہنا بھی درست ہے یا نہیں؟

سود کے مفاسد

اب ہم معاشی نقطۂ نظر سے سود کے ان نقصانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو ماہرین معاشیات نے گنوائے ہیں:

قرضہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قرضہ جو مفلس اور نادار لوگ اپنی بھوک، علالت اور حوادث کے وقت اپنی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے لیتے ہیں۔ ایسے قرضہ کو معاشیات کی اصطلاح میں 'قرض صرف' کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو تاجر یا صنعت کار لوگ اپنا کاروبار چلانے کے لیے بنکوں وغیرہ سے لیتے ہیں۔ اسے 'قرض پیدآور' کہتے ہیں۔

مہاجنی قرضہ | قرضِ صرف یا شخصی قرضہ انسان کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اور ایسے لوگ چونکہ نادار ہوتے ہیں۔ لہٰذا بنک انہیں قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتیں عموماً ساہوکاروں کو لائسنس عطا کرتی ہیں اور ان کی شرح سُود بھی مقرر کر دی جاتی ہے اور یہ شرح سود بنک کی شرح سُود سے عموماً دو تین گنا زیادہ

ہوتی ہے۔ مگر ساہوکار اس مقررہ شرح پر بھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ مقروض کی شدّتِ احتیاج سے فائدہ اٹھا کر من مانی شرح وصول کرتا ہے پھر یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بہت سے غیر لائسنس یافتہ مہاجن بھی چوری چھپے یہ دھندا کرتے اور گراں تر شرح سود وصول کرتے ہیں۔ پس ماندہ ممالک کا تو کیا ذکر بڑے بڑے متمدن ممالک میں بھی یہ کاروبار وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ ہم یہاں سر سیکنزی چارس سابق معتمد امور داخلہ انگلینڈ کی اس رپورٹ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو انہوں نے سُود کی خرابیوں کے متعلق ۱۹۲۵ء میں لندن کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے پڑھی اور ان شرائط پر روشنی ڈالی جن پر عموماً مزدور طبقہ کو قرض ملتا تھا:

"اصولاً دو ضمانتیں دینا ہوتی ہیں۔ جب ایک تحریری ضمانت ۵ پونڈ کے لیے لکھی جاتی تو ۴½ پونڈ اس شرط پر دیے جاتے کہ اگر کوئی قسط رہ گئی تو جملہ قرضہ ½ پنس فی شلنگ فی ہفتہ کی شرح سے واجب الادا ہو جائے گا۔ اس طرح میرے خیال میں ۲۵۰ فیصد سے زائد سود ادا کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ساہوکاروں کو جو سود ادا کیا جاتا ہے وہ اکثر ۴۰۰ ٪ فی صد سے بھی بڑھ جاتا ہے۔

عام طور پر ایک پنس فی شلنگ فی ہفتہ یعنی ۴۳۳ ٪ سالانہ کی شرح سے سود وصول کیا جاتا یہودیوں کی ایک سُو ساہوکارہ کرنے والی عورتیں اپنے گاہکوں سے اسی شرح سے وصول کرتی ہیں اور ایسے واقعات بھی منظرِ عام پر آئے ہیں کہ دو پنس یہاں تک کہ تین پنس فی شلنگ فی ہفتہ سُود کی شکل میں وصول کئے گئے ہیں۔

وہ ساہوکار جنہوں نے اپنے آپ کو غریب طبقہ سے مخصوص کر لیا تھا ایک، دو اور تین پنس فی شلنگ فی ہفتہ یعنی الترتیب ۴۹۳، ۸۶۶ اور ۱۳۰۰ ٪ سالانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔

منتخبہ کمیٹی کی رپورٹ میں متعدد ایسے قرضداروں کی رپورٹیں پیش کی گئی ہیں جو ہمیشہ کیلیے ساہوکاروں کے پنجہ میں پھنس چکے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مثالوں کو سچ تصوّر کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔"

مہاجنی قرضہ کے مہلک اثرات سے تو عموماً ہر شخص واقف ہے اور اس کی تباہیاں اتنی اظہر من الشمس ہیں کہ خود حامیانِ سُود بھی مقدمہ کی اس شق کی حمایت سے دستبردار ہو گئے ہیں اور اپنی ساری قوت تجارتی سُود کی حمایت[1] پر صرف کر رہے ہیں۔

---

[1] جس کا ہم آگے چل کر تفصیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

قرض پیدآور کے مہلک اثرات

شخصی قرضوں میں تو ایک متعلقہ فرد ہی سُود کے ناخوشگوار اثرات سے متاثر ہوتا ہے جبکہ تجارتی قرضے کی صُورت میں پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ سُود لینے والا (بنک) اور سود دینے والا (تاجر اور صنعت کار وغیرہ) دونوں اپنا اپنا مفاد تو محفوظ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے تباہ کُن اثرات معاشرہ پر چھوڑ جاتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ گرانی یہ بات تو واضح ہے کہ ایک تاجر یا صنعت کار جو ۱۴٪ شرح سُود پر سرمایہ حاصل کرے گا قیمت فروخت طے کرنے سے بیشتر اسے یہ سوچنا ہوگا کہ اسے سُود کی رقم بھی ادا کرنا ہے خود بھی نفع کمانا ہے، پھر اتفاقی حوادث کی بنا پر نقصان کا احتمال بھی موجود ہے تو لامحالہ وہ گراں فروشی کی طرف مائل ہوگا۔ یا ایسے ہتھکنڈے استعمال کرے گا جن کی بنا پر وہ زیادہ سے زیادہ نفع پیدا کر سکے۔ وہ جو کچھ بھی کرے گا اس کا نتیجہ غریب عوام کو بھگتنا ہوگا۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صنعت کار بنک سے ۱۴٪ شرح پر قرضہ لے کر ایک ٹیکسٹائل مل لگاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ۱۴٪ کے زائد اخراجات بھی تیار شدہ مال کی لاگت میں شمار ہوں گے۔ پھر یہ صنعت کار کسی تاجر کے ہاتھ تھوک مال بیچتا ہے۔ تاجر نے خود بھی بنک سے اسی شرح سُود پر قرضہ لیا ہوا ہے۔ وہ بھی یہ ۱۴٪ زائد رقم قیمت خرید میں شامل کر کے منافع کی گنجائش رکھ کر مال آگے چلا دے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جس زمیندار نے کپاس منڈی میں فروخت کی تھی، اس نے یا منڈی کے دکاندار نے بھی بنک سے قرضہ لیا ہو تو یہ سب اخراجات اس تیار شدہ کپڑے پر پڑتے جائیں گے اور سُود کا یہ سارا بار بالواسطہ خریدار پر پڑ جائے گا جس نے اپنی شلوار یا قمیص کے لیے کپڑا خریدا ہے۔ دیکھئے اس پورے سلسلہ میں نہ تو بنک نقصان میں رہا، نہ زمیندار، نہ صنعت کار اور نہ تاجر ان میں سے کسی پر بھی سود کا کوئی بوجھ نہ رہا۔ ان سب نے اپنے اپنے فائدہ کی راہ سوچ لی ہے۔ مال جتنا بھی مہنگا تیار یا دستیاب ہوگا وہ اپنا منافع اس پر لگا کر اسے آگے چلا دے گا اور بالآخر یہ سارا بار صارفین پر پڑے گا۔ گویا اس تمام زر سود کی رقم بالواسطہ عوام کی جیب سے نکلی اور بنک میں چلی گئی بقول علامہ اقبال ؎

سُود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

آج کل جو کمر توڑ گرانی کا چکر چل رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی سُود ہے۔

۲۔ تجارتی چکر

کسی بھی ملک کی معاشی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کاروبار میں اکثر اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ کبھی تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کاروبار خوب ترقی پر ہے، اشیاء کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں اور روزگار بھی عام ہے۔ ایسے دَور کو گرم بازاری یا خوشحالی کا دور کہا جاتا ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں گر رہی ہیں۔ بازار مندا پڑ جاتا ہے اور بے روزگاری عام ہو جاتی ہے۔ ایسے دور کو کساد بازاری یا سرد بازاری یا تجارتی بحران کہا جاتا ہے۔ کاروبار میں یہ شکل اکثر رونما ہوتی رہتی ہے جسے معاشیات کی اصطلاح میں تجارتی چکر کہا جاتا ہے۔ اس تجارتی چکر کے کئی اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی سُود ہے۔

جب گرم بازاری کا آغاز ہو تو سرمایہ کی طلب بڑھنے لگتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں شرح سُود بڑھ جاتی ہے۔ مگر سُود خوار یا بنک جلد ہی اصل رقم اور سُود کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیتا ہے جبکہ مقروض ادائیگی کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اور اگر ادا کرے تو اس کا کاروبار گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ بنک مزید سرمایہ کی فراہمی میں کمی کر دیتا ہے تو کساد بازاری شروع ہو جاتی ہے جسے طویل بنانے میں زیادتی شرح سُود اور طویل المیعاد سودی معاہدات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

بعض دفعہ زیادہ شرح سُود کا مسئلہ بذاتِ خود کساد بازاری کا موجب بن جاتا ہے۔ سرمایہ محض شرح سُود کے بڑھنے کی انتظار میں رُکا رہتا ہے۔ حالانکہ اسکے استعمال کے وسائل موجود ہوتے ہیں اور روزگار کے طالب بھی کثرت سے مارے مارے پھرتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ سرمایہ دار جتنی شرح سُود لینا چاہتا ہے اتنی اسے مل نہیں رہی ہوتی۔

۳۔ کاروباری مزاحمت

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ جب کسی کاروبار یا صنعت میں لگایا ہوا سرمایہ یا اس کا کچھ حصّہ نکال لیا جائے تو بسا اوقات کاروبار کو سخت نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن سرمایہ دار کو اپنا ہی مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اس تضاد کی وجہ سے ملکی معیشت صحیح طور پر ترقی نہیں کر سکتی۔ اسلام نے اس الجھن کا حل نہایت احسن طریق پر کر دیا ہے وہ سُود اور شرح سُود سب باتوں کو حرام اور لغو قرار دیتا ہے اور اس کے بجائے مضاربت کی راہ دکھلا کر سرمایہ اور محنت کو ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اور ان دونوں کے مفادات کو ایک

دوسرے سے وابستہ کر دیتا ہے جس کا ملکی معیشت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔
موجودہ بنک جو کارخانہ داروں اور تاجروں کو قرض دیتے ہیں تو ابتدائی عرصے میں ہی، جبکہ روپے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور منافع یا تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہو تو بہت کم ہوتا ہے، سُود کی ادائیگی پر صرف اصرار ہی نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر وصول بھی کرتے ہیں۔ یہ ادائیگی قرض دینے والوں پر سخت گراں گزرتی ہے اور کاروبار بھی بڑی طرح متاثر ہوتا ہے۔

۴۔ قومی مفاد کی عدم توجہ اور اخلاقی بگاڑ

بہت سے کاروبار ایسے ہوتے ہیں جو معاشرہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہوتے ہیں لیکن ان سے مقابلتاً کم شرح سُود ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً آب رسانی کا منصوبہ، جس سے ملک میں کافی غلّہ پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے اور معاشرہ کی خوشحالی میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دار کو ایک شراب بنانے والے یا بیچنے والے سے زیادہ شرح سود ملنے کی توقع ہوتی ہے تو سرمایہ دار یا بنک عموماً دوسری قسم میں سرمایہ لگانے کو ترجیح دے گا۔ اسے نہ اس سے غرض ہے کہ ملک خوشحال ہو اور نہ اس سے کہ شراب کے کاروبار میں سرمایہ لگانے سے معاشرہ میں کتنا بگاڑ پیدا ہوگا۔ اسے اگر غرض ہوتی ہے تو صرف اس سے کہ سود کہاں سے زیادہ مل سکتا ہے۔

۵۔ طبقاتی تقسیم اور باہمی منافرت

بنک لوگوں کی دولت پر بڑے شریفانہ انداز میں ڈاکہ ڈالتے ہیں اور یہ کام بنک اور تاجر یا صنعت کار کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ کیونکہ فریقین اپنا اپنا فائدہ سوچ لیتے ہیں۔ گویا یہ بنکاری نظام جو بظاہر بڑا معصوم سا نظر آتا ہے، لوگوں کے استحصال کا بڑا مہلک ذریعہ ثابت ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں امیر طبقہ تو امیر تر اور غریب پہلے سے بھی غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح طبقاتی تقسیم بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اور جب یہ تقسیم بڑھتی ہے تو محض دولت کی ناہموار تقسیم میں ہی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ امیر و غریب کے درمیان نفرت کا جذبہ بھی بڑھتا ہے۔ غریب جب یہ دیکھتا ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش کے باوجود وہ اپنے اہل و عیال کی بنیادی ضرورتوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، دوسری طرف امیر لوگ شاندار کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے ہیں اور ان کے سامنے بیش قیمت کاروں میں گھومتے نظر آتے ہیں تو ان کے دل میں امیروں کے خلاف عناد پیدا ہو جاتا ہے۔ آجر اور اجیر کے درمیان اخوت اور

ہمدردی کی فضا ختم ہو جانے کے باعث ملک کی معیشت پہ گہرا اور دُوررس اثر پڑتا ہے۔ اس صُورتِ حال کی بیشتر ذمہ داری بالواسطہ سودی بنکاری نظام پہ پڑتی ہے۔

سرمایہ دار افراد کی تعداد معاشرہ میں ہمیشہ قلیل ہوتی ہے۔ جب یہ لوگ اپنا روپیہ سُود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو وہ غریبوں کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر ان کی دولت سرمایہ دار کی جیب میں پہنچا دیتے ہیں۔ کچھ مدّت بعد یہ تماشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور چند گھرانوں میں دولت کے انبار لگ گئے ہیں۔ سرمایہ دار کے پاس اگر دولت کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت جسمانی قوت رکھتی ہے۔ تنگ آکر سُود خوروں کی مالی قوت پہ جسمانی قوت کا حملہ ہو جاتا ہے۔ امن و امان غارت ہو جاتا ہے۔ غربا بھوکے غضبناک بھیڑیے کی طرح سرمایہ داروں کو پھاڑ دیتے ہیں۔ سلطنتیں تک تباہ ہو جاتی ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سُود اتنی ہی نقصان دہ چیز ہے تو مغربی ممالک میں سُودی معیشتیں کیسے کامیابی سے چل رہی ہیں؟ وہاں یہ طبقاتی اور منافرت جنگ کیوں پیدا نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نقصانات تو بہر حال سود کا لازمی نتیجہ ہیں اور سود چونکہ صرف سرمایہ داری نظام میں نپپ سکتا ہے لہٰذا ردِّعمل کے طور پر اشتراکی نظام وجود میں آیا جس میں سود کو یکسر ختم کیا گیا اور سرمایہ دار اور جاگیر دار پر ضبطی جائداد کے علاوہ ایسے مظالم توڑے گئے۔ جن کے دہرانے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

لیکن اشتراکی نظام بھی چونکہ دوسری انتہا تھی اور انتقامی طور پر وجود میں آیا اور راہِ اعتدال سے ہٹا ہوا تھا۔ لہٰذا ابتداء میں اس کی ناکامی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے جنہیں جبر و تشدد سے دبانے کی کوششیں کی گئیں مگر تابکے یہ بے خدا، غیر فطری اور محض ڈنڈے کا نظام چل سکتا تھا۔ پون صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ اس نظام کو پوری طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا اور اب یہ نظام اپنی موت آپ مرچکا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتیں صرف سرمایہ دار کے حقوق کا تحفظ کرتی ہیں اور اسی غرض سے بنکوں کی سرپرستی بھی کرتی ہیں۔ حکومت، بنک اور سرمایہ دار سب کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ سود کا سلسلہ قائم و دائم رہے غریب لوگوں کے انتقامانہ جذبات نوان کی اشک شوئی کے لیے اور اشتراکیت کے

مظالم سے عبرت حاصل کرتے ہوئے ان حکومتوں نے چند اقدامات کیئے ہیں۔ جو اسلامی نظام معیشت سے ہی مستعار لیے گئے ہیں تاکہ اس نظام کے مفاسد کو کسی حد تک کم کیا جا سکے۔ وہ اقدامات درج ذیل ہیں:

۱۔ خیرات فنڈ (BENEVOLENT FUND) جو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے تقریباً ایک فیصد کے حساب سے وضع کیا جاتا اور اسے غریبوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۲۔ طبی سہولت (SOCIAL SECURITY MEASURE) جس کی رُو سے کارخانہ داروں پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مزدور ملازموں کو طبی سہولت مفت فراہم کریں۔ ہمارے پاکستان میں بھی ایسی فری ڈسپنسریاں موجود ہیں۔ جو فیکٹری ایریا کے چند مالکان مل کر کسی درمیانی جگہ قائم کر لیتے ہیں۔

۳۔ بیروزگاری الاؤنس (UNEMPLOYMENT ALLOWNCE) یعنی وہ الاؤنس جو روزگار مہیا ہونے تک گزراوقات کے لیے حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

ان اقدامات کے باوجود غریب طبقہ سود کی چکی میں پستا رہتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

بنک انٹرسٹ اور کمرشل انٹرسٹ

سُود کی حرمت، اس حُرمت کی شدت اور اس کے نقصانات کے علی الرغم مسلمانوں میں ہی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بنک کے سُود کو صرف جائز ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس کے لیے کئی طرح کے دلائل بھی پیش کر رہا ہے اور اس میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے، اس لیے ہم ان حضرات کے دلائل کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہتے ہیں:

ربا اور سُود میں فرق

کہا یہ جاتا ہے کہ "ربا" ایسے سود کا نام ہے جو کوئی مقروض اپنی بھوک یا احتیاج دور کرنے کی غرض سے کسی مہاجن یا ساہوکار سے قرض لیتا ہے اور سود خوار اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بھاری شرح سُود پر معاملہ کر کے اس پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے ہی شخصی احتیاج کے قرض پر سُود کو "ربا" کہا جاتا ہے، جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ رہا تجارتی سُود تو عہد نبوی میں ایسے تجارتی قرضوں کا رواج ہی نہ تھا۔ عرب میں طوائف الملوکی، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہوتی تھیں۔ وسائل سفر انتہائی محدود تھے لہٰذا تجارت بھی برائے نام ہوتی تھی۔ اور جب تجارت ہی برائے نام ہو تو تجارتی قرضوں اور تجارتی سُود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

نہ ہی اس کا وجود ثابت ہوتا ہے ۔ اندریں حالات دورِ حاضر کے بنک کا سُود اس ربا کی تعریف میں کیونکر آسکتا ہے ، جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے ۔

بنک کے سُود کے جواز کے دلائل؟

مہاجنی سُود اور بنک کے سُود میں امتیازی فرق کی وضاحت کے لیے عموماً درج ذیل نکات پیش کیے جاتے ہیں یا بالفاظ دیگر اس کے جواز کیلئے درج ذیل دلائل پیش کیے جاتے ہیں :

۱ ۔ مہاجنی قرضہ میں مقروض خود مہاجن کے پاس جاکر قرضہ کی درخواست کرتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صُورت میں قرض دینے والا خود بنک کے پاس جاکر اپنی رقم پیش کرتا ہے کہ اسے کاروبار میں لگائے اور منافع میں سے اسے بھی کچھ دے دے ۔ بنک اس قرض دہندہ کو ایک پہلے سے طے شدہ شرح سُود ادا کرتا ہے ۔

۲ ۔ جو تاجر یا صنعت کار بنک سے قرضہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ بسا اوقات بنک کو خود شرح سُود کی پیش کش کرتا ہے ۔ مثلاً قرض خواہ کی ساکھ اچھی ہے اور رقم بھی زیادہ لینا چاہتا ہے تو وہ بنک کی مقررہ شرح سے کم شرح کی پیش کش کرے گا کہ اگر بنک کو منظور ہو تو میں قرض لوں گا مثلاً ۱۴٪ کے بجائے صرف ۱۰٪ سُود دوں گا ۔ اور چونکہ اس کی ساکھ اچھی ہوتی ہے تو بنک اس کی پیش کش کو قبول کر کے اسے کم شرح سُود پر بھی قرض دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس طرح بنک کے لین دین میں کسی فریق کی مجبوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ سب کام باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں جو کہ لین دین کی ایک لازمی اور شرعی شرط ہے ۔

۳ ۔ مہاجنی قرضہ میں شرح سُود اتنی بلند ہوتی ہے کہ ایک ضرورت مند مفلس اس کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ جبکہ تجارتی سُود کی صُورت میں تجارت میں نقصان کے احتمال کو مدِّنظر رکھ کر مناسب شرح سُود مقرر کی جاتی ہے جو نقصان کی صُورت میں بھی قابلِ برداشت ہوتی ہے ۔ لہٰذا بنک انٹرسٹ میں مقروض پر کچھ ظلم نہیں ہوتا ۔

۴ ۔ مہاجنی قرضے کی صُورت میں مہاجن کو بعض دفعہ سُود تو بجائے خود رہا ۔ اصل بھی وصول نہیں ہوتا ۔ جبکہ بنک انٹرسٹ کی صُورت میں بنک اپنے مفادات کا پورا تحفظ کر لیتا ہے ۔ بنک زیورات ، جنس ، خام مال یا دیگر اشیاء بطور زرِ رہن رکھ کر اس کا ساٹھ فیصد تک قرضہ دیتا ہے ۔

اس طرح بنک بھی نقصان سے محفوظ رہتا اور ظلم سے بچ جاتا ہے۔ رہے نادار لوگ تو بنک انہیں قرضہ دینے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔

۵۔ مہاجنی قرضہ میں نقصان کا پہلو نفع کی نسبت فی الواقع زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک نادار شخص پر ظلم ہوتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں فریقین میں سے ہر ایک کے لیے فائدہ تو یقینی ہوتا ہے اور نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے اس اصول وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنۡ نَّفْعِهِمَا کے مطابق بھی بنک انٹرسٹ کو اس ربا سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور اس استثناء کی ضرورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ موجودہ دور میں تمام تر ملکی اور غیر ملکی تجارت کا انحصار بنک کے سود پر ہے۔ لہٰذا عصر حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ مندرجہ بالا وجوہات کے پیش نظر ربا کی تعریف میں اجتہاد کر کے مناسب ترمیم کی جانی چاہیے تاکہ اسلام ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے والا دین ثابت ہو سکے۔

حامیانِ سود کے دلائل کا جائزہ

یہ ہیں وہ دلائل جن کے پیش نظر ربا کی تعریف میں مناسب ترمیم اور اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا دلائل میں مندرجہ ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے ہیں:۔

۱۔ کیا عہد نبوی میں عرب میں تجارت فی الواقع نہایت محدود پیمانہ پر ہوتی تھی؟

۲۔ اس دور میں تجارتی قرضوں یا تجارتی سود کا وجود ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

۳۔ کیا شرح سود کی کمی یا مناسب شرح سود، حرمت سود کو سند جواز عطا کر سکتی ہے؟

۴۔ کیا فریقین کی رضامندی سود کو جائز بنا سکتی ہے؟

۵۔ کیا فی الواقعہ حرمت سود کی علت "ظلم" ہی ہے؟ اور اگر فریقین میں سے کسی پر ظلم کا احتمال نہ ہو تو کیا سود کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

۶۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت سود کی تعریف میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کا نفع نقصان سے زیادہ ہے؟

اَب ہم ان تنقیحات کو علی الترتیب زیرِ بحث لائیں گے ۔

ا۔ عہدِ نبوی میں تجارت

عرب ایک بے آب و گیاہ ملک ہے جس کا بہت تھوڑا رقبہ کاشت کے قابل ہے اس پر بھی کم ہی توجہ دی جاتی تھی ۔ کیونکہ شرفائے عرب تجارت کو کوئی معزز پیشہ تصور نہیں کرتے تھے ۔ اسی طرح ہاتھ سے کام کرنے یا دست کاری کے کام کو بھی باعثِ عار سمجھتے تھے ۔ عرب میں عام لوگوں کا پیشہ تو بھیڑ بکریاں ۔ گائے اور اونٹ پالنا تھا لیکن شرفائے عرب کا محبوب مشغلہ تجارت ہی تھا ۔ البتہ یمن میں اون کاتنے اور چادریں اور کمبل بننے کا کام بھی ہوتا تھا ۔ عربوں کو چونکہ فنونِ سپہ گری سے گہری دلچسپی تھی ۔ لہٰذا کہیں کہیں آلاتِ جنگ بھی تیار کیے جاتے تھے ۔

نتیجۃً اہلِ عرب کو اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا سامان باہر سے برآمد کرنا پڑتا تھا ۔ بلاشبہ ان دنوں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا دَور دورہ تھا اور کسی اِکّے دُکّے مسافر کا جان و مال محفوظ نہ تھا ۔ مگر یہ تجارت عموماً قافلوں کی شکل میں ہوا کرتی تھی ۔ قریش مکہ کا تو پاسبان حرم ہونے کی وجہ سے بھی احترام کیا جاتا ۔ دوسرے قافلے یا تو قریش مکّہ کے اثر سے فائدہ اٹھاتے یا اپنی حفاظت کا سامان خود ساتھ لے کر چلتے تھے ۔ غیر ملکی قافلوں کو بحفاظت گزارنے کے عوض ان سے ٹیکس بھی لیا جاتا تھا ۔ ارشاد باری ہے :

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ٥ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ ٥ وَالصَّيْفِ ٥ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ٥

(سورۃ قریش)

”قریش کو مانوس رکھنے کی وجہ سے کہ وہ سردی میں اور گرمی میں سفر سے مانوس تھے ، انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے پروردگار کی بندگی کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا ۔“

ہوتا یہ تھا کہ مکہ میں ہر طبقہ کے لوگ اپنا فروختنی سامان اس قافلہ کے حوالہ کرتے ، جسے وہ اچھے داموں بیچ کر ادھر سے سامان خرید لاتے تھے اس طرح دوہری تجارت سے انہیں دُگنا منافع حاصل ہوتا جو لبا اوقات ۵۰٪ تک پہنچ جاتا تھا ۔ اہل مکہ کی خوشحالی کا دار و مدار اس قافلے کی کامیابی پر منحصر ہوتا تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی بعثت سے پہلے مدینہ ، بصرہ اور شام کے متعدد

تجارتی سفر کیے تھے۔

یہ قافلے کتنے بڑے ہوتے تھے، اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوسفیان کا وہ قافلۂ تجارت، جو جنگ بدر کا پیش خیمہ ثابت ہوا، دو ہزار باربردار اونٹوں پر مشتمل تھا کئی مؤرخوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ درآمد برآمد کی کل تجارت ۵۰ لاکھ دینار سالانہ تک ہوتی تھی۔ دینار سونے کا ایک سکّہ ہے جو ½ ۴ ماشہ[1] کے برابر ہے۔ گویا محتاط اندازہ کے مطابق اگر اس وقت کے دینار کی قیمت آج کل کی پاکستانی کرنسی کے مطابق ۱۲۰۰ روپے تصوّر کر لی جائے تو گویا یہ تجارت ۶ ارب روپے سالانہ تک جا پہنچتی تھی۔

پھر یہ تجارتی قافلے قریش مکّہ تک ہی محدود نہ تھے۔ یمنی تاجر مکہ اور مدینہ کے راستے شام تک جاتے تھے۔ مدینہ کے یہودی، جو ایک سرمایہ دار قوم تھی، شام سے گندم اور شراب درآمد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں غیر ملکی تاجروں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ ملک میں کئی جگہ بازار اور منڈیاں لگتیں۔ جہاں لوگ خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ سوداگروں کے قافلے ایران اور عراق سے تجارتی سامان لے کر آتے اور یہاں کی اشیاء اپنے ممالک میں لے جاتے۔ اس طرح یمن سے بحرِ ہند کے راستے ہندوستان سے عراق کے راستے مشرقی ممالک سے اور شام و مصر کے راستے سے افریقہ سے تجارت ہوتی تھی۔ گویا عرب مشرق و مغرب میں بین الاقوامی منڈی بن گیا تھا۔ جس میں شہر مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حج کے دنوں میں تین مشہور تجارتی میلے لگتے تھے عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جو ہمارے دعوی[2] کا زندہ ثبوت ہے۔

پھر احادیث میں تجارت کی جن اقسام کا ذکر ملتا ہے اور جن میں سے بیشتر آج بھی رائج ہیں۔ ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں عرب میں تجارت کا کاروبار عروج پہ تھا اور تجارت کے سلسلہ میں جو ہدایات احکام مسلمانوں کو دیے گئے ہیں وہ آج بھی مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ اور تاریخ

---

[1] زکوٰۃ کے لیے سونے کا نصاب ۲۰ دینار ہے جسے علماء نے پوری تحقیق کے بعد ½ ۷ تولے سونا قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ایک دینار کی قیمت ½ ۴ ماشہ سونے کے برابر ہے۔

[2] بخاری۔ کتاب التفسیر۔ باب قولہ لیس علیکم جناح۔

سے بھی یہ ثابت ہے کہ متعدد صحابہ کرامؓ تجارت ہی کی وجہ سے اس دور میں لکھ پتی بن گئے تھے۔
اندریں حالات یہ مفروضہ ۔ کہ عہدِ نبوی میں تجارت نہایت پُرخطر تھی، لہٰذا برائے نام رہ گئی تھی۔
ایسا بے معنی مفروضہ ہے جس کی نہ تاریخ تائید کرتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم۔

۲۔ تجارتی قرضے اور تجارتی سود

اس بحث کو ہم تین حصوں میں تقسیم کریں گے:

ا ۔ عہدِ نبوی میں اندرونِ عرب تجارتی قرضوں اور تجارتی سود کا وجود۔

ب ۔ عہدِ نبوی میں ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سود۔

ج ۔ آیا 'ربا' کا لفظ قرآن کریم یا لغوی اعتبار سے تجارتی سود کا بھی احاطہ کرتا ہے یا نہیں؟

ا ۔ عرب میں تجارتی سود

عہدِ نبوی میں تجارتی قرضوں پر سود لینے کا رواج موجود تھا جس کا ذکر تفاسیر میں ملتا ہے۔ صاحب تفسیر خازن وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ۔ (۲/۲۷۸) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"حضرت عباس اور خالد بن ولید نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ وہ قبیلہ بنو عمیر، جو قبیلہ ثقیف (طائف) سے تعلق رکھتا تھا، کے لوگوں کو کاروبار کے لیے سودی قرض دیتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کی بہت بڑی رقم واجب الوصول تھی جو انہوں نے چھوڑ دی۔ اور اس بات کا اعلان خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع[1] میں فرمایا جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔"

جلیل القدر مفسر علامہ ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر میں یوں رقمطراز ہیں:

كان ربا يتبايعون به في الجاهلية۔

"یہ وہ سود تھا جس سے دورِ جاہلیت میں لوگ لین دین کرتے تھے۔"

ب ۔ ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب زمانہ میں قیصر روم جسٹینین نے، جس کی

---

[1] مسلم ۔ کتاب الحج ۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

وفات آپؐ کی پیدائش سے صرف پانچ سال قبل ہوئی تھی۔ تمام بازنطینی سلطنت میں از روئے قانون زمینداروں اور کاشت کاروں کے قرضوں پر ۴ ٪ فیصد، تجارتی اور صنعتی قرضوں پر ۸ ٪، اور بحری تجارت کے قرضوں پر ۱۲ ٪ شرح سُود مقرر کی تھی۔ یہ قانون جسٹینین کے بعد بھی ایک مدت تک بازنطینی سلطنت میں رائج رہا[1]

روم کی سلطنت عرب کی ہمسایہ مملکت تھی جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ یہاں تجارتی سُود اپنی تمام تر شکلوں میں رائج تھا۔ اسی طرح دیگر ممالک میں بھی تجارتی سُود کے شواہد مل جاتے ہیں اور یہ بات ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ آس پاس کے ملکوں سے اہل عرب کے گہرے تجارتی روابط اور میل جول تھا۔ اندریں حالات یہ تصوّر کرنا ناممکن ہے کہ اہل عرب تجارتی سود سے ناواقف ہوں۔ اگر ہم بفرض محال تجارتی سود کے حامیوں کے خیال کے مطابق یہ فرض کر بھی لیں کہ اہل عرب اس دور میں تجارتی سود سے ناآشنا تھے تو بھی اس سے سُود کی اباحت کے متعلق کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ...... ایک طرف تو ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کے احکام ابدی اور تمام دنیا کے لیے ہیں۔ دوسری طرف ہم صرف عرب کے ایک مخصوص دَور پر نظر کر کے سُود کے احکام کو صرف اس قدر اور اس علاقے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کو اتنا علم بھی نہ تھا کہ اگر بالفرض عرب میں نہیں تو ہمسایہ ممالک میں کس کس قسم کا سُود رائج ہے اور آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے؟ کیا یہی علم و حکمت خداوندی ہے؟ سُود کے متعلق یہ علی الاطلاق خدائی احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سود کی تمام مشتبہ شکلوں سے پرہیز کو لازم قرار دینا کیا اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ سُود کی کوئی بھی قسم کسی بھی دَور میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔

ج ۔ تجارتی سُود اور قرآنِ کریم

اسلام نے تجارتی اور شخصی قرضوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ضرور اس کی وضاحت کر دی جاتی۔ قرآن کی نگاہ میں اصل سے جو کچھ بھی زائد لیا جائے اور جس طرح بھی لیا جائے، خواہ وہ مقررہ شرح سے ہو یا بالمقطع ہو، وہ "ربا" ہی ہے۔ ربا کے لغوی معنی بھی وہ مخصوص اضافہ ہے جو اصل سے زائد لیا جاتا

---

[1] سُود از مولانا مودودی ص ۲۸۷ بحوالہ (۱) رول ڈورانٹ (ج ۴ ص ۱۲۰، ۴۳۶ A STORY OF CIVILISATION) زوال و سقوط دولت روم از گبن ج ۲ ص ۲۱۶

ہے۔ اب شخصی اور تجارتی قرضوں کے سُود میں فرق کرنا گویا:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۔ (۲/۸۵)

"کیا تم کتاب کے کچھ حصّے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو" کے مترادف ہوگا۔
ربا کو مہاجنی قرضہ سے مختص کرنا اور شخصی اور تجارتی سود کا الگ الگ مفہوم مقرر کرنا موجودہ
دَور کی اختراع ہے جس کا مسلمانوں کی طویل تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

تجارتی سُود کے متعلق الگ احکام یا الگ لغت کی ضرورت اس لیے پیش نہ آئی کہ اسلام تجارتی قرضوں اور سُود کی الگ الگ نوعیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ سُود کے احکام ہر قسم کے قرضوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ ان احکامات میں جہاں شخصی حاجات کے سود کی حرمت کا پتہ چلتا ہے وہاں تجارتی سود کی حرمت پر بھی واضح دلائل موجود ہیں مثلاً:

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)

"اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سُود کو حرام قرار دیا ہے"

یہاں خرید و فروخت یا تجارت کے مقابلے لفظ ربا کا استعمال تجارتی سُود کی طرف ارشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ جہاں حاجات کے قرضوں کا ذکر مقصود تھا وہاں قرآن کریم نے ربا کے مقابلے صدقہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ (۲/۲۷۶)

"اللہ تعالیٰ سُود کو ختم کرتا اور صدقات کی پرورش کرتا ہے۔

دوسری دلیل: ارشاد باری ہے:

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (۲/۲۷۹)

"اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے راس المال ہیں۔

اس آیت میں تجارتی قرضوں کے سُود کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ لفظ راس المال (سرمایہ) کا اطلاق کاروبار پہ لگائی ہوئی رقم کے لیے ہوتا ہے۔

تیسری دلیل: قرض کے لیے عربی لغت میں دو الفاظ ملتے ہیں۔ قرض اور دین۔ قرض

کا مطلب عام فہم ہے اور عام طور پر شخصی قرضوں کے لیے آتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

اِذَا اَقْرَضَ الرَّجُلُ فَلَا یَاْخُذُ هَدِیَّةً۔ (بخاری فی تاریخہ)

"جب کوئی شخص کسی دوسرے کو قرض دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔

جبکہ دین کا لفظ ہر قسم کے لین دین پر محیط ہے اس کا صحیح ترجمہ ذمہ ذمہ داری یا انگریزی میں LIABILITY (ادائیگی کی ذمہ داری) ہوگا جس میں کاروباری قرضے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ (۲/۲۸۲)

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

اور ربا کی تعریف الزیادۃ فی الدین سے کی جاتی ہے نہ کہ الزیادہ فی الغرض سے لہٰذا از روئے قرآن و لغت بھی تجارتی سود کو "ربا" سے خارج کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

۳۔ شرحِ سود کی کمی

تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل کہ اس کی شرح نقصان کے احتمال کو مدِنظر رکھ کر مناسب اور قابل برداشت مقرر کی جاتی ہے کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔

اوّلاً: یہ کہ آج تک مناسب اور معقول شرح کا تعیّن نہیں ہوسکا۔ کبھی تو یہ شرح ۲٪ بھی نامناسب اور غیر معقول قرار دی جاتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے لگ بھگ زمانے میں ریزرو بنک آف انڈیا کا ڈسکونٹ ریٹ مقرر ہوا اور یہی شرح دورانِ جنگ قائم رہی۔ پھر یوپی نے تین فیصد پر حکومت ہند کو قرضے[1] ملتے رہے اور کبھی یہ شرح ۲۹ فیصد[2] بھی معقول اور مناسب سمجھ لی جاتی ہے۔ شرحِ سود کی مناسب تعیین نہ ہوسکنے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی متزلزل اور کمزور ہے۔ مناسب اور معقول شرحِ سود کی تعیین تو صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے جب یہ معلوم ہوسکے کہ قرض لینے والا اس سے کتنا ہی یقینی فائدہ حاصل کرے گا اور اس میں سے قرض دینے والے کا معقول حصّہ کیا ہونا

---

[1] سود (چھٹا ایڈیشن) صـ۸۳ از مولانا مودودیؒ

[2] اشتہار انوسٹمنٹ بنک نوائے وقت ۱۸ اگست ۱۹۷۷ء

چاہیے۔ مگر ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والے کو اس متقررہ مدت میں کتنا فائدہ ہوگا یا کچھ فائدہ ہوگا بھی یا نہیں؟ تو پھر معقول شرح سود کا تعین کیسے ممکن ہے، بلکہ اس سے بھی ذرا آگے بڑھیں اور شرح سود کے بجائے نفس سود اور اس کے جواز پر غور کریں کہ سود آخر کس چیز کا معاوضہ ہے؟ تو اس اہم مسئلہ پر ماہرین معاشیات کے جتنے اختلافات پائے جاتے ہیں، شاید ہی علم معاشیات کے کسی دوسرے مسئلہ پر پائے جاتے ہوں[1]

ثانیًا: یہ کہ ایک ہی ملک اور ایک ہی وقت میں بنکوں کی شرح سود میں انتہائی تفاوت پایا جاتا ہے۔ سٹیٹ بنک عام بنکوں کو ۱۰٪ شرح سود پر قرض دیتا ہے تو بنک کاروباری لوگوں کو ۱۶٪ پر دے رہے ہیں جو سود در سود کے چکر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پھر حکومت خود جو عوام سے کاروبار کے لیے قرضے لیتی ہے اس کی شرح دس سال کے قرض کے لیے ۲۹ ہو ہے اور رقم دس سال میں چار گنا ہو جاتی۔ اب آپ خود اندازہ فرمالیجئے کہ اگر یہ سب کچھ مناسب شرح ہے تو نامناسب کیا ہو سکتی ہے؟ اور اگر ایسے قرض لے کر تجارت کی جائے جہاں نقصان کے احتمال بھی موجود ہیں تو گرانی اشیاء کا کیا عالم ہوگا۔

ثالثًا: یہ بات قابل غور ہے کہ اگر بالفرض شرح سود مناسب حد تک کم اور معقول ہو تو کیا حرمت سود پر اثر انداز ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ اور حقیقتًا یہی اصل مبحث ہے۔ تو ہمارے خیال میں شرح سود ایک فیصد ہو یا ۵۰ فیصد، شریعت کی نگاہ میں ایک ہی جیسا جرم ہے شراب کا ایک قطرہ بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے شراب کا ایک چمکتا ہوا جام کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ حرام چیز مثلاً شراب کی قلیل مقدار بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے اس کی کثیر مقدار[2] لہٰذا شرح سود کی کمی یا معقولیت کی بنا پر سود کی اباحت کے لیے راہ ہموار کرنا بالکل فضول سی بات ہے۔

۴۔ فریقین کی رضامندی

فریقین کی رضامندی کی شرط صرف حلال چیزوں میں ہوا کرتی ہے جیسے تجارت یا نکاح وغیرہ۔ حرام چیزوں یا معاہدات میں

---

[1] بنیادی معاشیات ج ا طبع سوم ص ۳۰۸ از محمد حسین چودھری صدر شعبہ معاشیات

[2] ترمذی۔ ابواب الاشربہ۔ باب ما اسکر کثیرہٗ فقلیلہٗ حرامٌ۔

رضا مندی کی شرط ہی سرے سے غلط اور باطل ہے۔ فریقین کی رضا مندی زنا یا جوئے کو جائز نہیں بنا سکتی۔ حالانکہ یہ دونوں کام بھی بسا اوقات باہمی رضا مندی سے ہی طے پاتے ہیں پھر آخر سود جیسی حرام چیز کو لوگوں کی مرضی یا فریقین کی رضا مندی پہ کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ اسی طرح خواہ سُود لینے والا شرح سُود کی تعیین کرے یا سُود دینے والا، ان باتوں سے بھی نفسِ سُود کی حرمت پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سُود دینے والا کبھی سُود دینے پہ رضامند نہیں ہوا کرتا۔ اسکی رضا مندی نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی مجبوری ہوتی ہے۔ اگر اسے کم شرح سُود پہ قرضہ مل سکے یا کہیں سے قرضِ حسنہ ملنے کی توقع ہو تو وہ کبھی یہ سُودی قرض لینے پہ تیار نہ ہوگا۔ سودی معاہدات میں رضامندی کا جتنا پہلو ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل تاریخی واقعہ سے بخوبی ہو سکے گا:

دوسری جنگ عظیم کی بات ہے کہ انگلستان نے امریکہ سے ایک بھاری قرض کا معاملہ کیا جو BRITON WOOD AGREEMENT کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ مشہور ماہر معاشیات برطانیہ لارڈ کینز (J.M. KAYNES) کی معرفت طے پایا۔ انگلستان یہ چاہتا تھا کہ اس کا خوشحال دوست امریکہ جو اس لڑائی میں اس کا رفیق تھا اسے بلا سُود قرض دے دے لیکن امریکہ سُود چھوڑنے پر راضی نہ ہُوا انگلستان اپنی مشکلات کی وجہ سے مجبور ہو گیا کہ سُود دینا قبول کرے اس کا جو اثر انگریز قوم پہ مرتب ہوا وہ بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

لارڈ کینز جب اپنا مشن پورا کر کے پلٹے تو انہوں نے برطانوی دار الامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "میں تمام عمر اس رنج کو نہ بھولوں گا جو مجھے اس بات سے ہوا کہ امریکہ نے ہم کو بلا سُود قرض دینا گوارا نہ کیا۔ مسٹر چرچل جیسے امریکہ پسند شخص نے کہا کہ: یہ بنیے پن کا برتاؤ جو ہمارے ساتھ ہوا ہے، مجھے اس کی گہرائی میں بڑے خطرات نظر آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے باہمی تعلقات پر بہت ہی بُرا اثر پڑا ہے۔

اس وقت کے وزیر خزانہ مسٹر ڈالٹن نے کہا کہ: "یہ بھاری بوجھ جسے لادے ہوئے ہم جنگ سے نکل رہے ہیں ہماری ان قربانیوں اور جفاکشیوں کا بڑا ہی عجیب صلہ ہے جو ہم نے مشترک مقاصد کیلیے برداشت کیں[1]"

---

[1] سُود (چھٹا ایڈیشن) ص ۱۰۵، ۱۰۶ از مولانا مودودی۔

یہ تو خیر ایک ضمنی سی بحث تھی کہ سُود میں رضا مندی کا نہیں بلکہ اضطرار کا معاملہ ہوتا ہے۔ تاہم اس پہلو کو نظر انداز کرکے اگر فریقین کی رضامندی کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی سُود کی حرمت پہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

۵۔ رِبا اور ظلم

تجارتی سُود کی حمایت میں یہ دلیل بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ سُودی معاہدہ باہمی رضا مندی سے طے پاتا ہے اور فریقین میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ کے مطابق یہ سُود اور اس ربا کی تعریف میں کیسے آسکتا ہے جس کی بنیاد ہی ظلم پر ہوتی ہے۔ گویا حرمت سُود کی علت "ظلم" سمجھا جاتا ہے حالانکہ سُود کی حرمت کی علت "ظلم" نہیں۔ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہ الفاظ سُودی معاملات اور بدایات کو ختم کرنے کی احسن صورت پیش کر رہے ہیں۔ یعنی نہ تو مقروض قرض خواہ کی اصل رقم بھی دبا کر اس پر ظلم کرے اور نہ مقروض پر سُود کا بھی بوجھ لاد کر اس پر ظلم کرے۔

سُود کی حرمت کی علّت ظلم نہیں بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنے مال میں اضافہ کی ہوس ہے سُود کے متعلق سب سے پہلی آیت جو مکی دور میں نازل ہوئی۔ اس میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے۔

ارشاد باری ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ۔ (۳۰/۳۹)

"اور جو رقم تم سُود پر دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے اموال سے بڑھتی رہے تو یہ مال اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔

بفرض محال ہم یہ تسلیم کر لیں کہ حرمتِ سُود کی علّت ظلم ہی ہے اور یہ بھی کہ چونکہ سودی معاہدہ باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے اور یہ بھی فریقین میں سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ لیکن اصل مظلوم تو وہ معاشرہ ہے جس پر ان دو حرام خوروں کے اس سُودی کاروبار کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اس ظلم کی ذمہ داری کیا ان دونوں پر نہیں پڑتی؟

۶۔ ربا میں نفع و نقصان کا تقابل

ایسے شرعی احکام میں، جو نص قطعی سے ثابت ہوں، نفع و نقصان کا تقابل کرنا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں۔ کیونکہ انسانی عقل کسی چیز کے نفع و نقصان کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتی۔ شراب اور جوئے کے متعلق قرآن کریم میں جو نفع و نقصان کا تقابل کیا گیا ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے جو خود فریق نہیں بلکہ اس کی نظر

سب نوعِ انسانی پر ایک جیسی ہے ۔ اللہ نے اسے شرابیوں اور جواریوں کے فیصلے پر نہیں چھوڑا اگر ایسی بات ہوتو وہ یقیناً شراب اور جوئے کے فوائد ہی زیادہ بتلائیں گے ۔ پھر سود کے حامیوں کو اس تقابل کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے ؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "شراب کی حرمت کی علّت نشہ ہے لیکن اس کے باوجود فقہاء نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار نہیں دیا ۔ بلکہ صرف ان نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جن کا ضرر واقعی نفع سے زیادہ ہو" اور اس بیان سے مطلوب یہ چیز ہوتی ہے کہ سود کی کوئی نرم سی شکل (جیسے بنک کا سود) جس میں نفع کا پہلو نقصان سے زیادہ ہو اس کو حرام قرار نہ دینا چاہیے ۔

اب دیکھئے کہ یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ 'فقہاء نے ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار نہیں دیا'، کیونکہ واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کل مسکرٍ حرامٌ (ہر نشہ آور چیز حرام ہے) اور جہاں نص موجود ہو وہاں فقہاء کا کوئی کام باقی نہیں رہ جاتا ۔ فقہاء کا کام فقط یہ سوچنا باقی رہ جاتا ہے کہ آیا زیرِ بحث چیز نشہ آور ہے یا نہیں ۔ اگر اس کا نشہ آور ہونا یا بالفاظ دیگر انسانی حواس کو مختل کر دینا ثابت ہو جائے ۔ تو پھر وہ حرام ہی ہو گی اسے کوئی فقیہ یا کوئی دوسرا شخص حلال نہیں بنا سکتا ۔ نہ ہی اسے نفع و نقصان کا تقابل کر کے جائز بنانے کا حق دیا جا سکتا ہے ۔

ربا کی تعریف میں اجتہاد

حامیانِ سود کے جن دلائل کا جائزہ اُوپر پیش کیا گیا ہے، اُن کی بنا پر ہی ربا کی تعریف میں اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے، تو اس سے ہم معذرت ہی چاہیں گے ۔ اجتہاد کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب اوامر کے نفاذ میں کوئی مجبوری یا دشواری درپیش ہو یا اس کے نفاذ سے کسی بگاڑ کا خطرہ پیدا ہو جائے ۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے دوران چوری کی حد ساقط کر دی تھی ۔ یا حج کا سفر پرخطر ہونے کے باعث کسی سال حج کو ساقط کر دیا جائے اور یہ محض وقتی تبدیلیاں ہوتی ہیں، دائمی نہیں ہوتیں ۔ لیکن سود کے معاملہ میں کوئی ایسی مجبوری درپیش نہیں ہے ۔ نہ قرض لینے والے کو اور نہ دینے والے کو کسی کو بھی کوئی مجبوری نہیں ۔ تجارتی قرضوں کے لیے شریعت نے مضاربت کی راہ کھولی ہے اور شخصی قرضوں کے لیے، قرض حسنہ، صدقات نظامِ زکوٰۃ اور بیت المال کی ۔ ملکی اور غیر ملکی تجارت کے سلسلہ میں کوئی اور ایسی مجبوری درپیش نہیں جس کا شریعت میں حل موجود نہ ہو ۔ اس کے باوجود اگر ایک قطعی حرام چیز کے لیے جواز کی راہیں تلاش کی جائیں

تو یہ اجتہاد نہیں بلکہ دین میں تحریف ہو گی۔ جس سے اسلامی معیشت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا فتویٰ

ہمارے یہ دوست جب اجتہاد کا ذکر کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ کے گیارہ سالہ دورِ حکومت کے کئی واقعات بطور شہادت پیش کر دیتے ہیں۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فی الواقعہ ایک عظیم مفکر، بہت بڑے سیاست دان، صاحب بصیرت اور اسلام کے انتہائی دلدادہ تھے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد یا قانون میں لچک پیدا کر لیتے تھے۔ ہمیں حیرت تو اس بات پر ہے کہ ان حضرت عمرؓ کے شیدائیوں کو حضرت عمرؓ کا وہ فتویٰ کیوں قابل قبول نہیں جو آپ نے سود کے متعلق فرمایا تھا۔ وہ فتویٰ یہ ہے:

اِنَّ اٰیَةَ الرِّبٰا مِن اٰخرِ مَا اُنزل من القراٰنِ وَاَنَّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قُبِضَ ان یُبینہٗ لَنَا فَدَعُوا الرِبا والرِّیبۃ[1]

"آیت ربا ان آیات سے ہے جو قرآن کے نزول کے آخری زمانہ میں نازل ہوئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا بیشتر اس کے کہ وہ تمام احکام ہم پر واضح فرماتے لہٰذا تم لوگ سود کو بھی چھوڑ دو اور ہر اس چیز کو بھی جس میں سود کا شائبہ تک ہو۔

غور فرمائیے اگر تجارتی سود میں کچھ بھی اجتہاد کی گنجائش ہوتی تو حضرت عمرؓ ضرور ایسا کرتے۔ تجارتی سود کی نظیریں، عرب اور ہمسایہ ممالک سب جگہ اپنی ارتقائی شکل میں موجود تھیں۔ تجارتی سود کے نفع و نقصان کے تمام تر پہلو بھی سامنے آ چکے تھے۔ جس سود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سب سے پہلے کالعدم قرار دیا تھا وہ آپؐ کے چچا عباس بن عبد المطلب کا سود تھا[2] اور یہ تجارتی سود ہی تھا۔ جیسا کہ پہلے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ قرآن کے اس حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کے مطابق عمل کے بعد حضرت عمرؓ یا کسی بھی دوسرے کے لیے یہ گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ کہ تجارتی سود کو ربا کے حکم سے خارج کر کے تجارتی سود کے لیے جواز کی راہیں تلاش کی جائیں۔

---

[1] ابن ماجہ۔ دارمی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب الربا فصل ثالث۔

[2] مسلم۔ کتاب الحج۔ باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

حامیان سُود کے اشکالات اور ان کا جائزہ

۱۔ سُود اور تجارتی منافع

حامیان سُود کی طرف سے یہ اشکال کوئی نیا نہیں۔ بلکہ وہی اعتراض یا اشکال ہے جو مدینہ کے یہود نے پیش کیا تھا۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ جب اسلام بھی سرمایہ کو عامل پیداوار تسلیم کرتا ہے۔ تو پھر اگر ایک شخص کسی دوسرے کو تجارت یا کاروبار کے لیے سرمایہ مہیا کر کے منافع کا حصّہ لیتا ہے اور دوسرا شخص منافع کے حصّہ کے بجائے پہلے سے طے شدہ حصّہ لیتا ہے۔ تو یہ دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ منافع کا حصّہ چھوڑا تو کسی نے بھی نہیں۔ لہٰذا ان میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم نے ایسی مثال دینے والے شخص کو مخبوط الحواس قرار دیا ہے۔ ($\frac{۲}{۲۷۵}$) کیونکہ سُود اور بیع میں فرق اتنا واضح ہے جسے ایک عام عقل کا آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود انہیں ایک جیسا قرار دینا دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ اب ہم تجارت اور سُود کا فرق ذرا وضاحت سے پیش کرتے ہیں؛

تجارت اور سُود کا فرق

سُود اور تجارت میں فرق درج ذیل امور میں پایا جاتا ہے۔

(۱) سُود ایک طے شدہ شرح کے مطابق یقینی منافع ہوتا ہے۔ جبکہ تجارت میں منافع کے ساتھ نقصان کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے۔ خواہ کوئی شخص یہ تجارت اپنے سرمایہ سے کرے یا کسی دوسرے کے سرمایہ سے، جسے عرف عام میں مضاربت کہا جاتا ہے۔[۱]

(۲) مضاربت کی شکل میں فریقین کو تجارت سے یکساں ہمدردی ہوتی ہے۔ قرض دینے والا کسی آڑے وقت پیسہ کا مطالبہ کر کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کا سبب نہیں بنتا۔ کیونکہ اس سے اس کا اپنا مفاد بھی وابستہ ہوتا ہے۔ جبکہ سُود خوار کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ سُود خوار کے اس فعل

---

[۱] مضاربت تجارت کی وہ قسم ہے جس میں ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرا محنت کرے اور منافع طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم ہو۔ اور اگر نقصان ہو جائے تو یہ نقصان سرمایہ پر پڑے گا اور محنت کش کی محنت ضائع ہوگی ہمارے ہاں عموماً یہ شرط طے کر لیتے ہیں کہ نفع و نقصان دونوں میں سرمایہ دار اور محنت کرنے والا شریک ہوتے ہیں۔ یہ شرط سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام محنت کے مقابلہ سرمایہ کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہاں اگر صاحب مال محنت کرنے والے پر یہ شرط عائد کر دے کہ وہ فلاں کام یا فلاں کاروبار نہ کرے۔ پھر بھی محنت کرنیوالا وہ کام کرے تو نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔

سے صرف محبّت کرنے والا یا مقروض ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ نتیجۃً ملکی معیشت پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

(۳) اور تیسرا فرق یہ ہے کہ تجارت کی صورت میں فریقین میں اخوت اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور سود کی صورت میں منافرت و عداوت کے۔ سود خوار میں خود غرضی، مفاد پرستی، زر پرستی اور سنگ دلی۔ جیسے اخلاق رزیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ سود کی حرمت کی علت بھی یہی ہے کہ سود خوار بیٹھے بٹھائے ایک مقررہ منافع کی ضمانت چاہتا ہے اور حالات خواہ کچھ ہو وہ اس کی وصولی پر مصر ہوتا ہے۔ سودی نظام معیشت نے صرف ایک ہی شائی لاک[1] پیدا نہیں کیا بلکہ ہر دور میں ہزاروں شائی لاک پیدا ہوتے رہے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

دوسرا اشکال۔ سود اور کرایہ جات

تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر سود یقینی منافع کی بنا پر ناجائز سمجھا گیا ہے تو اور بھی کئی باتیں ایسی ہیں جن میں منافع بھی یقینی ہوتا ہے اور انہیں جائز بھی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً دکانوں اور مکانوں کے کرائے۔ زمین کا لگان اور بعض دیگر اشیائے استعمال مثلاً کراکری۔ خیموں اور سائیکلوں وغیرہ۔ تو پھر آخر سود کو ہی یقینی منافع کی بنا پر کیوں ناجائز قرار دیا جاتا ہے؟

یہ اشکال بھی ہمارے نزدیک عذرِ گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ کرایہ اور منافع دونوں الفاظ بالکل الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ تاہم ان کا فرق ذرا وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ ملکیت میں تبدیلی کرایہ کی صورت میں اصل اشیاء کی ملکیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی کوئی کرایہ دار مکان یا دکان کا مالک نہیں بن سکتا۔ نہ ہی اس چیز میں مالک کی مرضی کے بغیر

---

[1] ایک سنگ دل یہودی سود خوار جس نے ایک مقروض کو قرض دیتے وقت یہ شرط عائد کی تھی کہ اگر وہ مقررہ وقت تک اصل معہ سود ادا نہ کرے گا تو وہ اس کی ران سے گوشت کاٹ لے گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مقروض کسی مجبوری کی وجہ سے اس سود خوار کی رقم بروقت ادا نہ کر سکا۔ تو اس سنگ دل مثالی کردار نے فی الواقع اس کی ران سے بے دریغ گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیا تھا۔

کسی قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔ جبکہ سرمایہ دار کی رقم جب اس سے جُدا ہوئی تو وہ دوسرے کی ملکیت ہوگئی۔ اور وہ جب تک اس میں تصرف نہ کرے، اس سے فائدہ اٹھا ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ اسے جس طرح چاہے۔ استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۲۔ماہیت میں تبدیلی کرائے کی اشیاء مثلاً مکان خیموں یا سائیکلوں وغیرہ، کی بنیادی حیثیت و ماہیت برقرار رہتی ہے۔ جبکہ سرمایہ کی بنیادی شکل کو ختم کر کے اسے کسی دوسری شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے تجارت کا تصوّر ہی ناممکن ہے۔

۳۔عوضانہ کرایہ اور سُود میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اشیاء کا مالک کرایہ کی رقم ان اشیاء کی گھسائی، ٹوٹ پھُوٹ اور مرمت کے عوض وصول کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی نگہداشت اور بہبود مالک کے ذمہ ہوتی ہے۔ جبکہ رقم کی صُورت میں اس گھسائی، ٹوٹ پھُوٹ اور مرمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سُود کی رقم محض مدت کے بالعوض وصول کی جاتی ہے۔

زمین کے لگان یا ٹھیکہ کا مسئلہ بھی کرایہ سے کچھُ زیادہ مختلف نہیں۔ اس کی بھی نہ ملکیت تبدیل ہوتی ہے اور نہ ماہیت۔ البتہ اس میں گھِسائی، ٹوٹ پھُوٹ اور مرمت نہیں ہوتی مگر سیم تھور کی وجہ سے زمین کلّر بنجر بن سکتی ہے۔ تاہم بعض علماء اسے سُود کی مثل قرار دے کر اس سے اجتناب ہی بہتر سمجھتے ہیں اور علماء کی اکثریت اس صُورت میں اسے جائز سمجھتی ہے کہ اگر فصل کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے کم پیدا ہو یا تباہ ہو جائے تو مالک زمین اس طے شدہ ٹھیکہ میں مناسب کمی کر دے یا معاف کر دے تو اس صُورت میں یہ مضاربت ہی کی شکل بن جاتی ہے۔

اب تک ہم نے جن دلائل یا اشکالات کا جائزہ پیش کیا ہے ان کی حیثیت یا تو شرعی ہے یا عقلی اور تاریخی۔ اب ہم حامیان سُود کے اس اشکال کا جائزہ لیں گے جس کا تعلق سراسر معاشیات سے ہے۔ لہذا اس اشکال کا جائزہ ہم تفصیل سے پیش کریں گے

تیسرا اشکال سُود اور قومی معیشت
(بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ)

حامیانِ سُود کی طرف سے بڑے شدومد سے یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ سُود ہی کی کشش کی وجہ سے لوگ بچت کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر بنکوں سے سُود کو ختم کر دیا جائے تو لوگ بچت کرنا چھوڑ دیں گے اور اس طرح قومی معیشت متاثر ہو گی۔

اس اشکال پر تین پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے:۔

ا۔ کیا فی الواقع بچتوں کا محرک سُود ہی ہے؟
ب۔ کیا انفرادی بچتیں قومی بچت کو متاثر کرتی ہیں؟
ج۔ سُود کو ختم کرنے سے اسلامی نظامِ حیات میں بچتوں پر کیا اثر پڑے گا؟

ا۔ بچت اور سُود

ہمارے خیال میں یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ لوگ محض سود کی کوکشش کی وجہ سے بچت کے عادی ہوتے ہیں۔ بچت کے اور بھی بہت سے محرکات ہیں جو سود سے قوی تر ہیں۔ جدید ماہرینِ معاشیات اس امر پر متفق ہیں کہ بچت کے کئی ایک عوامل میں سے ایک سُود بھی ہے۔ مشہور برطانوی معیشت دان لارڈ کینز (J. M. KEYNES) نے اپنی کتاب 'روزگار، سُود اور زر کا عام نظریہ'[1] میں بچت کے داخلی محرکات کا ذکر کرتے ہوئے جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اتفاقی حوادث کے لیے پیش بندی۔
۲۔ مستقبل میں متوقع اخراجات۔ بچوں کی تعلیم اور شادیوں کے اخراجات۔
۳۔ بڑھاپے میں قوتِ کار کم ہونے کی وجہ سے آمدن کا محدود ہونا۔
۴۔ احتیاج سے آزادی چاہنا۔

---

[1] THE GENERAL THEORY OF EMPLOYMEN, INTREST - MONEY P.10 - MAC MILLANAR LONDON

۵ ۔ معیار زندگی میں اضافہ کے خیال سے بچت کرنا ۔
۶ ۔ کاروبار کے لیے کچھ سرمایہ بچا کر رکھنا یا ورثاء کے لیے ترکہ چھوڑنے کی خواہش ۔
۷ ۔ طبعی کنجوسی کے سبب پس انداز کرنا ۔
۸ ۔ سُود ۔ بچت میں مزید اضافہ حاصل کرنے کے لیے ۔

گویا لارڈ موصوف نے سُود کو بچت کے عوامل میں آخری آٹھویں نمبر پر شمار کیا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ بچت میں مزید اضافہ کا محرک کوئی بھی آمدنی ہو سکتی ہے، ضروری نہیں کہ وہ سُود ہی ہو۔

لارڈ موصوف کے بعد اس سلسلہ میں مزید تحقیق کے نتیجہ میں کئی اور محرکات بھی سامنے آئے ہیں مثلاً سیاسی نظم و استحکام، صارفین کو قرض کی فراہمی، سابق معیار زندگی اور آمدنی میں اضافہ کی رفتار وغیرہ وغیرہ۔

ب ۔ انفرادی بچت اور قومی بچت

جب ہر شخص بچت پر آمادہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ عوام کی قوت خرید کم ہو جائے گی اور جب اشیائے صرف کی خرید رک جائے گی تو ملکی معیشت ایک دوسرے انداز سے متاثر ہونا شروع ہو جائے گی۔ جو لوگ اشیائے صرف پیدا کرتے ہیں ان کی آمدن، اور اسی طرح بچت اس حد تک محدود ہو جائے گی جس حد تک انفرادی بچتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بچت کے متعلق لارڈ کینز موصوف کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

> "قومی بچت افرادی بچت سے متاثر نہیں ہوتی ۔ جب معاشرہ کے چند لوگ بہت زیادہ بچت کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کی قوتِ پس اندازی کم ہو جاتی ہے۔ قومی بچت تب ہی بڑھ سکتی ہے۔ جب قومی آمدنی میں اضافہ ہو۔ لہٰذا تمام تر توجہ پیداوار اور وسائل پیداوار بڑھانے پر مرکوز کرنی چاہیے ۔

ج ۔ اسلام اور نظریہ بچت

اسلام نے اس مسئلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے کفایت شعاری ایک اچھی صفت ہے لیکن اگر بخل کی حد تک پہنچ جائے تو مذموم اور ایک اخلاقی جرم بن جاتی ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ خرچ کرنے میں نہ اسراف کیا جائے اور نہ بخل بلکہ کفایت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس طرح جو کچھ پس انداز ہوتا ہے، اگر ہو سکے تو یہ سب کچھ فقیر و محتاج لوگوں کی ضرورت پر خرچ کر دیا جائے بموجب ارشاد باری تعالیٰ:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۱۹)

"لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو۔"

لیکن ایسا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس پر صرف اہل عزیمت متقی لوگ ہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان میں بچت سے بہت سے داخلی محرکات ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لہٰذا اخلاقِ فطرت نے انسان کی اس کمزوری کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اس بچی ہوئی رقم کا ایک قلیل حصہ یعنی ۲½ فیصد اللہ کی راہ میں فقراء و مساکین کی ضروریات پر خرچ کرنے کی پابندی عائد کی ہے۔ باقی ۹۷½ فیصد یا ۳۹ حصے انسان بچا کر خود اپنے پاس بھی رکھ سکتا ہے، اسے مزید نفع آور کاموں یعنی تجارت وغیرہ میں بھی لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح انفرادی بچتوں میں تو معمولی سا فرق پڑ سکتا ہے، لیکن قومی بچت متاثر نہیں ہوگی جیسا کہ اُوپر واضح کیا گیا ہے۔

سُود کے خاتمہ کی صُورت میں ہمارے اندازے کے مطابق بنک میں جمع ہونے والی رقوم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام میں آج بھی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو بنک کے سُود کو حرام سمجھتا اور اس کے لین دین سے گریز کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنی رقوم محض اس لیے چالو کھاتہ میں رکھتے ہیں کہ سُود لینے سے نفرت ہے۔ غیر سُودی نظام میں ایسی تمام رقوم چالو کھاتہ (CURRENT ACCOUNT) سے نکل کر کاروبار مضاربت یا شراکت کے لیے بچت کھاتوں میں چلی جائیں گی۔ اور چالو کھاتہ میں کمی واقع ہو جائے گی۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سرے سے بنک میں رقوم برائے حفاظت، رکھوانے کے بھی روادار نہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ آخر بنک بھی ہماری رقوم سے سُودی کاروبار کیوں کرے؟ فائدہ تو بنک اُٹھائے اور اس گناہ کے کاروبار میں حصہ ہمارا بھی ہو۔ بموجب ارشادِ باری تعالیٰ:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔ (۵/۳)

"اور کسی گناہ یا زیادتی کے کام میں تعاون مت کرو۔"

وہ اس چیز سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی رقوم کی حفاظت کا انتظام گھر پر یا دوسرے ذرائع سے کر لیتے ہیں۔ غیر سُودی نظام میں یہ تمام رقوم گھروں سے نکل کر بنکوں میں چلی جائیں گی اور چالو کھاتہ کی رسد برقرار رہے گی۔

علاوہ ازیں مالدار طبقہ اپنی رقوم کا ایک حصّہ گھر پر رکھتا ہے۔ تاکہ حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں۔ جنہیں اکثر لوگ ناجائز تصوّر کرتے ہیں سے بچ سکے۔ اسلامی نظامِ معیشت میں ٹیکسوں کے بجائے نظام زکوٰۃ رائج ہوتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کو ایسی رقوم گھر پہ رکھنے کا چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ زکوٰۃ ایک اہم فریضہ، مالی عبادت اور اللہ کا مسلمانوں پر حق ہے جس نے ایک مسلمان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے لہٰذا گھروں میں محفوظ ایسی تمام رقوم بھی بنکوں میں چلی جائیں گی۔ اندریں صورت گمان غالب یہی ہے کہ بنکوں میں سرمایہ کی فراہمی کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گی۔

سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی

سُود کا سب سے بڑا فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ملک کی صنعت و تجارت کو "حیات بخش خون" (سرمایہ) مہیا ہوتا ہے۔ سُود کے لالچ کی بنا پر ہی بنک سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ جس سے ملکی پیداوار اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ روزگار عام ہوتا ہے اور خوشحالی بڑھتی ہے۔ اگر سُود کو ختم کر دیا جائے تو ملک کی اقتصادی ترقی کی رفتار رُک جائے گی۔

اسلام نے نفع آور اغراض کے لیے سُود کے بجائے تجارت کی راہ دکھلائی ہے۔ تجارت میں اگرچہ خسارہ کا امکان بھی ہوتا ہے اس کے باوجود تجارت میں نفع کے امکانات سود سے بہت زیادہ ہیں۔ اور اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ کہ تاجر حضرات سُود پر سرمایہ لینے کے بعد تجارت ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا غیر سُودی معیشت میں صنعت و تجارت کو یہ حیات بخش خون ملتا ہی رہے گا۔ تبدیلی صرف طریق کار میں واقع ہوگی۔

بلاشبہ اگر بنک تجارتی بنیادوں پر سرمایہ دار کی مذمت اکریں گے تو سُودی نظام سے کہیں بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ و محنت کے اشتراک عمل سے کاروباری مزاحمت کم ہوگی۔ لہٰذا گرانی بھی کم ہوگی۔ کساد بازاری کا رجحان بھی ختم ہوگا۔ قومی آمدنی بھی بڑھے گی، فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ تھوڑے بہت لوگوں کو، حسبِ ضرورت سرمایہ دار، روزگار بھی میسر آئے گا۔ مگر غریبوں کے مسائل پھر بھی پوری طرح حل نہ ہو سکیں گے گردش زر کا دائرہ محدود ہی رہے گا، لہٰذا مملکت پوری طرح فلاحی مملکت نہ بن سکے گی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے سرمایہ کاری کے لیے وہی راہ اختیار کی ہے جو سرمایہ کاری نظام کے لیے مختص اور سرمایہ داری کی خدمت پر مامور ہے۔

سرمایہ کاری اور اسلام

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کاری کا میدان، تاجر، زمیندار اور صنعت کار ہے۔ عوام کی بچتیں انہیں حضرات کے سامنے لاکر ڈھیر کی جاتی ہیں تاکہ وہ اور بھی پھلیں پھولیں۔ اس کے برعکس اسلام میں سرمایہ کاری کا میدان غریب طبقہ ہے۔ امراء سے ان کی بچتوں کا ایک حصہ وصول کرکے ان کی خدمت کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں امراء کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ہر وقت غریب طبقہ کا خیال رکھیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ غریب طبقہ کی خدمت سے سرمایہ کاری کیونکر ہوتی ہے اور وہ قومی معیشت پر کیسا خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔

قومی معیشت میں صدقات و خیرات کی اہمیت

فرض کیجئے کہ کسی مخصوص طبقہ میں بچت کا میلان ⅓ ہے۔ بالفاظ دیگر اگر ایک آدمی کی ماہوار آمدنی تین ہزار روپے ہے تو اس میں سے وہ دو ہزار روپے اشیائے ضرورت پر صرف کر دیتا ہے اور ایک ہزار روپے ماہوار بچاتا ہے۔ اور علم معاشیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک شخص کا خرچ دوسرے کی آمدنی ہوتی ہے۔ یعنی جس شخص نے تین ہزار روپے ایک ماہ میں کمائے ہیں تو یہ دوسرے لوگوں کا خرچ تھا اور یہ شخص جو دو ہزار روپے خرچ کرے گا تو وہ دوسروں کی آمدنی ہوگی۔ مثلاً زید بازار میں جاکر بیس روپے کا گوشت خریدتا ہے، چالیس کا کپڑا اور دس روپے کی ڈاکٹر سے دوائی لاتا ہے تو زید کا یہ ستر روپے کا خرچ فی الحقیقت قصاب، بزاز اور ڈاکٹر کی آمدنی ہوگی۔

اب دیکھئے ایک شخص نے مثلاً ایک ہزار روپے تنخواہ پائی تو یہ آدمی اس مخصوص میلانِ بچت کے تحت ۶۶۶/- روپے تو خرچ کر دے گا اور ۳۳۳/- روپے بچائے گا۔ اس کا ۶۶۶/- روپے کا خرچ دوسروں کی آمدنی ہے۔ اب یہ دوسرے لوگ بھی ۶۶۶/- روپے دبا کر نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ اس میں سے اسی میلان بچت کے تحت ۴۴۴/- روپے خرچ کر دیں گے جو دوسروں کی آمدنی ہوگی۔ اس طرح قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ ایک ہزار روپیہ کا خرچ کئی مراحل[1] کے بعد قومی آمدنی میں تین ہزار روپے کے اضافہ کا سبب بنے گا۔ اور یہ خرچ یا قومی آمدنی میں اضافہ بالآخر ان لوگوں کی جیب میں چلا جائے گا جو اشیائے صرف پیدا کرتے ہیں۔

---

[1] قومی آمدنی میں اضافہ کی یہ رفتار علم معاشیات میں اصولِ مضارب Principle of Multiplier سے واضح کی جاتی ہے۔

اب اگر یہی معاشرہ اپنی بچت ۱/۲ میں سے آدھا زکوٰۃ و صدقات کی صورت میں غرباء میں تقسیم کر دے یعنی میلان صرف ۵/۶ ہو جائے اور میلان بچت ۱/۶ رہ جائے تو اتنے ہی مراحل گذرنے کے بعد قومی آمدنی میں ۶۰۰۰/- روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر میلان صرف بڑھ کر ۹/۱۰ ہو جائے اور میلان بچت اور بھی کم یعنی ۱/۱۰ رہ جائے تو اتنے ہی مراحل گذرنے کے بعد قومی آمدنی میں ۱۰،۰۰۰ روپے کا اضافہ ہوگا۔ اور یہ اضافہ پورے کا پورا اشیائے صرف پیدا کرنے والے یعنی امیر طبقہ کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ ان مراحل کو نقشہ کے ذریعہ یوں واضح کیا جا سکتا ہے:[1]

	میلان بچت ۱/۳ کے بعد قومی آمدنی میں اضافہ	میلان بچت ۱/۶ کے بعد	میلان بچت ۱/۱۰ کے بعد
پہلا مرحلہ	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰
دوسرا مرحلہ	۶۶۶	۸۳۳	۹۰۰
تیسرا مرحلہ	۴۴۴	۶۹۴	۸۱۰
چوتھا مرحلہ	۲۹۶	۵۷۸	۷۲۹
پانچواں مرحلہ	۱۹۷	۴۸۱	۶۵۷
	—	—	—
	—	—	—
	—	—	—
آخری مرحلہ	۳۰۰۰	۶۰۰۰	۱۰،۰۰۰

یہ رقم جو خرچ کے بعد قومی پیداوار میں مزید اضافہ کا سبب بنی ہے یعنی دوسری صورت میں پہلی سے مزید ۳۰۰۰/- روپے کا اضافہ اور تیسری صورت میں مزید ۷۰۰۰/- روپے کا اضافہ ہے، یہ سب کچھ اشیائے صرف پیدا کرنے والے طبقہ یعنی سرمایہ دار کے پاس پہنچ جائے گا۔ اور یہ اس کا حقیقی اور ذاتی

---

[1] اصول معاشیات (گیارھواں ایڈیشن) ص ۴۱۲ از پروفیسر منظور علی شیخ۔

سرمایہ ہوگا۔ جس کے لیے اسے کسی بنک سے قرضہ لینے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سرمایہ کی رہی سہی ضرورت بنک اپنے ذاتی سرمایہ سے پوری کر دیں گے۔ اور بنکوں کو بھی کارخانہ داروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عوام سے بچتیں اکٹھی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جس کے لیے وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔

نقشہ بالا میں دوسرے مرحلہ پر دوسری صورت میں ۱۶۷/- روپے پہلی صورت سے زائد۔

(۸۳۳-۶۶۶=۱۶۷)

اسی طرح تیسری صورت میں ۲۳۴/- " " " دکھلائے گئے ہیں

گویا اتنی رقم کی مزید سرمایہ کاری غریب طبقہ میں ہوئی ہے۔ اگر اتنی ہی رقم بنک کی معرفت سرمایہ کاری میں صرف ہوتی تو کبھی اتنا اضافہ پیدا نہ کر سکتی تھی۔

رہا یہ سوال کہ یہ مراحل کتنی مدت میں طے ہوتے ہیں؟ تو اس کا انحصار دو باتوں پر ہے:

۱۔ گردشِ دولت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اگر دولت صرف متوسط اور امیر طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے تو یہ دائرہ بہت محدود ہوگا۔ کیونکہ غریب طبقہ کی تعداد زیادہ ہے۔ اور اگر یہ گردش غریب طبقہ تک بھی پہنچ جائے تو گردشِ زر کا دائرہ دگنے سے بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔

۲۔ جس طبقہ میں دولت خرچ ہو رہی ہے یا کی جا رہی ہے اس کی ضرورت کتنی شدید ہے۔ یہ ضرورت جتنی شدید ہوگی اتنی ہی دولت تیزی سے گردش کرے گی۔ اگر کسی غریب آدمی کو ایک سو روپیہ مل جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ اسے ایک آدھ دن میں ہی خرچ کر دے۔ کیونکہ اس نے اپنی ضروریات پیسہ کی کمی کی وجہ سے عرصہ سے روک رکھی تھیں۔ اور اگر یہی سو روپے کی رقم ایک امیر آدمی کو مل جائے تو عین ممکن ہے کہ یہ رقم کئی ماہ تک اس کے گھر پر یا بنک میں پڑی رہے کیونکہ اس کی ضروریاتِ زندگی پہلے سے ہی پوری ہو رہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت میں صدقات و خیرات کے ذریعہ دولت کی گردش کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور یہی حقیقی سرمایہ کاری ہے۔

گردشِ دولت کی رفتار

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر طبقہ اپنا ہی ذاتی خرچ بڑھا کر بچت کم کر دے تو کیا نظریاتی طور وہی نتائج برآمد ہوں گے جو اوپر بیان ہوئے

ہیں؟ اگر اس بات کا جواب اثبات میں ہے تو پھر بچت کو غریبوں میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ نظریاتی طور پر تو وہی نتائج برآمد ہونا چاہئیں، لیکن ان مراحل کی رفتار اتنی دھیمی ہوگی جسے
معاشرہ محسوس تک بھی نہ کر سکے گا۔ میدانِ صرف کی تنگی اور عدم ضرورت کی وجہ سے متوقع نتائج برآمد نہ
ہو سکیں گے۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم نے جہاں اسراف کو اخلاقی جرم قرار دیا ہے اور جا بجا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ
الْمُسْرِفِیْنَ کہہ کر فضول خرچی یا اپنی ذات پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے بچنے کی ہدایت فرمائی
ہے، وہاں میدانِ صرف کو تنگ رکھنے سے بھی منع فرما دیا۔ ارشادِ باری ہے:

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ ط (۵۹/۵)

"ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے امراء میں ہی گردش کرتی رہے۔"

گردشِ دولت کی رفتار کی مثال

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور اسلامی نظامِ معیشت میں گردشِ زر کی رفتار کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال
پیش کی جاتی ہے۔ معاشرے کی مثال اس گہرے پانی کی سی ہے جو کسی کھلے منہ والے برتن میں پڑا ہو۔
ہوا کی لہریں پانی کی اوپر کی سطح کو متحرک رکھتی ہیں جس کا تھوڑا بہت اثر درمیانی حصہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔
لیکن نچلا حصہ بالعموم ساکن رہتا ہے یا بہت کم اثر قبول کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال سورج کی گرمی کی بھی
ہے کہ وہ پانی کی سطح کو گرم کر دیتا ہے جس کا کچھ نہ کچھ اثر درمیانی حصہ تک بھی پہنچ جاتا ہے لیکن گہرائی والا پانی
عموماً ٹھنڈا ہی رہتا ہے یا بہت کم اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں واقع
ہوتی ہے۔ جہاں غریب کا یعنی نچلے طبقہ کا کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ روپے کی گردش صرف اسی حد
تک ہوتی ہے کہ وہ بمشکل بسر اوقات کر سکتے ہیں یا اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں۔

اور اسلامی نظامِ معیشت کی مثال یہ ہے جیسے اس پانی کو نیچے سے آگ کے ذریعہ جوش دے دیا
جائے تو پانی نیچے سے اٹھ کر تمام پانی کو گرم اور متحرک کر دے گا۔ اوپر کے پانی کو نیچے آنا پڑے گا اور
نیچے کا پانی ضرور اوپر اٹھے گا۔ کیونکہ امراء کی دولت میں اسلام نے جو غریب کا حق مقرر
کیا ہوا ہے وہ صرف خیرات نہیں کہ امیر لوگ محض از راہِ مہربانی کسی پر نظرِ کرم کر کے اپنی ذمہ داری سے
عہدہ برآ ہو جائیں۔ پھر یہ بھی چاہیں کہ غریب ان کے ممنونِ احسان ہوں بلکہ یہ امراء کے اموال میں غریبوں
کا حق ہوتا ہے۔ تو جس طرح جوش کھایا ہوا پانی سارے پانی کو متحرک بنا دیتا ہے۔ اسی طرح غریب طبقہ میں سرمایہ کاری

کی تخم ریزی گردش دولت کی رفتار کو کئی گنا تیز تر کر دیتی ہے۔ اور یہ تو علم معاشیات کا مسئلہ اصول ہے کہ گردشِ دولت کی رفتار جتنی تیز ہوگی، معاشرہ کی معیشت اسی رفتار سے مضبوط ہوتی جائے گی۔ لہٰذا اسلامی نظام معیشت میں صنعت کار یا تاجر کو ایسے حیات بخش خون کی ضرورت ہی نہیں رہے گی جس کی بنیاد سودی بیعتوں پر ہو۔

سود کی اقسام اور مختلف شکلیں

سود کی حرمت اور حامیان سود کے دلائل و اشکالات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم سود کی مختلف قسموں کا ذکر کریں گے۔

سود کی بالکل سادہ اور معروف شکل یہ ہے۔ کہ مثلاً ا، ب سے ایک سو روپے ایک سال کیلیے قرض لیتا ہے اور پندرہ فیصد شرح سود طے ہوتی ہے۔ تو ا ایک سال گزرنے پر ایک سو روپے اصل رقم جمع پندرہ روپے سود کل ایک سو پندرہ روپے ب کو واپس کر دے۔ یہ صورت سود مفرد کہلاتی ہے۔ اب اگر ا سال گزرنے پر اصل زر اور سود ادا نہیں کر سکا۔ تو ب اصل زر اور سود کی مجموعی رقم یعنی ایک سو پندرہ روپے کو اصل زر شمار کر کے اسے مزید مہلت دے دے گا۔ اسے عام زبان میں سود مرکب یا سود در سود کہتے ہیں۔ سود مفرد کی مدت ایک سال بھی ہو سکتی ہے، چھ ماہ بھی، تین ماہ بھی حتیٰ کہ اگر ضرورت مند سخت مجبور ہے تو ایک ماہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح سود مرکب کی رقم سود مفرد سے بہت زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً۔ (۳/۱۳۰)

"اے ایمان والو! بڑھوتری در بڑھوتری والا سود مت کھاؤ۔"

سود کی تیسری قسم منی کاٹا یا ڈس کاونٹ (DISCOUNT) ہے۔ اس میں معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ مثلاً ا نے ب سے کوئی چیز ایک ہزار روپے میں تین ماہ کے وعدہ پر خریدی اور اس کو تحریر لکھ کر دے دی۔ اب ا کوئی اعتماد شخص یا فرم یا گورنمنٹ بذاتِ خود ہے جس کی تحریر ہنڈی، تمسک یا پوسٹ ڈیٹڈ چیک کی صورت میں ہے جسے لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ مگر ا کو فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔ وہ یہ دستاویز لے کر کسی بنک یا کسی شخص مثلاً ج کے پاس جاتا ہے تو ج کہتا ہے کہ میں یہ رقم دستاویز

ادا کر دیتا ہوں ۔ مگر پانچ فیصد کاٹ لوں گا ۔ معاملہ طے ہونے پر وہ ا کو ۹۵۰ روپے فوراً ادا کر دیتا ہے اور ۵۰/- روپے کاٹ لے لیتا ہے ۔ یہ بھی خاص سُود ہے اور تجارتی حلقوں میں اس قسم کا سُود بھی مروج ہے ۔

رِبَا النَّسِیْئَہ سُود کی یہ تینوں صُورتیں بالعموم معروف اور مروج ہیں ۔ ان تمام صورتوں میں زائد رقم چونکہ مدّت یا مہلت کے عوض لی دی جاتی ہے ۔ لہٰذا ایسے سود کو شرعی اصطلاح میں ربا النسیئہ کہا جاتا ہے (یعنی مدت یا ادھار کی وجہ سے سُود) ۔

رِبَا الفضل مندرجہ بالا اقسامِ سُود کے علاوہ سُود کی ایک اور قسم بھی ہے جس سے صرف اسلام ہی نے متعارف کرایا ہے اور وہ ہے رِبَا الفضل ۔ ایسا سُود جس میں مدت بھی نہ ہو اور جنس میں کمی بیشی بھی ہو ۔ مثلاً ا کے پاس ناقص قسم کی گندم ہے اور ب کے پاس اچھی قسم کی ۔ ا ۔ ب سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے چار کلو گندم لے لو ۔ اور اس کے عوض اپنی گندم ۳ کلو دے دو ۔ اور وہ دونوں آپس میں لین دین کر لیتے ہیں ۔ ایسا لین دین نہ بظاہر سُود معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی دنیا اسے سُود شمار کرتی ہے ۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ب نے ا سے جو زائد ایک سیر گندم لی ہے ۔ تو یہ بھی اسی جنس میں بغیر مدت کے زیادتی ہے ۔ لہذا یہ بھی سُود ہے اور ا اور ب دونوں سُودی لین دین کے مجرم ہیں ۔ اب ارشادات نبوی ملاحظہ فرمائیے ۔ حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس برنی کھجور (اعلیٰ قسم کی کھجور) لے کر حاضر ہوئے تو آپؐ نے پوچھا یہ کھجوریں کہاں سے آئیں ؟ حضرت بلالؓ کہنے لگے : ہمارے پاس ناقص قسم کی کھجور تھی تو میں نے اپنی دو صاع (ٹوٹہ) کھجور کے بدلے ایک صاع کا سودا کر لیا ۔ تو آپ نے فرمایا :

اَوَّہ اِعَیْنَ الرِّبَا عَیْنَ الرِّبَا ، لَاتَفْعَل ولکن اذا اردت ان تشتری فبع التمر ببیع اٰخر ثم اشتر بِہٖ [1]

" اوہ ! خالص سُود ، خالص سُود ۔ ایسا مت کرو ۔ ہاں جب ایسا ارادہ ہو تو اپنی کھجور الگ بیچو اور پھر دوسرا سودا کر کے اپنے لیے خرید لو ۔

---

[1] بخاری کتاب الوکالۃ ۔ باب اذا باع الوکیل شیئا نیز کتاب البیوع ۔ باب بیع الخلط من التمر

اب دوبارہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ:

سمعتُ رَسُوْل اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن شری التمر بالرطب فقال اینتقص الرطبُ اذا یَبِسَ؟ فقال نعم، فنھاہ عن ذٰلک[1]

"میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تازہ کھجور کے عوض خشک کھجور خریدنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تازہ کھجور خشک ہو کر وزن میں کم ہو جاتی ہے؟ حضرت سعدؓ نے کہا ہاں۔ تو آپ نے ایسے سودے سے منع فرما دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس براہِ راست تبادلے سے کیوں منع فرمایا جبکہ نتیجہ پھر بھی (یعنی ناقص جنس فروخت کر کے اس رقم سے اچھی جنس خریدنے پر بھی) اسی کے لگ بھگ ہی رہتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ایک تو لگ بھگ والی بات کو ختم کرنا چاہتا ہے کہ فریقین میں سے کسی کو تھوڑا بہت بھی نقصان نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ایسے براہِ راست لین دین میں "زیادہ ستانی" کی ہوس کو فروغ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث نمبر ۱ میں اگر حضرت بلالؓ دو صاع ناقص کھجور منڈی میں بیچتے پھر اس رقم سے برنی کھجور خریدتے تو گمان غالب یہی ہے کہ آپ کو ایک صاع سے زیادہ کھجور مل سکتی تھی۔

ربا النسیئۃ اور ربا الفضل کی مرکب شکلیں

گویا ایک ہی جنس میں، خواہ یہ جنس روپیہ ہو یا گندم ہو یا کوئی اور چیز ہو، اگر زیادتی مدت کے عوض یا ادھار کی شکل میں ہو تو وہ ربا النسیئہ ہے اور اگر بلا مدت یعنی دست بدست لین دین میں ہو وہ ربا الفضل ہے۔ اب اگر ایک ہی جنس کے لین دین میں ادھار اور کمی بیشی دونوں باتوں کو شامل کر لیا جائے تو لین دین کی بیسیوں شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں اور ان سب میں کسی نہ کسی طرح سُود کا عنصر شامل ہوگا۔ لہٰذا آپ نے ایک نہایت جامع قسم کا ارشاد فرمایا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب اشتراء التمر بالرطب۔

الذهبُ بالذهبِ والفضةُ بالفضةِ والبُرُّ بالبُرِّ والشعيرُ بالشعيرِ والتمرُ بالتمرِ والملحُ بالملحِ مثلاً بمثلٍ يداً بيدٍ فمن زادَ اَوِ استزادَ فقد ربٰی، الآخِذُ والمُعطِی فیہ سَوَاءٌ[1]

"سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے، گندم گندم کے، جَو جو کے، کھجور کھجور کے، نمک نمک کے عوض وزن یا ماپ میں برابر برابر اور نقد بہ نقد ہوں تو بیع جائز ہے۔ تو جس شخص نے زیادہ لیا یا زیادہ کا مطالبہ کیا اس نے سُود کھایا۔ اور لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

اس حدیث میں چھ اجناس شمار کی گئی ہیں۔ سونا چاندی، گندم، جَو، کھجور اور نمک۔ اگر ان کا برابر برابر اور دست بدست لین دین ہو تو ٹھیک ورنہ بیع درست نہ ہوگی۔ حدیث میں مثلاً بمثل کے الفاظ ربا الفضل کی نہی کے لیے اور یداً بیدٍ کے الفاظ ربا النسیئہ کی نہی کے لیے آئے ہیں اور ان میں جو چھ اجناس شمار کی گئی ہیں ان میں سے سونا اور چاندی تو زرِ مبادلہ ہیں اور باقی چار اہم خوردنی اجناس ہیں۔ بخاری کی ایک دوسری روایت میں منقہ کا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ وہاں انگور بھی بکثرت پیدا ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور کو بغور سمجھ لینا چاہیے:

۱۔ اگر جنس تبدیل ہو جائے تو لین دین درست ہوگا۔ مثلاً ۳ کلو گندم کا تبادلہ ۴ کلو جَو سے، یا ایک کلو کھجور کا تبادلہ ۲ کلو نمک کے عوض۔ اس میں برابر برابر کی قید تو ختم ہو جائے گی مگر نقد بہ نقد کی بحال رہے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ۳ کلو گندم تو آج لے لے اور ۴ کلو جَو ۳ ماہ بعد دے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فاذا اختلف هذه الاصنافُ فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بیدٍ[2]

"پھر اگر جنس مختلف ہو جائے تو جیسے چاہو لین دین کر لو۔ بشرطیکہ یہ تبادلہ دست بدست

---

[1] مسلم کتاب المساقات والمزارعت۔ باب الربا۔

[2] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی الصرف۔

(یعنی نقد بہ نقد) ہو۔

۲۔ اگر ۳ کلو گندم کی، جَو سے مثلاً تین ماہ کے ادھار پر بیع کرنا چاہے تو یہ اس صورت میں جائز ہو گی کہ بیع کے دن گندم کا نرخ دریافت کر کے قیمت لگائی جائے اور تین ماہ بعد اس رقم کے جتنے جَو مارکیٹ ریٹ کے حساب سے آسکتے ہوں، اتنے ہی لیے جائیں لے

ایک شبہ اور اس کا ازالہ اس حدیث سے بھی ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ہی جنس مثلاً ایک کلو گندم کا ایک ہی کلو گندم سے تبادلہ کرتا کون ہے؟ اور اس کا فائدہ کیا ہے کہ کوئی ایسا تبادلہ کرے؟ تبادلہ یوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک فریق مثلاً ا کی گندم بہتر ہے اور دوسرے فریق مثلاً ب کی گندم ناقص ہے تو اس صورت میں ب تو ضرور تبادلہ پر آمادہ ہو جائے گا مگر ا کو یہ بات کب گوارا ہو گی۔ اِلّا یہ کہ وہ احسان سمجھ کر ایسا گوارا کر لے۔ اس ارشاد مبارک سے آپؐ کی مراد بھی یہی ہے کہ اگر ایک بھائی دوسرے کے لیے اتنا احسان کر سکتا ہے تو کرے ورنہ ایسا سودا نہ کیا جائے۔ گویا یہ حدیث کمی بیشی کے لین دین کی انتہائی ممانعت پر دلالت کرتی ہے۔ جس کے الفاظ اس ممانعت کی تاکید مزید کر رہے ہیں۔

نمبر۲ اور اس کا ازالہ اور ایک ضرورت مند دوسرے سے یہ کہتا ہے۔ کہ آج مجھے ایک من گندم دے دو۔ دو ماہ بعد جب گندم پک جائے گی تو میں ادا کر دوں گا۔ یہ صورت صرف جائز ہی نہیں بلکہ بہت بڑا کارِ ثواب ہے۔ حالانکہ اس میں جنس ایک ہے اور وزن بھی برابر ہے۔ مگر تقدیہ والی شرط پوری نہیں ہو رہی۔ اس لحاظ سے تو یہ بیع ناجائز ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ بیع نہیں بلکہ قرض حسنہ بن گیا۔ جس کے احکام بالکل جدا ہیں۔ یہ دراصل بیع کے احکام میں ضرورت مندوں کے لیے یہ ایک رخصت ہے۔ جیسے کہ بیع نہیں عرایا میں بھی غریبوں کے لیے رخصت رکھی گئی ہے۔

سُود کے چور دروازے

۱۔ مقروض سے ہدیہ وصول کرنا سُود کا چور دروازہ ہے:

لے مشکوٰۃ۔ کتاب البیوع۔ باب المنہی عنہا عن البیوع۔ فصل ثانی

حضرت ابو بردہؓ بن ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو عبداللہ بن سلامؓ سے ملا۔ وہ مجھے کہنے لگے:

انك بارض فيها الربوا فاش فاذا كان لك على رجلٍ حقٌ فاهدى اليك حمل تبنٍ او حمل شعيرا و حمل قتٍ فلا تاخذه فانه ربوا[1]

"آپ ایسی سرزمین میں رہتے ہیں جہاں سُود کا علانیہ رواج ہے۔ سو اگر تیرا کسی شخص پر حق (قرضہ) ہو اور وہ تجھے بھُس کا گٹھا، یا جَو یا گھاس کا گٹھا ہدیہ دے تو مت قبول کر کیونکہ وہ سُود ہے۔"

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا اَقْرَضَ الرجلَ فلَا تَاْخُذْ هَدِيَّةً[2]

"جب کوئی شخص کسی دوسرے کو قرضہ دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔"

ہاں اگر مقروض اور قرضخواہ کے درمیان اس قرضہ سے پہلے بھی ایک دوسرے کو ہدیہ دینے دلانے کے مراسم ہوں تو پھر مقروض سے ہدیہ لے لینے میں کوئی حرج نہیں[3]

(۲)۔ سفارش کرنیوالے کو بھی ہدیہ قبول کرنا ممنوع ہے اور یہ سُود ہے

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من يشفع لِاَحَدٍ شفاعةً فاهدٰى له هديّةً عليها فتقبّلها فقد اَتٰى بابًا عظيمًا من ابواب الربٰوا[4]

"جو شخص کسی دوسرے کی سفارش کرے۔ پھر وہ اس سفارش کے عوض اس سفارش کرنے والے کو کوئی تحفہ بھیجے اور وہ اسے قبول کرلے تو وہ سُود کے دروازوں میں سے ایک

---

[1] بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب عبداللہ بن سلام۔ ص ۵۳۸

[2] رواہ البخاری فی تاریخہ

[3] ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی الھدیۃ لقضاء الحاجۃ

[4] ایضاً

۳۔ نقد اور اُدھار کی الگ الگ قیمت ممنوع ہے یعنی اُدھار کی قیمت میں زیادتی سود ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

فَنَهَى رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم عن بَيْعَتَيْنِ فِي بيعةٍ [1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع فرمایا ہے۔"

اور ابوداؤد میں روایت یوں ہے:

من باع بیعتین فی بیعةٍ فَلَهُ اَوْكَسُهُمَا اَوِ الرِّبا [2]

"جس نے ایک چیز دو مختلف صورتوں میں بیچی تو خریدار کم قیمت والی کا مستحق ہے یا پھر وہ سُود ہے۔"

ان احادیث سے معلوم ہوا۔ کہ ایک ہی چیز کی نقد قیمت کم اور اُدھار قیمت زیادہ رکھنا ممنوع ہے اور جو رقم نقد قیمت سے زائد ہوگی وہ سُود ہے۔ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ ایک بیع میں دو بیع کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ ایک ہی شخص سے یہ کہا جائے کہ مثلاً اگر نقد لو تو چار سو روپے اور چھ ماہ کے اُدھار پر لو تو ساڑھے چار سو روپے۔ لیکن اگر کوئی شخص نقد کی قیمت ہی الگ مقرر کرتا ہے اور نقد والوں کو چار سو روپے میں دیتا ہے اور اُدھار کی قیمت میں ساڑھے چار سو روپے رکھتا ہے اور اُدھار والوں کو اس نرخ پر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی شخص سے دو بیع نہیں ہیں۔

اقساط پر فروخت ہونے والی اشیاء

لیکن ہم اس جواب پر مطمئن نہیں کیونکہ ہمارے ہاں اقساط پر اشیاء فروخت کرنے کا عام رواج ہے۔ اور یہ ایک آدمی سے ایک ہی بیع ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی باقی ماندہ اقساط کی مجموعی رقم یک مشت ادا کر دے تو اقساط کی نسبت سے باقی قیمت میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اس اُدھار میں سُود شامل نہ تھا۔ تو اقساط کی نسبت سے مقررہ نرخ پر رقم پھر کیسے مل جاتی ہے؟

---

[1] ترمذی۔ ابواب البیوع۔ باب فی النہی عن بیعتین فی بیعۃٍ۔

[2] ابوداؤد۔ کتاب البیوع باب فیمن باع بیعتین فی بیعۃٍ۔

ہاں اگر کسی نے ایک چیز تین ماہ کے اُدھار پر خریدی اور تین ماہ گزرنے سے پیشتر ہی خریدار کو رقم میسّر آگئی اور اس نے وہ رقم بائع کے حوالہ کر دی۔ اور بائع خوش ہو کر اپنی مرضی سے کچھ رقم چھوڑ دے یا واپس کر دے، جو اس نے طے نہ کی تھی، تو یہ صورت جائز ہے اور اس میں کچھ قباحت نہیں۔

۴- بیع عینہ: یہ ایسی بیع ہے جس میں حیلہ سازی کے ذریعہ سُود کو بیع کی شکل دے کر اسے جائز بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ مثلاً ا کو کچھ نقد رقم کی ضرورت پیش آگئی لیکن اس کے پاس نقد رقم موجود نہیں اور وہ سُود میں ملوث بھی نہیں ہونا چاہتا تو وہ ب سے کوئی چیز مثلاً ایک گھوڑا پانچ ہزار روپے میں ایک سال کے وعدہ پر خریدتا ہے۔ پھر ایک دو دن بعد ا وہی گھوڑا ب کے پاس ہی چار ہزار روپے نقد میں فروخت کر کے اس سے نقد چار ہزار روپے وصول پا لیتا ہے۔ اور سال بعد ا کو پانچ ہزار روپے ادا کر دیتا ہے۔ اس حیلہ بازی سے ا کو فوراً رقم میسّر آگئی اور ب کو ایک سال بعد ایک ہزار روپے منافع مل گیا جو درحقیقت چار ہزار روپے کا ایک سال کا سُود تھا۔ اور گھوڑے کی بیع کو درمیان میں لا کر سُود کو حلال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بیع عینہ کہلاتی ہے[1] اور یہ خالص سُود ہے۔ اور ا اور ب دونوں ایک جیسے گنہگار ہیں۔

اس سے ملتی جلتی وہ شکل ہے۔ جس کے ذریعہ پاکستان کے بنکوں میں شراکتی کھاتوں کو سُود سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

موجودہ دور میں چند معروف سُودی لین دین

آج کل سُود پوری قوم کے رگ و ریشہ میں کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے جس سے ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو رہا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ:

لیاتین علی الناس زمان لایبقی احدٌ اِلّا اکل الربوا فان لم
یَاکلہ اصابہ من بخارہ وَیُروی من غبارہ[2]

---

[1] موطا امام مالک۔ کتاب البیوع۔ باب العینۃ۔
[2] نسائی۔ کتاب البیوع۔ باب اجتناب الشبہات فی الکسب

"لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ہر کوئی سُود کھانے والا ہوگا۔ اور اگر سُود نہ کھائے تو بھی اس کا بخار (اور دوسری روایت میں اس کا غبار) اسے ضرور پہنچ کر رہے گا"!

آج ایک مسلمان اگر پوری نیک نیتی سے بچنا بھی چاہے تو اسے کئی مقامات پر الجھنیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اسوقت تک نئی گاڑی خریدنے کے بعد چلا نہیں سکتا۔ جب تک اس کا بیمہ نہ کرائے۔ اور بیمہ کا کاروبار کیسا ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اسی طرح اپنی بچت یا زائد رقم کو کہیں محفوظ رکھنے کا معاملہ ہے۔ جس کی ضرورت تقریباً ہر شخص کو پیش آتی ہے اور لامحالہ اسے بنک کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود سُود نہ بھی لے تو بھی بنک تو اس کے پیسہ سے سودی کاروبار کرتا ہے۔

تاجر پیشہ حضرات بنک سے تعلق رکھے بغیر نہ مال برآمد کر سکتے ہیں نہ درآمد۔ ان کے لیے آسان راہ یہی ہے کہ وہ بنک سے ایل۔ سی (LETTER OF CREDIT) یا اعتماد نامہ حاصل کریں۔ اس میں بنک کا بھی فائدہ کہ اسے سُود بغیر رقم دیے ایک مدت تک سود ملتا ہے اور تاجر کا بھی فائدہ کہ پوری رقم کا کچھ حصہ ہی ادا کرنے سے اس کا مال درآمد ہو جاتا ہے۔ اور بقایا رقم وہ مال آنے کے بعد ادا کرتا ہے۔

اب اگر کوئی شخص سُود سے بچنا چاہے بھی تو اسے خاصی مشکلات پیش آتی ہیں۔ گویا آج کے دور میں حرام کی راہیں وافر اور آسان بنا دی گئی ہیں اور حلال کی کمیاب اور دشوار تر۔ اب کون اتنا متقی ہوگا جو دنیوی لحاظ سے نقصان میں بھی رہے اور دشواریاں بھی جھیلے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال منڈیوں کے تاجروں کی ہے۔ ان میں شاید ہی کوئی سُودی لین دین سے بچا ہوا ہوگا۔ اندریں صورت حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آرہی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص سُودی لین دین نہ بھی کرے تو بھی اس کا غبار اسے پہنچ کے رہے گا۔

اس تمہید کے بعد اب ہم چند ایسے ہی سُودی معاملات کا ذکر کریں گے

۱۔ بیمہ پالیسی

بیمے کی ابتدا خالص انسانی ہمدردی کے جذبہ سے شروع ہوئی تھی۔ تقریباً ۱۴۰۰ء میں اٹلی کے تاجروں میں سے ایک تاجر کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا اور وہ انتہائی تنگ دست ہو گیا۔ دوسرے

تاجروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے لیے کچھ رقم اکٹھی کر کے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

چونکہ ایسے حوادث کا آئندہ بھی امکان تھا، لہٰذا ان تاجروں نے آپس میں ایک تجویز منظور کی کہ آئندہ تمام تاجر ہر ماہ ایک معین رقم ادا کر دیا کریں تاکہ اس قسم کے حوادث کے نقصان کا کسی حد تک تدارک کیا جا سکے۔

لیکن آہستہ آہستہ امداد باہمی کا یہ ادارہ کاروباری شکل اختیار کرنے لگا اور ایسے ادارے کا نام انشورنس کمپنی (COMPANY INSURENCE) تجویز ہوا۔ انشورنس "یقین دہانی" کو کہتے ہیں بیمہ اسی انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے۔ گویا بیمہ کمپنی ایک ایسا ادارہ ہے جو آفات و حوادث کے وقت نقصان کی تلافی کی یقین دہانی کراتا ہے۔

ابتداءً املاک (مثلاً بس، ٹرک، جہاز، عمارات وغیرہ) کا بیمہ شروع ہوا۔ بعد ازاں انسانی زندگی کا بھی بیمہ شروع ہو گیا۔ آج کل اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہو چکا ہے۔ انسان کے ایک ایک عضو کا بیمہ جانوروں کا بیمہ اور بعض ذمہ داریوں (مثلاً بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ) کا بھی بیمہ کیا جاتا ہے۔

بیمے کے کاروبار کو بیشتر ممالک میں بنکوں کی طرح حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور بعض اوقات تو مجبوراً زندگی اور املاک کا بیمہ کرانا پڑتا ہے ۱۹۷۳ء سے پہلے پاکستان میں کمپنیاں نجی طور پر بیمے کا کاروبار کرتی تھیں لیکن ۱۹۷۳ء میں حکومت نے ان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی بے شمار کمپنیوں کو مدغم کر کے سٹیٹ لائف کے نام سے اس کاروبار کو مزید فروغ بخشا۔ آج کل ہر سرکاری و نیم ملازم، نیز ہر صنعتی اور تجارتی ادارے کے ملازم کا بیمہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی موت یا حادثے کی صورت میں مقررہ رقم اس کے ورثا کو مل جاتی ہے جو حکومت یا متعلقہ ادارہ ادا کرتا ہے۔

بیمے کی شرائط

بیمے کی جانے والی اشیاء میں سے چونکہ زندگی کا بیمہ ہی سب اہم ہے۔ لہٰذا ہم اسی کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔

ایک شخص اگر اپنی زندگی کا بیمہ کرانا چاہے تو اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر اس کی صحت کا معائنہ کر کے اندازہ کرتا ہے کہ یہ شخص اتنی مدت مثلاً مزید بیس سال تک طبعی طور پر زندہ رہنے کے قابل ہے۔ اب بیمہ کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان ایک معاہدہ طے پاتا ہے۔ بیمہ دار جتنی رقم بیمہ کرانا چاہتا ہے۔

اسے سالانہ اقساط میں تقسیم کر کے بالاقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے۔ شرائط بالعموم یہ ہوتی ہیں:

۱۔ اگر بیمہ دار اپنی مدت مجوزہ تک زندہ رہے اور اقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے تو اس مدت کے اختتام پر اس کو اس کی تمام جمع شدہ رقم مع مقررہ شرح کے سود جسے بیمہ کمپنی کی اصطلاح میں ایک معصوم سا نام "بونس" (فالتو رقم) دیا گیا ہے۔ ادا کر دی جاتی ہے۔

۲۔ اگر دورانِ مدت بیمہ، بیمہ دار طبعی طور پر یا کسی حادثہ کے نتیجہ میں مر جاتا ہے تو اب تک اس کی جمع شدہ رقم مع سود اس کے ورثاء کو، جنہیں وہ خود ہی نامزد کر چکا ہوتا ہے، مل جاتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ادائیگی اقساط کی مدت جتنی کم ہوگی، یا بالفاظ دیگر بیمہ دار جتنی جلدی مرتا ہے۔ شرحِ سود اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

۳۔ اگر بیمہ دار کسی خاص مجبوری سے یا بالارادہ اقساط دینا چھوڑ دے تو پہلی ادا کردہ اقساط بحق کمپنی ضبط متصور ہوتی ہیں۔ اِلّا یہ کہ پالیسی پھر سے شروع کر دی جائے اور غیر ادا شدہ اقساط یکمشت ادا کر دی جائیں۔

آج کل اس شق میں یہ ترمیم کی گئی ہے کہ پالیسی ختم کرنے والے کو کل ادا شدہ رقم کا ۶۰٪ رقم واپس مل جاتی ہے۔

• املاک یا بیمے کی دوسری اقسام میں بھی اس سے ملتی جلتی شرائط طے پاتی ہیں۔

بیمہ پالیسی کا اسلامی نقطہ نظر سے تجزیہ

تھوڑا سا غور کرنے پر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بیمہ پالیسی چند در چند شرعی جرائم و منہیات سے ترکیب پاتی ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ شرط نمبر ۱ میں اصل ادا شدہ رقم سے زائد (مقررہ شرح سے) جو رقم ملتی ہے وہ سود ہے جس کی حرمت میں کسی قسم کا شک نہیں۔

۲۔ شرط نمبر ۲ کے مطابق جو آدمی ایک آدھ قسط ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے تو اسے اس کی ادا کردہ رقم سے کئی گنا زائد رقم مل جاتی ہے، جو جوئے (میسر) سے مشابہت رکھتی ہے۔ تھوڑی سی محنت پر اتفاقی طور پر بہت زیادہ رقم مل جانے کو ہی میسر کہا جاتا ہے جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے

۳۔ شرط نمبر ۳ شرعی احکام وراثت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص اپنی بیوی یا بیٹے

کو اپنا وارث نامزد کرتا ہے تو کمپنی اسی خاص آدمی کو رقم حوالہ کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ جبکہ عام حالات میں اگر کوئی شخص ایسی غلط وصیت کر بھی جائے تو وہ قانوناً غیر مؤثر ہوتی ہے۔ غلط قسم کی وصیت بجائے خود ایک گناہ ہے۔ قرآن کے واضح احکام کی موجودگی میں ایسی غلط وصیت پر نہ کوئی عمل پیرا ہوتا ہے نہ دوسرے وارث اسے ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی قانوناً وہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بیمہ کمپنی کی شرائط کی رُو سے۔ جسے عموماً حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ نامزد وارث دوسرے وارثوں کا حق غصب کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۴۔ ایسے واقعات بھی آتے ہیں کہ نامزد وارث بیمہ دار کو محض حصول زر کی خاطر، کسی حیلے بہانے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اسے یہ تو پہلے ہی یقین ہوتا ہے کہ دوسرے وارث اس رقم سے حصّہ نہیں بانٹ سکتے۔ "یہ یقین دہانی" اسے قتل جیسے جرم کے ارتکاب پر دلیر بنا دیتی ہے۔ ایسی ہی صورت بیمہ کی دوسری شکلوں میں پیش آسکتی ہے۔ مثلاً املاک کے بیمہ دار کئی دفعہ انہی املاک کو اپنے ہاتھوں تلف کرتے دیکھے گئے ہیں کہ وہ کمپنی سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔

۵۔ شرط نمبر ۳ کے مطابق اگر کوئی شخص پالیسی جاری نہیں رکھ سکتا یا رکھنا نہیں چاہتا تو اس کی جمع شدہ رقم کا بحق ضبط کر لینا شرعی احکام کے خلاف ہے۔

۶۔ شرط نمبر ۳ کے مطابق نہ تو بیمہ دار کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی قسطیں ادا کرے گا اور نہ بیمہ کمپنی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا وصول کر سکے گی اور اسے کیا کچھ ادائیگی کرنا پڑے گی۔ لہٰذا یہ "اندھا سودا" یا بیع غرر ہے جو قطعاً ناجائز ہے۔

بیمے کے مزعومہ فوائد اور ان کا شرعی متبادل حل

بیمہ کے درج ذیل فوائد بیان کئے جاتے ہیں اور سماجی تحفظ کے نام سے انہیں مقبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے:

۱۔ رقم آسان اقساط کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے اور معینہ مدت کے بعد منافع (سود) سمیت واپس مل جاتی ہے گویا سرمایہ بھی محفوظ رہتا ہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ حوادث کی صورت میں نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔

۳۔ متوفی کا بڑا بیٹا اگر خود سر ہو تو وہ جائز وارثوں یعنی اور چھوٹے بھائیوں کا حق غصب کرنے

کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ بیمہ کمپنی متوفی کی آرزو کے مطابق اس کے نامزد کردہ وارث یا وارثوں کو یہ رقم ادا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ ذمہ داری کے بیمہ کی صورت میں بیمہ کمپنی ایسی اولاد کی اعلیٰ تعلیم اور شادیوں کے اخراجات کی کفیلی ہوتی ہے۔

۴۔ عام حالات میں ایک غریب آدمی کے لیے کچھ رقم پس انداز کرنا یا ترکہ چھوڑنا کچھ مشکل سا کام ہے۔ پالیسی کی صورت میں تھوڑی تھوڑی جمع شدہ رقم یتیموں اور بیواؤں کا سہارا بنتی اور آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہے۔

تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا تمام تر صورتِ احوال سرمایہ دارانہ نظام ایک مخصوص ذہن عطا کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنا ہی فائدہ سوچتا ہے اور دوسرے کی احتیاج اور مشکلات سے بے نیاز رہتا ہے اور یہ بات اسلامی معیشت کی رُو سے سراسر غلط ہے۔ جس کا پہلا سبق ہی یہ ہے کہ :

لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ[1]

"کوئی شخص اس وقت تک ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

لہٰذا اسلامی نظامِ معیشت میں ان مندرجہ بالا صورتوں میں سے کچھ تو پیدا ہی نہیں ہوتیں، کیونکہ بیت المال میں وہ یقین دہانی موجود ہے جو ایک بیمہ کمپنی کروا سکتی ہے۔ اور اگر کچھ ہوتی ہیں ان کا واضح حل موجود ہے

اب ہم علی الترتیب مندرجہ بالا "قواعد" کا جائزہ لیں گے:۔

۱۔ جہاں تک سرمایہ کے جمع ہونے، اس کے تحفظ اور اس میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ کام کاروبار یا تجارت کی صورت میں بیمہ یا بنک سے بہتر بھی ہو سکتا ہے۔ سود پر رقم لینے والے بنک اور بیمہ کمپنیاں بھی بالآخر کاروبار ہی کرتے ہیں جو ہمارے دعویٰ کا واضح ثبوت ہے۔ لہٰذا اصل مسئلہ ان اداروں کو سود سے پاک کرنے کا ہے نہ کہ عوام کو سودی کاروبار میں پھنسانے کا۔

---

[1] بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب ای الاسلام افضل۔

آج کے دور میں بھی کئی مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں بلا سُود کاروبار کر رہی ہیں اور اب تو کئی ایسے بنک بھی قائم ہو چکے ہیں جو تجارت کی بنیادوں پر چل رہے ہیں۔ ایسے اداروں میں رقوم جمع کرانے سے جہاں تمام مطلوبہ فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں سُود کی لعنت سے بھی انسان کو نجات مل جاتی ہے۔

۲۔ حوادث کے موقع پر نقصان کی تلافی: اسلامی نظامِ معیشت میں ایسی صورتوں میں حسبِ ضرورت بیت المال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب امداد فراہم کرے۔ موجودہ دور میں اس کا حل وہی ہے جہاں سے بیمے کی ابتدا ہوئی تھی۔ مثلاً بسوں اور ٹرکوں کے مالک ایسی انجمن بنائیں جس میں وہ ماہانہ چندہ اور عطیات ادا کریں پھر اس رقم کو تجارت پر لگائیں اور منافع تقسیم کرنے کے بجائے حوادث کی تلافی کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ بلکہ حسبِ ضرورت اصل سرمائے سے بھی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔ کسی بس یا ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو جائے یا جانی نقصان کی وجہ سے کچھ معاوضہ ادا کرنا پڑے تو اس فنڈ سے ادا کر دیا جائے۔

یہ طریقہ اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ حوادث پہ کنٹرول کی فکر خود انجمن کو ہوگی۔ وہ خود ایسی تجاویز مرتب کرے گی جس سے حادثات کم سے کم رونما ہوں۔ نیز ان میں رقابت کے بجائے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ علاوہ ازیں بیمہ کی صورت میں بعض مالکان خود اپنی املاک تلف کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں تاکہ وہ بیمہ کمپنی سے معقول رقم وصول کر سکیں۔ ایسے قومی معیشت کو تباہ کرنے والے جرائم سے بھی انسان کو نجات مل جائے گی۔

الغرض ہر قسم کے کاروبار کرنے والے اور پیشہ ور حضرات ایسی انجمنیں بنا کر اپنے مسائل بیمہ پالیسی سے بہتر صورت میں حل کر سکتے ہیں۔

۳۔ متروکہ مال کی تقسیم میں گڑبڑ: بیمہ کمپنی کی شرائط میں شریعت کے قانونِ وراثت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اور یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ پھر چونکہ بیمہ کمپنی حکومت کی تحویل میں ہے۔ لہٰذا ایسی رقم جو کسی نامزد وارث نے بیمہ کمپنی سے حاصل کی ہو، اسے اس سے واپس لے کر شرعی قانون کے مطابق تقسیم کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔

رہا بڑے بیٹے کے خود سر ہونے کا سوال تو ایسی صورت میں "وصیت" کا انتظام موجود ہے۔ اگر ایسا خطرہ ہو تو متوفی اپنی برادری سے یا برادری سے باہر سے بھی کسی قابلِ اعتماد اور دیانت دار آدمی کو وصی

مقرر کر سکتا ہے۔ اگر مرنے والا خود وصی مقرر نہیں کر سکا تو حاکمِ وقت یا اس کے کسی بھی نائب کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ وصی مقرر کر دے۔

وصی کے باضابطہ فرائض ہیں اور وہ ان کے لیے جواب دہ ہے۔ وصی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ ترکہ حسبِ دستورِ شریعت تقسیم کرے اور اگر بچے عیاش یا ابھی نادان ہوں تو متروکہ جائداد کو یا تو بیت المال میں جمع کرا دے یا اپنے پاس بطورِ امانت رکھے اور حسبِ ضرورت اس سے خرچ کرتا رہے اور جب حالات سازگار ہوں تو ان کا بقایا ان میں شرعی دستور کے موافق تقسیم کر دے۔ گویا وصیت کے نظام میں "ذمہ داریوں سے بچے"، کا مکمل حل بھی موجود ہے اور کسی شرعی جرم کا ارتکاب بھی نہیں کرنا پڑتا۔

وصایا کے اس نظام پر عہدِ نبوی اور دورِ صحابہ میں برابر عمل ہوتا رہا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار یہ ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت زبیر بن عوام اس" بارِ وصایت"، کے اٹھانے میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ سات جلیل القدر اصحابہ نے آپ کو وصی مقرر کیا تھا[1]

۴۔ **پس ماندگان کی امداد**:۔ ایسے یتیم اور بیوہ جن کی گزر اوقات کے لیے کچھ ترکہ نہ ہو، ان کی پرورش کی ذمہ داری میت کے اولیاء اور ورثا پر ہے اگر ان میں کوئی بھی نہ ہو یا وہ اس ذمہ داری سے غافل رہیں یا کمزور ہوں اور نبھانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ تو یہ ذمہ داری عام مسلمانوں پر بھی ہے۔ یتیم اور بیوہ کی پرورش بہت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں ساتھ والی انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

انا وکافل الیتیم کھاتین فی الجنۃ[2]

"میں اور یتیم کا پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ساتھ ساتھ ہوں گے"۔

اور اگر یہ بات بھی میسّر نہ آئے تو ان کی کفالت کی ذمہ داری بیت المال پر ہے۔

علاوہ ازیں موجودہ دور میں اس کا حل برادری کی تنظیم ہے۔ جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ کہ ہر برادری، برادری کی سطح پر اپنا بیت المال قائم کرے جس سے پس ماندگان کی وقتی امداد کے

---

[1] بیمہ زندگی از مفتی محمد شفیع صاحب ص ۵۱، ۵۲ بحوالہ ہدایہ ص ۶۷۹

[2] بخاری الادب۔ باب فضل من یعول یتیماً۔

علاوہ کئی دوسرے فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں ۔ جو بیمہ کمپنی میں میسّر نہیں آسکتے ۔

بیمہ کمپنی اور بیت المال کا تقابلی مطالعہ

اب ہم ان بیمہ کمپنیوں یا سماجی تحفظ دینے والے ادارہ کا چند پہلوؤں میں بیت المال سے موازنہ پیش کرتے ہیں :

۱ ۔ بیمہ کمپنی صرف اس شخص کی امداد کرتی ہے جو بیمہ دار ہو، عام لوگوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا، جبکہ بیت المال ہر مصیبت زدہ اور پریشان حال کی امداد کو پہنچتا ہے ۔ خواہ اس نے بیت المال میں عمر بھر ایک پیسہ بھی جمع نہ کرایا ہو یا وہ جمع کرانے کے قابل ہی نہ ہو ۔

۲ ۔ بیمہ کمپنی کے بیمہ دار یا امیر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں یا متوسط طبقہ کے جو کچھ بچت کر سکتے ہوں اور وقت آنے پر یہی لوگ بیمہ کمپنی سے فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں ۔ جبکہ بیت المال سے فیض یاب ہونے والا بالعموم غریب طبقہ ہوتا ہے جو بچت تو کیا کرے گا، اکثر مقروض ہی رہتا ہے ۔

۳ ۔ بیمہ کمپنی ایک خالص سودی کاروباری ادارہ ہے اور صرف منافع کے حصول کی خاطر یہ دھندہ کرتا ہے ۔ تعاون اور سماجی تحفظ محض ایک ڈھونگ ہے ۔ وہ جمع شدہ رقوم کے سود سے کچھ حصّہ بیمہ داروں کی نذر کرتا ہے ۔ باقی سب کچھ اس کا اپنا ہی ہوتا ہے ۔ اس کاروبار میں اس کا اپنا منافع کتنا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ۱۹۷۸ء میں امریکہ کی بیمہ کمپنیوں کو اپنے بیمہ داروں سے ۹۸ ارب ڈالر کی رقم وصول ہوئی اور اس رقم میں سے انہوں نے صرف ۴ ارب ڈالر اپنے بیمہ داروں کو ادا کئے ۔ اس طرح ان لوگوں نے ۹۴ ارب ڈالر کی رقم اپنے پاس جمع کر لی[۱]

گویا بیمہ کمپنی کا کاروبار بنکوں کے کاروبار سے بھی زیادہ نفع بخش ہے ۔ اور معیشت پر اس کے بعینہٖ وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو سود سے ہوتے ہیں ۔ یعنی عوام کی دولت سے فائدہ صرف امیر طبقہ ہی اٹھاتا ہے ۔ بالفاظ دیگر گردش دولت کا رُخ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے اور یہ اسلامی روح کی عین ضد ہے ۔

جبکہ بیت المال کوئی کاروباری ادارہ نہیں ۔ وہ صرف حاجت مندوں کی حاجت روائی کے

---

[۱] روزنامہ جنگ ۱۰ مئی ۱۹۷۹ء ۔ بحوالہ اسلام اور جدید اقتصادی نظریات ص ۴۷۶ از پروفیسر منور حسین چیمہ ۔

لیے قائم کیا جاتا ہے جس میں اغنیاء سے رقوم وصول کر کے غریبوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

۴۔ بیمہ کے نظام کو تعاون و تکافل کا نام دینا درحقیقت حقائق سے چشم پوشی ہے۔ بیمہ کمپنی ہر بیمہ دار سے علیحدہ علیحدہ دوطرفہ معاہدہ کرتی ہے۔ اور کوئی بھی بیمہ دار دوسرے بیمہ دار سے کسی اخلاقی یا قانونی رشتے میں منسلک نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے نقصان کی تلافی کے پابند ہوتے ہیں۔ نقصان کی تلافی یا بیمہ کی رقم ادا کرنے کی پابند صرف بیمہ کمپنی ہوتی ہے۔ بیمہ کمپنی کے اس تعاون و تکافل کے دعوے کے باطل ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود بیمہ کمپنی کے مالکوں تک کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی اس کمپنی کے بیمہ دار بنیں۔ گویا جن خوبیوں کا وہ دن رات پروپیگنڈہ کرتے ہیں ان پر وہ خود ایمان لاتے ہیں اور نہ ہی اس پر عمل پیرا ہونا پسند فرماتے ہیں۔

اس کے برعکس بیت المال کا یہ حال ہے کہ اسے قائم کرنے والے سب سے پہلے خود اس پر ایمان لاتے اور اس کے حصہ دار بنتے ہیں، اگر وہ اس قابل ہوں۔ اور تعاون و تکافل کی یہ صورت کہ اس معاشرہ میں اگر ایک شخص کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرا فوراً اس کی مدد کو اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیت المال کی طرف رجوع تو آخری چارۂ کار کی صورت میں ہوتا ہے۔

۲۔ پراویڈنٹ فنڈ

اسی طرح کا ایک مسئلہ سرکاری، نیم سرکاری اور بعض دوسرے تجارتی اداروں کے ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کا ہے جس میں کچھ رقم تو ملازموں کی اپنی تنخواہ سے ماہوار وضع ہوتی اور جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ سود در سود کے حساب سے اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب اس سود کی رقم کا کیا کیا جائے۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کے لیے خاصی الجھن کا سبب[1] بنا ہوا ہے۔ جو سود کو حرام سمجھ

---

[1] عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ اضطراری ہے۔ یہ حکومت یا اداروں کا یک طرفہ فیصلہ یا شرط ہوتی ہے اور ملازم اس سلسلہ میں مجبور ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات لاعلمی کی بنا پر کہی جاتی ہے۔ اگر کوئی سود نہ لینا چاہے تو اسے کوئی مجبور نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں پراویڈنٹ فنڈ کے معاہدہ فارم کی پشت پر جو شرائط لکھی ہوتی ہیں ان کی شق ۱۶ میں یہ بات وضاحت سے درج ہے کہ جو شخص سود نہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے)

کر اسے قبول کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعض لوگوں نے چند ایک مصلحتوں کے پیشِ نظر اس کو لے لینا جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ اسے اپنے استعمال میں نہ لایا جائے بلکہ :

ا ۔ اسے غریبوں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے۔

ب ۔ اگر بنک سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑے تو اس سود کی جگہ یہ رقم ادا کر دی جائے۔

ج ۔ گورنمنٹ جو ناجائز قسم کے ٹیکس عائد کرتی ہے۔ ایسی مدّات میں یہ سود کی رقم صرف کر دی جائے۔

مگر جب ہم اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ساری مصلحتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا اس گندگی سے بہر صورت پرہیز لازم ہے۔ پہلی صورت بظاہر مستحسن نظر آتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیے :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (۲/۲۶۷)

"اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی سے خرچ کرو اور ہم نے تمہارے لیے جو کچھ زمین سے نکالا ہے اس میں سے ناپاک چیز خرچ کرنے کا قصد مت کرو"۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ سود جیسی حرام اور ناپاک چیز پاک نہیں ہو سکتی۔

دوسری اور تیسری صورت اس سے بھی بُری ہے کہ انسان سود لے بھی اور دے بھی۔ صرف اپنی ذات پر خرچ نہ کرے۔ تو ایک مسلمان کے لیے یہ جسارت بہت ہی خطرناک ہے جو بالآخر اسے

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) لینا چاہیے، نہ دے اسے کوئی مجبوری نہیں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے لہٰذا جو مال اس راہ سے آتا ہے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر جو لوگ کچھ دیندار قسم کے ہیں وہ سودی پیسہ حرام ہی سمجھتے ہیں لیکن اُسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ اب الجھن یہ بن جاتی ہے کہ اسے لے کر کریں کیا؟

لیکن اب یہ مسئلہ علماء کے زیر بحث نہ آنا چاہیے۔ کیونکہ ضیاء الحق مرحوم نے اس کے متبادل حل کو قانونی شکل دے دی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص سود نہ لینا چاہے نہ لے۔ اور اس کے عوض اسے یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنی جمع شدہ رقم کا ۸۰ % بطور قرض حسنہ لے سکتا ہے جسے وہ بعد میں بالاقساط اپنی تنخواہ سے کٹوا دیا کرے گا۔

مکمل سُود کی لپیٹ میں ے آئے گی ۔ حضرت نعمان بن بشیر کی مشہور حدیث جو بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے اس کے الفاظ میں ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام (جو شبہ والی چیزوں میں جا پڑا وہ بالآخر حرام میں بھی جا پڑے گا) اس بات کا ان لوگوں کے پاس کیا جواب ہے ۔

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے محفوظ ترین راستہ یہی ہے کہ مصلحت کوشیوں کو اللہ کے سپرد کرے اور اپنے آپ کو بہر حال اس نجاست سے محفوظ رکھے ۔

۳ ۔ بنکوں کے چالو کھاتے اور شراکتی کھاتے

ضیاء الحق مرحوم نے پاکستان کے بنکوں سے سود کے خاتمہ کا اعلان کیا تو اس سے پہلے بنکوں میں تین طرح کے حسابات یا کھاتے ہوتے تھے :

۱ ۔ کرنٹ اکاونٹ (SAVING ACCOUNT) یا چالو کھاتے ۔ ان کھاتوں میں عموماً وہ لوگ حساب کھلواتے ہیں جو کسی قیمت پر سود لینا گوارا نہیں کرتے اور محض حفاظت کی خاطر اپنی رقوم بنکوں میں رکھتے ہیں ۔

۲ ۔ سیونگ اکاؤنٹ (SAVING ACCOUNT) یا بچت کھاتے ۔ ایسے کھاتے عموماً تھوڑی تھوڑی رقوم جمع کرانے والوں کے لیے مختص ہیں ۔ ان کی جمع شدہ رقم پر انہیں سود تو ملتا ہے لیکن شرح سود نسبتاً کم ہوتی ہے ۔ ایسے کھاتوں سے ایک مقررہ حد کے اندر اندر ہفتہ میں دو بار حسب ضرورت رقم نکلوائی بھی جا سکتی ہے ۔

۳ ۔ فکسڈ ڈیپازٹ (FIXED DEPOSIT) یا امانت کھاتے ۔ ایسے کھاتوں میں بڑی رقوم ایک معینہ مدت مثلاً تین سال یا چار ، پانچ بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت کے لیے رقوم جمع کرائی جاتی ہیں ۔ ایسی رقوم پر شرح سود سیونگ بنک سے کافی زیادہ مل جاتی ہے ۔ رقم جس قدر بڑی اور عرصہ لمبا ہوگا اسی حساب سے شرح سود بھی زیادہ ہوگی ۔ اس کھاتہ سے عام حالات میں مقررہ مدت سے پیشتر رقم نکلوانا مشکل ہوتا ہے ۔

ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ۱۹۸۰ء میں بنکوں میں شراکتی کھاتے کو (PROFIT LOSS SHARES) (یعنی نفع ونقصان میں حصّہ داری) کھولے گئے ۔ جسے مختصر کر کے P.L.S کہا جاتا ہے ۔ گویا اب ہر شخص مختار تھا کہ اپنا حساب P.L.S میں کھلوائے یا بچت کھاتوں میں ۔ گویا بنکوں میں بیک وقت

دونوں طرح کے حسابات چل رہے تھے۔ باہم یہ اعلان کیا گیا کہ عنقریب سابقہ معاہدات ختم ہونے کے ساتھ سیونگ اور فکسد کھاتے ختم کیے جائیں گے۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو یہ کھاتے ایک اعلان کے ذریعہ ختم کر دیے گئے۔ اور اب بنکوں میں یا تو چالو کھاتے ہیں یا شراکتی کھاتے۔

چالو کھاتے جو لوگ سود کے سلسلہ میں انتہائی محتاط ہیں وہ پہلے بھی اپنا حساب چالو کھاتہ میں رکھتے تھے اور اب بھی اس کھاتہ میں رکھتے ہیں۔ وہ اب اپنا حساب شراکتی کھاتوں میں کیوں منتقل نہیں کرتے اس کا جواب آگے 'شراکتی کھاتے' کے بیان میں آرہا ہے۔ البتہ ان لوگوں کے لیے بھی ایک بات الجھن کا باعث بنی رہتی ہے۔ جو یہ ہے کہ یہ درست کہ وہ خود سود نہیں لیتے۔ مگر بنک تو ان کی رقوم سے سودی کاروبار کرتے اور نفع کماتے ہیں۔ اگر وہ بنک کے پاس چھوڑتے ہیں تو بنک اس رقم سے مزید سودی کاروبار ہی کرے گا۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ

"گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون مت کرو"

کی خلاف ورزی ہے۔

گویا یہ مسئلہ بھی پراویڈنٹ فنڈ کے سود سے ملتا جلتا مسئلہ ہے۔ بنک چالو کھاتوں پر سود نہیں دیتے مگر خود تو لیتے ہیں۔ لہٰذا حفاظت کی خاطر اپنی رقوم کو بنک کے چالو کھاتہ میں رکھنا ایک اضطراری جواز ہے۔ اور جو لوگ سود کے معاملہ میں اور بھی سخت ہیں۔ وہ چالو کھاتہ میں بھی اپنی رقوم نہیں رکھتے بلکہ ان کی حفاظت کا انتظام گھر پر ہی یا دوسرے ذرائع سے کر لیتے ہیں۔

اور بعض لوگ سود کی حرمت کے قائل ہونے کے باوجود اپنی رقوم محض اس خیال سے بچت کھاتوں میں رکھتے ہیں۔ کہ آخر ہمارے پیسہ سے کمایا ہوا سود بنک کے پاس کیوں رہنے دیں۔ وہ اسے بنک سے وصول کر کے انہیں مصارف میں خرچ کرتے ہیں جن کا پراویڈنٹ فنڈ میں ذکر کیا گیا ہے لیکن ہمارے نقطہ نظر سے ان کا یہ اقدام درست نہیں۔ جس کی وجوہ پہلے ذکر ہو چکی ہیں۔

شراکتی کھاتے شراکتی کھاتوں میں چند در چند ایسے اقدامات کیے گئے ہیں۔ جن سے بظاہر یہی تاثر ملتا ہے کہ شاید فی الواقع یہ نظام سود سے پاک ہو گیا ہے مثلاً حصہ منافع فریقین کے سمجھوتہ سے طے پاتی ہے۔ کاغذات میں اس چیز یا اشیاء کا بھی اندراج ہوتا ہے۔

جو سرمایہ سے خریدی گئیں، شرح منافع کا بھی چھ ماہ بعد اعلان ہوتا ہے۔

لیکن کئی باتیں ایسی بھی ہیں۔ جو سودی نظام کے ضروری اجزا رہیں۔ ان کا صرف نام تبدیل کر کے انہیں بحال رکھا گیا ہے۔ مثلاً پہلے شرح سود فی صد روپیہ سالانہ ہوتی تھی۔ اب شرح سود کا نام مارک اپ (MARKUP) ہوگیا ہے اور یہ فی ہزار روپیہ یومیہ کے حساب سے ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے بنک ۱۵ یا ۱۶ فیصد سالانہ شرح سے سرمایہ مہیا کرتے تھے اب ۴۲ پیسے یومیہ مارک اپ کے حساب سے جو ۱۵.۲۷ بڑ بنتا ہے۔

اسی طرح DISCOUNT یا متی کاٹا کا نام شراکتی کھاتوں میں (MAPK DOWN) مارک ڈاؤن ہوگیا ہے۔ اور اس کا بھی مفہوم بالکل اسی طرح کا ہے جو ڈِس کاؤنٹ کا ہے۔

بنک پہلے بھی کسی طرح کی نقصان کی ذمہ قبول نہیں کرتا تھا اور اب بھی سارا نقصان مضارب کے کھاتہ میں ڈال دیتا ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جو تجارت کو سود سے ممتاز کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے اس نئے نظام کا بنظرِ غائر جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اب بھی سود ہی اپنی نئی شکل میں جلوہ گری کر رہا ہے۔ اور سود کے درمیان بیع کو روک کر سود کو حلال کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ بیع علینہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

۴ - انعامی بانڈز (PRISE BOND)

آج کل عوام میں انعامی بانڈز کا بھی خوب چرچا ہے اور ان پر ملنے والے انعامات کا بھی۔ یہ دراصل سود اور قمار کی مرکب شکل ہے۔ یہ کاروبار حکومتی سطح پر کیا جاتا ہے۔ حکومت کو جب سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس ذریعہ سے سُود کا نام لیے بغیر عوام سے روپیہ حاصل کرتی ہے طریق کار یہ ہے کہ آج کل حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۵۰۰ روپے اور ۱۰۰۰ روپے کے بانڈ (سرکاری تمسکات) چھاپ رکھے ہیں جو کسی بھی وقت پر بنک سے کیش بھی کروائے جا سکتے ہیں۔ ان پر نمبر بھی اسی طریق پر طبع کئے جاتے ہیں جیسا کہ کرنسی نوٹوں کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر قسم کے بانڈ کی فروخت کی اور پھر قرعہ اندازی کی باری دو ماہ بعد آتی ہے۔ مثلاً جنوری ۱۹۹۱ء میں ۱۰۰/ روپے بانڈوں کی باری ہوگی۔ اور مارچ میں ۵۰/ روپے والے بانڈوں کی قرعہ اندازی ہوگی اور قرعہ میں آنے

والے نمبروں کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس طرح باری باری ہر قسم کے بانڈ کی قرعہ اندازی ہوتی رہتی ہے۔ جو نمبر قرعہ اندازی میں نکلیں وہ جس شخص کے پاس موجود ہوں گے وہ انہیں سٹیٹ بنک آف پاکستان یا قومی بچت کے کسی مرکز میں دکھلا کر اعلان شدہ انعام حاصل کر سکتا ہے۔

یہ کاروبار چونکہ حکومت خود چلا رہی ہے۔ لہٰذا اسے خاصا فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہر دو ماہ بعد جو انعامات تقسیم ہوتے ہیں۔ وہ دراصل دو ماہ کا اس جمع شدہ رقم کا سود ہوتا ہے جو سب حصّہ داروں میں تقسیم کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کے ذریعہ چند افراد کو دے دیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں اس ناپاک اور حرام چیز یعنی سود کا نام "انعام" رکھ دیا گیا ہے۔ تاکہ عام لوگ سود کے نام سے بدک نہ جائیں۔ اور قرعہ اندازی کے ذریعہ چند افراد کو یہ رقوم عطا کرنے کے لحاظ سے یہ کاروبار میسر یا قمار کی تعریف میں آتا ہے۔

۵۔ متفرق ادارے

سودی کاروبار انہی مشاغل پر منحصر نہیں۔ اگر بنک سودی کاروبار کرتے ہیں تو ڈاکخانہ والے بھی کرتے ہیں، قومی بچت کے مراکز بھی اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشنیں بھی۔ علاوہ ازیں بہت سے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ادارے ایسے ہیں جو سود پر روپیہ دے کر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ اگر تاجر اور صنعت کار اس لعنت میں مبتلا ہیں تو اقساط پر اشیاء فروخت کرنے والوں نے بھی بہت سی اشیاء کو اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔ اور گورنمنٹ کا تو شاید ہی کوئی ادارہ ایسا ہو گا جس میں سود کسی نہ کسی شکل میں جلوہ گر نہ ہو۔ خواہ اس سود کا نام جرمانہ یا کچھ اور رکھ لیا جائے پچھلے دنوں جب وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف فیصلہ سنایا تو پاکستان کے دستور کی ۲۲ دفعات کی نشان دہی کی گئی۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ معاشرہ میں سود کا جال کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر طرف ہی فضا سود کے اثرات سے مسموم ہو چکی ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیش گوئی پوری ہو رہی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی سود سے بچا بھی رہے گا تو سود کا غبار ضرور اس تک پہنچے گا۔

بایں ہمہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص سود سے بچنے کا عزم کرے

تو وہ بچ سکتا ہے۔ البتہ اگر ناقابل علاج چیز ہے تو وہ انسان کی ھل من مزید کی ہوس ہے۔ اگر ایک تاجر ایک لاکھ کے سرمایہ سے بنک کی ملی بھگت سے چار لاکھ کا کاروبار کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے اضطرار کا نام کیوں دیتا ہے۔ اور اگر کوئی چیز درآمد کرتا ہے تو وہ پوری رقم پیشگی جمع کرا کر سود سے بچ بھی سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہی ہے کہ اضطرار کہیں بھی نہیں۔ البتہ حلال کمائی کم ہوتی ہے جس پر انسان اکتفا نہیں کرتا۔ ہاں اگر فی الواقعہ کہیں اضطرار ہو تو وہ گناہ نہیں اسے اللہ تعالیٰ ضرور معاف فرما دے گا۔ محض زیادہ کمائی کی خاطر سود میں خود ملوث ہونا پھر اسے اضطرار کا نام دینا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے۔

سود سے نجات

اگر سودی دھندا کرنے والے ادارے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں تو ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو مضاربت اور شراکت کی بنیادوں سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً جائنٹ سٹاک کمپنیاں اور کوآپریٹو سوسائٹیاں تجارتی بنیادوں پر ہی کاروبار کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں آج بھی کئی ایسے دیانتدار تاجر موجود ہیں جو مضاربت کی شرائط پر رقوم قبول کرتے اور مقررہ وقت پر طے شدہ شرائط کے مطابق منافع بھی ادا کرتے ہیں اور بوقت ضرورت ایک ماہ کے نوٹس پر رقم بھی واپس کر دیتے ہیں۔

بنکوں سے سود کے اخراج کے سلسلہ میں پاکستان اس وقت تجرباتی دور سے گزر رہا ہے جبکہ بعض اسلامی ممالک اس میدان میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔ مختلف اسلامی ممالک میں ایسے گیارہ بنک قائم ہو چکے ہیں۔ جو خالص تجارتی بنیادوں پر اور شرعی احکام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ آج سے ساڑھے دس سال قبل جولائی ۱۹۸۱ء کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں خلیل حامدی صاحب کا ایک مضمون بعنوان اسلامی بنکوں کی عالمی تحریک شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ان بنکوں سے متعلق کافی تفصیلات آگئی ہیں۔ انہی بنکوں میں سے ایک بنک مصرف فیصل الاسلامی البحرین (Faisal Islamic Bank of Bahrine) بھی ہے جس کی تین شاخیں پاکستان میں بھی کھل چکی ہیں۔ لاہور شاخ کا پتہ ۴۲ شاہراہ قائداعظم۔ لاہور ہے۔ یہ بنک عام بنکوں کے وہ وظائف بھی پورے کرتے ہیں۔ جن میں سود کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ جیسے مثلاً ترسیل زر خواہ بنک ڈرافٹ کی شکل میں ہو یا ٹیلی گراف ٹرانسفر یا میل ٹرانسفر یا مسافر چیک یا امانتوں کے لیے لاکرز وغیرہ ایسے کام ہیں جن پر بنک معمولی سی کمیشن یا فیس لیتے

ہیں۔ اوران کے علاوہ شرعی بنیادوں پر کاروبار بھی کرتے ہیں۔ اور درآمد و برآمد کا کام بھی لطف کی بات یہ ہے کہ ان بنکوں کو سودی بنکوں کی نسبت بہت زیادہ پذیرائی ہوئی ہے۔ اندریں صورت لوگوں پر اس لحاظ سے بھی اللہ کی حجت پوری ہوچکی ہے۔ اب بھی اگر کوئی شخص سود کی لعنت میں مبتلا ہونا یا رہنا چاہتا ہے تو وہ اس کی اپنی گردن پر ہے۔

مراجع و مصادر

۱۔ قرآن کریم

۲۔ کتب احادیث حسب ضرورت

۳۔ اصول معاشیات (گیارھواں ایڈیشن) پروفیسر منظور علی شیخ

۴۔ بنیادی معاشیات (جلد اول طبع سوم) محمد حسین چوہدری صدر شعبہ معاشیات

۵۔ سود (چھٹا ایڈیشن) مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۶۔ اسلام اور جدید اقتصادی نظریات پروفیسر منور حسین چیمہ

۷۔ سیرت النبیؐ جلد اول شبلی نعمانی

۸۔ متفرق رسائل و جرائد حسب ضرورت۔

سُود قبیح ترین جُرم

جناب ریاض الحسن نوری

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد

ربا یعنی سود کی بنیاد ظلم ہے کیونکہ مالدار شخص غریب کی حاجت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے لیے مقررہ نفع کی ضمانت ہر حال میں مشروط کر لیتا ہے۔ پس سود انسانوں کے طبقات میں دوری پیدا کرتا ہے اور ان کے دلوں میں کینہ بغض اور حسد و غضب کا سبب بنتا ہے۔ اور ان کے درمیان بہت سے جھگڑوں اور خصومات کا سبب بنتا ہے اس کی وجہ سے اقتصادیات میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور زرعی و صنعتی معاملات میں گڑبڑ اور مہنگائی پیدا ہوتی ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سُود کو حرام کر دیا اور اسے اکبر الکبائر قرار دیا۔ پھر قرآن میں سب سے زیادہ خوفناک آیت اس کے متعلق نازل فرمائی۔ اور جو سود سے توبہ نہ کرے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ (سورۃ البقرہ : ۲۷۸، ۲۷۹)

تفسیر طبری میں اس آیت کے سلسلے میں ابن عباس کا قول نقل کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے امام کا حق ہے کہ جو سود سے تائب نہ ہو اس کی گردن مار دی جائے۔ طبری نے یہی قول قتادہ کا نقل کیا ہے۔

البتہ بعض دوسرے فقہاء کی رائے ہے کہ ایسے شخص کو قید کرنا کافی ہے۔ جب تک سُود خواری چھوڑنے کا عہد نہ کرے اسے قید رکھا جائے۔

نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی تو

عہد نامہ میں ان سے یہ شرط کر لی گئی تھی کہ نہ وہ سُود کھائیں گے نہ سُودی کاروبار کریں گے (فتوح البلدان : ٧٦) ظاہر ہے کہ عہد نامہ کی شرط توڑنے سے حالت جنگ قائم ہو جاتی ہے۔

پس ایسی حکومت جو اپنے آئین میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتی ہو وہ اپنے ملک میں مسلمانوں یا غیر مسلموں کسی کو بھی سودی کاروبار کی اجازت نہیں دے سکتی اور حکومت پر واجب ہے کہ وہ سُودی کاروبار کرنے والوں کو قید رکھے جب تک وہ سُودی کاروبار کو فوری طور پر ختم نہ کر دیں۔

ابن قیم کہتے ہیں کہ ارحم الراحمین کی حکمت اور احسان ہے کہ اس نے اپنی مخلوق پر سود جیسی مسلمہ لعنت کو حرام کر دیا اور جو اس کو نہ ختم کرے اس کو خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ کا حکم صادر کر دیا۔ پھر سُود کھانے والے۔ کاتب اور شاہد وغیرہ پر لعنت فرمائی۔ ایسی وعید کسی بھی گناہ کبیرہ کے لیے نہیں آئی ہے۔ پس سود اکبر الکبائر ہے۔

مگر یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ صرف سود کو حرام کرنے اور اس کی شناخت بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے عوض اس سے بہتر چیزوں کو جائز قرار دیا۔ جیسے زنا کو حرام کیا تو نکاح کو نہ صرف مباح کیا بلکہ اس کی ترغیب دلائی۔

پس غریبوں کو حکومت کے اموال اور اغنیاء کے اموال میں حصہ دلایا۔ اقارب اور پڑوسیوں کے اقتصادی اور دوسرے حقوق مقرر کیے اور حکومت کے لیے کفالت اجتماعی کو واجب کیا۔ پھر زراعت۔ تجارت صناعت۔ اجارہ۔ شراکت کی مختلف شکلوں اور مزارعت مساقات و مضاربت وغیرہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔

کچھ ایسے قبیح ترین بالکل واضح اور بدترین تباہ کن جرائم ہیں جن کو نہ صرف تمام الہامی مذاہب نے گناہ و جرم قرار دیا ہے بلکہ تمام قابل ذکر خدا کے ماننے والے فلاسفہ اور خدا کو نہ ماننے والے فلاسفہ نے بھی بدترین برائی اور تباہ کن جرم قرار دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے منکر خدا جو خدا اور مذہب اور تمام متفقہ انسانی اخلاق کو ہی رد کر دیتے ہیں انہوں نے بھی ان جرائم کو بدترین جرائم قرار دے کر ان کو تباہ کن قرار دیا ہے۔ ان جرائم میں سود۔ محرمات سے بدکاری۔ قحبہ گیری شامل ہیں۔

رسل یعنی دورِ حاضر کا آزاد خیال فلسفیوں اور سائنس دانوں کا سرخیل اور انگریزی ادب میں نوبل پرائز حاصل کرنے والا بیسویں صدی کا سب سے بڑا فلسفی ارسطو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے اور ہمیں ارسطو کے خیالات اور فلسفہ یوں بتاتا ہے:

..."The most hated sort, and with the greatest reason, is usury, which makes a gain out of money itself, and not from the natural objects of it. For money was intended to be used in exchange, but not to increase at interest... Of all modes of getting wealth this is the most unnatural" (1258).... P.3

"Usury" means all lending money at interest, not only, as now, landing at an exorbitant rate. From Greek times to the present day, mankind, or at least the economically more developed portion of them, have been divided into debtors and creditors; debtors have disapproved of interest, and the creditors have approved of it. At most

The views of philosophers, with few exceptions, have coincided with the pecuniary interests of their class. Greek philosophers belonged to, or were employed by, the landowning class; they therefore disapproved of interest. Mediaeval philosophers were churchmen, and the property of the Church was maily in land; they therefore saw no reason to revise Aristotle's opinion.[۱]

یعنی ارسطو کہتا ہے کہ سب سے قابل نفرت آمدنی اور جس کے لیے دلیل بھی سب سے زیادہ وزنی ہے وہ سُود کی آمدنی ہے۔ سُود خور دولت یعنی نقد سے آمدنی پیدا کرتا ہے نہ کہ اس سے حاصل کردہ قدرتی اشیاء۔ نقد سکّے اس لیے بنائے گئے تھے کہ ان کو تبادلہ میں استعمال کیا جا سکے۔ نقد سکّے اس لیے نہیں بنائے گئے تھے کہ سُود کے ذریعے ان میں بڑھوتری ہو.... دولت حاصل کرنے کے تمام طریقوں میں سود کے ذریعے دولت حاصل کرنا سب سے زیادہ

---

[۱] Bertrand Russell: A history of western philosophy: 187 A Clarion Book, 1967

قانون قدرت کے خلاف ہے

یوزری کا مطلب روپیہ کو سود پر دینا ہے چاہے کسی طریقہ سے ہو (کم پر یا زیادہ پر) یہ لفظ یوزری محض زیادہ سود کے لیے مستعمل نہیں جیسا کہ اب لوگ کہنے لگے ہیں کہ یوزری صرف زیادہ شرح سود پر روپیہ دینے کو کہتے ہیں (بلکہ کم سود بھی یوزری ہے)....

یونان کے فلسفی یا تو زمیندار تھے یا زمینداروں کے مالک تھے پس وہ سب سود کے خلاف تھے۔ قرون وسطیٰ کے فلسفی چرچ سے متعلق تھے اور چرچ کی جائداد زمین کی صورت میں تھی پس وہ بھی سود کے خلاف تھے۔

مذکورہ بالا حوالہ سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ثابت کیا جائے کہ انگریزی کا لفظ 'یوزری' کم اور زیادہ سود دونوں کے لیے ہے۔ انگریزی ادب میں نوبل پرائز لینے والا یہی کہتا ہے دوسرے یہ کہ یونان اور قرونِ وسطیٰ کے تمام فلاسفر بھی سود کے خلاف تھے اور اسے نہ صرف حرام بلکہ قانون قدرت کے بھی خلاف سمجھتے تھے۔ پادری حضرات تو تھے ہی خلاف۔

اگر آج کے کچھ فلسفی یا پروفیسر سود کو اپنے اپنے مذاہب عیسائیت۔ یہودیت یا اسلام کے اصولوں کی مخالفت کرتے ہوئے جائز قرار دے رہے ہیں تو اس کی وجہ ان کی خود غرضی اور لالچ ہے۔ کیونکہ انہیں یونیورسٹیوں سے مال ملتا ہے جو سود پر روپیہ جمع کر کے آمدنی لیتے ہیں۔ پس لوگ خود غرضی دکھاتے ہیں۔ رسل کے الفاظ یوں ہیں۔

Philosophers, whose incomes are derived from the investments of universities, have favoured interest ever since they ceased to be ecclesiastics and therefore connected with landowning. At every stage, there has been a wealth of theoretical argument to support the economically convenient opinion.

(محولہ بالا ص ۱۸۸)

پھر برٹرنیڈ رسل قانون قدرت کے عنوان کے تحت لاک کے نظریات یوں بیان کرتا ہے۔

Thus Saint Thomas Aquinas says:

"Every law framed by man bears the character of a law exactly to that extent to which it is derived from the law of nature. But if on any point it is in conflict with the law of nature, it at once ceases to be a law; it is a mere perversion of law".

Throughout the Middle Ages, the law of nature was held to condemn "usury," i.e., lending money at interest.

(محولہ بالا ص ۶۲۳)

سینٹ تھامس کہتا ہے کہ

"ہر قانون جو انسان مرتب کرتا ہے وہ اسی حد تک قانون کی خاصیت رکھتا ہے جس حد تک وہ قانون قدرت سے اخذ کردہ ہو۔ لیکن جس نکتہ پر بھی وہ قانون قدرت سے اختلاف کرتا ہو تو وہ فوراً بطور قانون کالعدم ہو جاتا ہے اور پھر وہ محض گمراہ اور خیال قانون بن کر رہ جاتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے سارے دور میں سود پر روپیہ دینے کو قانون قدرت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

بائبل اور سُود کی حرمت

Standard American Version:

He that hath not given forth upon intereest, neither hath taken any increase, that hath withdrawn his hand from inequity hath executed true justice between man and man, 9 hath, walkled in my statutes, and hath kept mine ordinances, to deal truely; he is just, he shall surely live, saith the Lord Je-ho vah.

ination, 13 hath given forth upon interest, and hath taken increase, shall he then live? he shall not live: he hath done all these abominations; he shall surely die; his blood shall be upon him.

تعجب یہ ہے کہ لاہور کی چھپی ہوئی بائبل میں بڑھوتری والا فقرہ حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ بائبل اردو میں چھپی ہے۔ برٹش اینڈ فارن بائبل میں سوسائٹی انارکلی لاہور کی چھپی ہے ۱۹۵۶ء اس کا فوٹو سٹیٹ ملاحظہ ہو۔ اس میں واضح طور پر سود کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

جو انسان صادق ہے اور اُس کے کام عدالت و انصاف کے مُطابق ہیں۔ جس نے بُتوں کی قربانی سے نہیں کھایا اور بنی اسرائیل کے بُتوں کی طرف اپنی آنکھیں نہیں اُٹھائیں اور اپنے ہمسایہ کی بیوی کو ناپاک نہیں کیا اور عورت کی ناپاکی کے وقت اُس کے پاس نہیں گیا۔ اور کسی پر ستم نہیں کیا اور قرضدار کا گرو واپس کر دیا اور ظلم سے کچھ چھین نہیں لیا۔ بھوکوں کو اپنی روٹی کھلائی اور ننگوں کو کپڑا پہنایا۔ سُود پر لین دین نہیں کیا۔ بدکرداری سے دست بردار رہا اور لوگوں میں سچا انصاف کیا۔ میرے آئین پر چلا اور میرے احکام پر عمل کیا تاکہ راستی سے مُعاملہ کرے۔ وہ صادق ہے۔ خداوند خُدا فرماتا ہے وہ یقیناً زندہ رہیگا پر اگر اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو جو راہزنی یا خونریزی کرے اور ان گناہوں میں سے کوئی گناہ کرے۔ اِن فرائض کو بجا نہ لائے بلکہ بتوں کی قربانی سے کھائے اور اپنے ہمسایہ کی بیوی کو ناپاک کرے۔ غریب اور محتاج پر ستم کرے۔ ظلم کر کے چھین لے۔ گرو واپس نہ دے اور بُتوں کی طرف اپنی آنکھیں اُٹھائے اور گھنونے کام کرے۔ سُود پر لین دین کرے تو کیا وہ زندہ رہے گا؟ وہ زندہ نہ رہے گا۔ اُس نے یہ سب نفرتی کام کئے ہیں۔ وہ یقیناً مرے گا۔ اُس کا خُون اُسی پر ہوگا۔

اس کے بعد حزقیل کے باب ہی میں آیات ۸-۲۲ سے ۱۲-۲۲ تک پھر دوبارہ بدترین گناہوں کے ساتھ سُود کی برائی ایک ساتھ بیان کی گئی ہے اور بڑھوتری کا ذکر کر کے کم یا زیادہ سود سب کو ایک صف میں محرمات سے بدکاری کے برابر جرائم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ امریکن سٹینڈرڈ ورشن کے علاوہ دی ہولی بائبل مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں بھی سود کے بعد INCREASE

کالفظ موجود ہے جیسے اردو میں بڑھوتری اور عربی میں ربا کہتے ہیں ۔ گویا اصل میں زیادتی کم ہویا زیادہ سب حرام کے زمرہ میں آتی ہے ۔ حرام تھوڑا ہویا زیادہ حرام ہوتا ہے ۔

اوپر بیان کردہ حوالوں سے ثابت ہوگیا کہ تورات جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کا الہامی قانون اور مقدس صحیفہ ہے ۔ اس کے نزدیک قرض پر معمولی بڑھوتری ہویا زیادہ اسکی کوئی تفریق نہیں کی گئی ۔ سود یا بڑھوتری زیادہ ہویا کم دونوں محرمات سے بدکاری کی صف میں آتے ہیں ۔ مسلمانوں کے ہاں بھی ایک حدیث ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کوئی ایک درہم سود سے حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان ہونے کے باوجود ۳۳ مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ شدید جرم ہے ۔ بعض روایت میں ماں سے زنا کرنے کے جرم کے برابر بتایا گیا ۔ ان احادیث میں سے بعض کو موقوف اور بعض کی سند کو ضعیف یا منقطع کہا گیا ہے ۔ ایک حدیث میں سود کے درہم کو ۳۶ زنا کے برابر کہا گیا ہے ۔ مفتی شفیع صاحبؒ نے اس حدیث کو نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ سند امام احمد مثل سند صحیح بخاری ہے ۔ (دیکھئے مسئلہ سود مولفہ مفتی شفیع صفحہ ۷۵، ۷۶ مطبوعہ ۱۹۷۹ء)

راقم الحروف نے بذات خود مذکورہ بالا احادیث کی اسناد کی جانچ پڑتال نہیں کی ہے ۔ یہاں اس واسطے نقل کردی ہیں تاکہ بائبل اور ان روایت میں مماثلت سامنے آجائے ۔

مفتی صاحب نے ۴۰ حدیثیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں مزید تجارتی سود کی حرمت اسکے دوسرے حصہ میں مسٹر جسٹس مولانا تقی عثمانی نے عقل اور شرع کی روشنی میں ثابت کی ہے ہر قسم کا سود کم ہو یا زیادہ تجارتی ہو یا غیر تجارتی قرآن وسنت سے اس کی حرمت ثابت ہے اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں میں مدلل بحث کرکے حق ثابت کردیا گیا ہے ۔ ان ان باتوں کو دہرانا سورج کو روشنی دکھانے کے مترادف ہے ۔ جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے ۔ تو اجتہاد صرف ان مسائل میں ہوتا ہے جس میں قرآن وسنت کا واضح حکم موجود نہ ہو ورنہ ایسے معاملات میں اجتہاد گمراہی کی علامت ہے ۔

ع خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

امریکن MENTOR کیس والوں نے ۱۹۵۴ء میں ایک تحقیقی کتاب چھاپی جسکا نام ہے ۔

Ethics In a Business Society:

مصنفہ

Marquis W. Childs and Douglas Cater.

اس کتاب کی تحقیقات کے لیے راک فیلر فاونڈیشن نے روپیہ خرچ کیا اور یہ جدید امریکی ریسرچ کا عمدہ نمونہ ہے ہم اس کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ تک عیسائی پادری تجارت کے بھی حق میں نہ تھے۔ تجارت کو بھی ناجائز یا شدید مکروہ سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

Usury was a sin. Trade itself was dubious in the ethical view of the Church. As one authority expressed it, "who soever buys a thing, not that he many sell it whole and unchanged, but that it may be a material for fashioning something, he is no merchant. But the man who buys it in order that he may gain by selling it again unchanged and as he bought it, that man is of the buyers and sellers who are cast forth from God's temple". This was the view of the master theologian, St. Thomas Aquinas, and it was expressed in even sharper terms by St. Antoninus, a specialist in the economic life of the Middle Ages. Because trade and usury were considered sinful, these functions, as the sluggish current of commerce began to quicken a little, were left largely to those outside the Church whose souls, in the view of the time, could not be further jeopardized. (P.12.)

یعنی سود گناہ تھا۔ بلکہ چرچ کی نظر میں تجارت کا جواز بھی مشتبہ تھا۔ ایک اتھارٹی کا کہنا تھا کہ اگر کوئی بغیر تبدیلی کے کسی چیز کو اس مقصد کے لیے فروخت کرے کہ وہ اسے تبدیل کر کے کچھ اور چیز بنا کر بیچے تو ایسا شخص کوئی تاجر نہیں ہے۔ لیکن جو شخص اس سے اس لیے خریدے کہ وہ اس میں کوئی تبدیلی کئے بغیر اسے ویسا کا ویسا ہی بیچ دے جیسا اس نے خریدا ہے اور پھر اس پر نفع بھی لے تو ایسا شخص خدا کی عبادت گاہ سے خارج متصور ہو گا یہ نظریہ عظیم فقیہ سینٹ تھامس اکوناس

کا تھا۔اور سینٹ تھامس ایکوناس نے جو قرون وسطیٰ کی معاشیات کا سپیشلسٹ سمجھا جاتا تھا اس نے اس مسئلہ کو اور بھی سختی سے بیان کیا۔اس کے مطابق کیونکہ تجارت اور سود دونوں گناہ تھے اور تجارتی کاروبار پہلے سے زیادہ عروج پذیر تھا۔پس انہوں نے کہا کہ ان چیزوں کو محض ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے جو کہ چرچ کے باہر تھے اور جن کی روح کو اس سے بڑا خطرہ نہیں لاحق ہو سکتا ہے۔

غور فرمائیے کہ جو عیسائی پادری تجارت ہی کو ناجائز سمجھتے ہوں تو وہ تجارتی سود کو کیسے جائز قرار دے سکتے تھے۔غرضیکہ سود کم ہو یا زیادہ۔تجارتی ہو یا جیسا بھی ہو ہر قسم کا تھوڑا یا زیادہ سود عیسائیت میں حرام ہے۔لیکن آہستہ آہستہ پادری حضرات دنیاوی لالچ میں بہت سی برائیوں کو جائز بھی قرار دینے لگے اور جرمانہ لے کر معاف بھی کرنے لگے۔ایک وقت آیا کہ پوپ نے سود کی حرمت ختم کر دی تو پروٹسٹنٹ ریفارمر لوتھر نے اس کے خلاف یوں آواز اٹھائی:

لوتھر کا اعلان

"The greatest misfortune of the German nation is easily the traffic in interest", Luther said, "The devil invented it and the Pope, by giving his sanction to it, has done untold evil throughout the world".

(Ethics in a Business Society. P.24)

یعنی جرمن ریفارمر مارٹن لوتھر جو پراٹسٹنٹ فرقہ کا بانی ہے۔اس نے اعلان کیا کہ سب سے بڑی بدقسمتی اور مصیبت جو جرمن قوم پر آپڑی ہے وہ یہ ہے کہ انٹرسٹ کا عام رواج ہو چلا ہے۔اسے شیطان نے ایجاد کیا تھا اور پوپ نے اس کی اجازت دے کر تمام دنیا میں ناقابل بیان برائی کو پھیلا دیا ہے۔

غور فرمائیے کہ یہاں لوتھر اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ سود کم یا زیادہ سب شیطانیت ہے۔یوزری کے لفظ کی بجائے انٹرسٹ کا لفظ استعمال کیا ہے تاکہ کسی شک یا شبہ کی گنجائش

باقی نہ رہے ۔
قرآن کریم میں آتا ہے :

الذین یاکلون الربا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطانُ من لمس ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربا (البقرہ : ۲۷۵)

" یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوتے (یا) قیامت کو نہیں اٹھائیں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو شیطان نے چھو کر باولا کر دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ۔

اکثر مفسرین تو یہ مراد لیتے ہیں کہ قیامت کو سود میں ملوث لوگ جو اس باختہ ہو کر اٹھیں گے مگر بعض دوسرے کہتے ہیں کہ دنیا میں بھی انکی حواس باختگی ظاہر ہے کیونکہ وہ سود کو تجارت میں فرق کرنے سے قاصر ہیں ۔ آج سود عام ہونے سے عوام ہیں مجرموں کی تعداد بڑھ گئی یہ بھی حواس باختگی کی نشانی ہے

حدیث کی پشین گوئی

حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا :

۹۷۶۳ ۔ لیاتین علی الناس زمان لا یبقی منھم أحدٌ الا اکل الربا فان لم یاکلہ اصابہ من غبارہ ۔

(کنز العمال نمبر ۹۷۶۳ بحوالہ ابو داؤد ۔ ابن ماجہ بیہقی)

" یعنی ایسا زمانہ لوگوں پر ضرور آئے گا کہ ایک بھی ایسا شخص باقی نہ رہے جو سود نہ بھی کھائے گا تب بھی اس کو سود کا غبار تو پہنچ ہی جائے گا ۔

یہ پشین گوئی آج بالکل حقیقت بن چکی ہے ۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ آجکل جو سود عام ہے ۔ بنکوں کا سود وغیرہ یہ وہی حرام سود ہے جس کی پشین گوئی زبان نبوت سے ہو چکی ہے ۔ اب دوسری حدیث ملاحظہ ہو :

۹۷۶۸ - ما ظهر فی قوم الربا والزنا الا احلّوا بأنفسهم عقاب الله - (کنز العمال ۹۷۶۸ بحوالہ مسند احمد)

"یعنی نہیں ظاہر ہوتا کسی قوم میں سود اور زنا مگر یہ کہ وہ قوم اپنے کو اللہ کے عذاب کے پیش کر دیتی ہے -

سود ختم کرنے کا اعلان مسلم لیگ نے قائد اعظم کی صدارت میں ۱۹۴۳ میں کر دیا تھا

انڈیا کی تمام ریاستوں کی مسلم لیگ کے صدر نواب بہادر یار جنگ نے قائد اعظم کی صدارت میں تقریر کرتے ہوئے کراچی میں مسلم لیگ کے اکتیسویں سیشن دسمبر ۱۹۴۳ء کے موقع پر یوں اعلان کیا

The achievement of Pakistan will not be so difficult as its maintenance. Your Quaid-i-Azam has proclaimed more than once that the Muslims have no right to frame the constitution and law of any one of their States. The laws governing the constitution of a Muslim are definitely laid down in the Holy Quran. There is no denying the fact that we want Pakistan for the establishment of the Quranic system of government.

Only that system will suit us which is based on the Quran and the Traditions, and which would produce true Muslims. The abolition of interest cut out the roots of usury; the law of inheritance checked all ways to the amassment and accumulation of wealth; Zakat led to the circulation of hoarded wealth, and encourgement of charity wiped out all poverty and economic inequality from the soil of Arabia.

The system of Zakat which is a tax on capital and not on income, is the greatest of all taxes that modern civilized countries have levied on their people. In view of this flawless economic system, can we care to cast a look at any other system?

(فاؤنڈیشنز آف پاکستان مسلم لیگ ڈاکومینٹس، ج ۲ ص ۸۶-۴۸۵ مرتبہ شریف الدین پیرزادہ)

ترجمہ: یعنی پاکستان کا حاصل کرنا اتنا مشکل نہ ہوگا جتنا کہ اس کو قائم رکھنا۔ آپکے قائداعظم نے ایک سے زیادہ مرتبہ اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کسی ریاست کا آئین بنانے کا حق نہیں ہے۔ آئین کے قوانین یقینی طور پر قرآن مجید میں دیدئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم قرآنی نظام حکومت قائم کرنے کے لیے پاکستان حاصل کرنا چاہتے ہیں ..... ہمیں وہی نظام راس آسکتا ہے جو قرآن وسنت پر مبنی ہو اور سچے مسلمان پیدا کرے۔ سُود کا خاتمہ بیاج کی جڑوں کو اکھیڑ دیگا.... زکاۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جو آمدنی پر نہیں بلکہ دولت پر ہے۔ اور یہ ان سب ٹیکسوں سے عظیم جو آج کی حکومتیں اپنے عوام پر عائد کرتی ہیں۔ اسلام کے بے عیب اقتصادی نظام کے ہوتے ہوئے کیا ہم کسی دوسرے نظام کی طرف دیکھنے کی بھی پرواہ کرسکتے ہیں؟

ایک وفاقی وزیر ترقی کیلیے بین الاقوامی مالیاتی نظام کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ (نوائے وقت ۲۲-۲-۹۲)

مگر قائداعظم مغرب کے مالیاتی نظام کو تباہ کن قرار دیتے ہیں۔ اسکے نفاذ سے منع کرتے ہیں

بانیٔ پاکستان قائداعظم رح محمد علی جناح نے بنک دولت پاکستان کے افتتاح کی تقریب میں یکم جولائی ۴۸ء کو فرمایا تھا۔

جنگ عظیم کی مالیاتی پالیسی نے بڑی حد تک آج کی اقتصادی مشکلات کو پیدا کیا ہے۔ قیمتوں کے اضافہ نے سوسائٹی کے غریب لوگوں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے ....

حکومت پاکستان کی پالیسی ہے کہ قیمتوں کو مستحکم رکھا جائے .....

"میں اسٹیٹ بنک کے شعبۂ تحقیق کے اس کام کا جو اسلامی نہج پر بنکاری کے لیے ہو رہا ہے۔ بڑے شغف کے ساتھ انتظار کروں گا۔ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اور اب ایسا نظر آتا ہے۔ کہ دنیا جس تباہی کے قریب پہنچ چکی ہے اسے کوئی معجزہ ہی نمودار ہو کر شاید بچاسکے تو بچاسکے یہ نظام انسان انسان کے درمیان عدل قائم کرنے اور بین الاقوامی میدان میں تضاد اور مزاحمت

کا استیصال کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ بلکہ گذشتہ نصف صدی میں جو عالمگیر جنگیں
لڑی گئی ہیں۔ ان کی ذمہ داری اسی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم مغرب کے معاشی
نظام کو نظری اور عمل طور پر اختیار کر لیں تو ہمارا مقصد حل نہیں ہوگا۔ اپنے مستقبل کی
صورت گری ہمیں خود کرنی ہوگی۔ اور دنیا کے سامنے ایک ایسا معاشی نظام پیش کرنا
ہوگا جو مساوات انسانی اور عدل عمرانی کے صحیح اسلامی اصولوں پر ہو۔

The monetary policy pursued during the war years contributed, in no small measure, to our present day economic problems. The abnormal rise in the cost of living has hit the poorer sections of society. In the policy of the Pakistan Government is to stabilise prices at a level that would be fair to the producer, as well as to the consumer I hope your efforts will be directed in the same direction in order to tackle this crucial problem with success.

I shall watch with keenness the work of your Research Organization in evolving banking practices compatible with Islamic ideals of social and economic life. The economic system of the West has created almost insoluble problems for humanity and to many of us it appears that only a miracle can save it from disaster that is now facing the world. It has failed to do justice between man and man and to eradicate friction from the international field. On the contrary, it was largely responsible for the two world wars in the last half century, The Western world, in spite of its advantages of mechanization and industrial efficiency is today in a worse mess than ever before in history. The adoption Western economic theory and practice will not help us in achieving our goal of creating a happy and contented people. We must work our destiny in our own way and present to the world an economic system based on true Islamic concept of equality of manhood and social justice. We will thereby by fulfilling our mission as Muslims and giving to humanity the message of peace which alone can save it and secure the welfare, happines and prosperity of

فروری ۱۹۴۸ء میں براڈکاسٹ کرتے ہوئے امریکہ کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے اسلامی قوانین کے متعلق اعلان فرمایا :-

. Today, they are as applicable in actual life as they were 1,300 years ago.

یعنی اسلامی قوانین آج بھی اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح ۱۳۰۰ سال پہلے تھے۔

قائداعظم کی پالیسی کے پیش نظر زاہد حسین گورنر بنک پاکستان نے پاکستان کی پہلی اقتصادی کانفرنس ۱۹۴۹ء میں فرمایا :

" اسلام سود ، ارتکاز دولت اور اجتماع قوت جس پر جدید معیشت کی بنیادیں استوار کی گئی تھیں ۔ کے سخت خلاف ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ تیس سال کے دوران میں شرح سود میں کمی کا رجحان غالب رہا ہے ۔ مگر ہمیں اس وقت کا انتظار ہے جب اسے کلی طور پر ختم کر دیا جائے ۔ یہ بات ہماری تعمیر منصوبہ بندی پر منحصر ہے کہ ہم اس وقت کو اور قریب لاسکیں مستقبل میں ہمیں بے شمار اہم اور ضروری مسائل سے واسطہ پڑے گا لیکن یاد رکھئے کہ سود کے مسئلے سے زیادہ بنیادی اور ادق مسئلہ اور کوئی نہیں ہے ۔

یہ مسئلہ بیک وقت ہماری ذہانت کے لیے ایک چیلنج اور ایک اچھے موقعہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

(شیخ ارشاد احمد : بلا سود بنکاری : ۲ مطبوعہ مکتبہ تحریک مساوات ۱۰ - اے بلاک ۶ پی سی ۔ ایچ ۔ ایس ٹرک روڈ کراچی ۱۹۶۴ء)

بیرونی ممالک جو ہمارے ملک میں روپیہ لگانے سے کترانے لگے ہیں اس کی وجہ شریعت کورٹ کا فیصلہ نہیں بلکہ ملک میں بدامنی چینی انجنئیر اور دیگر ممالک کے کارکن اغوا ہوئے تھے۔ اب اطالوی کمپنی کے کارکن اغوا ہو گئے ۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ مؤرخہ ۲۶ ۲/۹۲)

علامہ اقبال کا فرمان اور سودی نظام کی تباہ کاریاں

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

رسل کا اعلان اور دلائل کہ بین الاقوامی اقتصادی نظام پاگل پن تباہ کن ہے:

بیسویں صدی کے عظیم مفکر فلسفی سائنس دان اور نوبل انعام یافتہ ادیب برٹرینڈ رسل نے جدید ماہرین معاشیات اور ان کے مغربی اقتصادی نظام کا دل کھول کر مذاق اڑایا ہے اور ان کی حماقتوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس کے مضمون کا عنوان ہے
یعنی جدید دور کا میداس بادشاہ جس کے ہاتھ لگانے سے ہر چیز سونا بن جاتی تھی۔ صحیح لطف تو اصل مضمون پڑھنے سے آسکتا ہے۔ لیکن ہم جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین پر واضح ہو جائے کہ مغربی اقتصادیات پاگل پن کا دوسرا نام ہے۔ سود لینے والے صحیح طور پر نہ صرف قیامت کو بلکہ آج بھی ہوش حواس کھوئے ہوئے ہیں، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اقتصادیات کا مضمون ہمیشہ الٹے طریقے سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ (یعنی سود والوں کی ہوش ماری رہی ہے جو قرآن نے کہا ہے) وہ لکھتا ہے:

ترجمہ: پہلی جنگ عظیم کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنا احمقانہ ہے کہ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ حکومتیں بڑی عمر کے لوگوں پر مشتمل ہیں جو کہ پاگل خانوں سے باہر ہیں۔ وہ جرمنی کو سزا دینا چاہتے تھے ... تاوان عائد کرنا چاہتے تھے ... تاوان اتنا زیادہ مقرر کیا گیا جتنا سونا تمام جرمنی میں موجود نہ تھا ... پس جرمنوں کے لیے تاوان کی ادائیگی اشیاء کی صورت میں ادا کرنے فیصلہ کیا گیا ... لیکن اس فیصلے کے بعد وہ گھبرا گئے کیونکہ اس طرح تو جرمنی کی برآمدی تجارت وصنعت

کی ترقی کا راستہ کھل گیا ....

اس پاگل پن کی حالت کا ایک اور پاگلانہ حل تلاش کیا گیا ... مختصراً یہ کہ ضروری ہوگیا کہ جرمنی کو تاوان ادا کرنے کے لیے قرض دیا جائے ... پھر مجبور ہو کر مزید یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب جرمنی کے پاس سود ادا کرنے کو بھی نہیں ہے پھر جرمنی کو مزید قرضہ دیا جائے جس سے وہ پچھلے قرضے کا سود ادا کرے .....

نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دنیا میں کساد بازاری، مصیبت بھوک، تباہی اور بربادیوں کا وہ تسلسل شروع ہو گیا جس میں تمام دنیا مبتلا ہے[ل]

خزانہ کی مالیت سے زیادہ نوٹ چھاپنا

مذکورہ بالا مضمون ہی میں برٹرینڈ رسل نے ان تمام یورپین حکومتوں کو بے ایمان قرار دیا ہے جنہوں نے جنگ عظیم اول کے بعد بے تحاشہ نوٹ چھاپ کر یعنی افراط زر پیدا کر کے اپنے عوام سے لیے ہوئے قرضوں کو تقریباً ختم کر دیا یا قرضوں کے پانچ حصوں میں سے چار حصے کالعدم کر دیے وہ لکھتا ہے کہ عوام حکومتوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور ان کو اپنے عوام سے ایمانداری برتنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ انہیں پھر عوام سے قرضہ لینے کی ضرورت پیش آجائے (محولہ بالا ص ۴۶)

دراصل افراط زر عوام پر ٹیکس عائد کرنے کا ایک ایسا دھوکہ دہی کا حربہ ہے کہ عام لوگ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے اور ان کی جیب بے خبری میں کٹ جاتی ہے۔ غیر ملکی رسائل میں اس موضوع پر مضامین لکھ کر حکومتوں کی بے ایمانیوں اور شاہ خرچیوں کا پول کھولا جاتا رہتا ہے مگر ہمارے ملک میں بہت سے پروفیسر بھی ابھی تک اس مسئلہ کو سمجھ نہیں پائے۔

مثال کے طور پر امریکی عالمی رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ ۱۵ زبانوں میں پونے تین کروڑ سے

ل Bertrand Russell: In Praise of Idleness and other Essays: 41 to 43: Allen and Unwin, 1967

زیادہ تعداد میں چھپتا ہے ۔ اس رسالہ نے مارچ ۱۹۵۹ء ایک مضمون چھاپا جس کا عنوان تھا FRANCE'S NEW POOR یعنی "فرانس کے نئے مفلس"۔ اس کے شروع ہی میں وہ لکھتا ہے کہ حکومت کی پیدا کردہ بے رحمانہ اور ظالمانہ افراط زر نے درمیانہ درجہ کے لوگوں کو آہستہ آہستہ مفلس بنا کر رکھ دیا ہے ۔ صفحہ ۱۸ پر ماہر مصنف لکھتا ہے کہ ۴۰ سال سے جاری افراط زر نے ثابت کر دیا ہے کہ جہاں تک بجٹ کا تعلق ہے حکومت اور پرائیویٹ آدمی میں کوئی فرق نہیں ... فرانس کے لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ سیاست دان بلند بانگ دعوؤں کے باوجود عوام کو کچھ نہیں دے سکتے آخر کار عوام ہی کو سب کچھ ادا کرنا پڑتا ہے ۔

If they do not pay in taxes, they pay in inflation which is the highest and cruellest tax of all.

یعنی اگر عوام ٹیکس نہیں دیں گے تو ان کو افراط زر کی صورت میں دینا پڑے گا جو سب سے بڑا اور تمام ٹیکسوں سے ظالمانہ ٹیکس ہے ۔

پھر فروری ۱۹۶۳ میں اسی رسالہ نے مضمون چھاپا جس کا عنوان تھا ۔

LAW MAKERS IN MONEY

یعنی "مالی معاملات کے قانون ساز"۔

اس مضمون میں حکومت کی فضول خرچیوں ۔ شاہ خرچیوں ۔ سرکاری خزانہ کو مال مفت دل بے رحم کی طرح لٹانے اور لوٹنے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ۔

پھر اسی رسالہ نے اگست ۱۹۶۶ء میں ایک مضمون چھاپا جس کا عنوان تھا :

"Why all this inflation" یعنی "یہ سب افراط زر کیوں ؟"

اس کی ذیلی سرخی یوں ہے :-

The rapid rise in prices over the past few months is planned, not accidental. Here is how it happened?

یعنی پچھلے چند ماہ میں جو اچانک مہنگائی ہوئی ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ سوچ بچار

سے بعد اس کو سکیم کے تحت لایا گیا ہے اس کی تفصیلات درج ذیل میں ملاحظہ فرمائیے .....
اسی طرح امریکن رسالہ نیوزویک بھی اسی قسم کے مضامین چھاپتا رہتا ہے مثلاً ۲۴ جولائی ۱۹۸۹ء
کے شمارہ میں اس نے ایک مضمون چھاپا جس کا عنوان تھا The Money Disease
یعنی "روپیہ کی بیماری" اس میں نوٹ چھاپنے کا ذکر ہے۔
اس مضمون میں خاص طور پہ پیرو۔ برازیل اور نکاراگوا کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں صفحہ ۱۹ پہ
وہ لکھتا ہے۔

Nicaragna is suffering from what one expert calls "self imposed suicide"

ترجمہ: نکاراگوا کی مصیبتوں کو ایک ماہر۔ "خود عائد کردہ خودکشی" قرار
دیتا ہے۔

فراڈ و غداری

لنڈن کے تعلیم یافتہ مشہور پاکستانی ماہر اقتصادیات سید محمد اسماعیل افراط زر کو فراڈ اور
غداری (TREASON) قرار دیتے ہیں (دیکھیئے ص ۱۳۷ کیپٹلزم۔ سوشلزم اور اسلامک
اکنامک آرڈر) موصوف پی۔آئی۔ڈی۔سی کے سابق چیف آڈیٹر ہیں۔

جتنی شرح سود کی ہوگی اتنی شرح بے روزگاری کی ہوگی

ایک اور ماہر معاشیات محمود احمد کی کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ نے چھاپی ہے جسکا
عنوان ہے 'بلا سود بنکاری' اس میں انہوں نے ماہرین کے اعداد و شمار اور دلائل سے ثابت
کیا ہے کہ بنکاری کی شرح اتنی ہی ہوگی جتنی سود کی شرح ہوگی۔ سود کے خاتمہ سے بے روزگاری
کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔
پس تباہی سے بچنے اور مشکلات سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ہم مغرب کے اقتصادی
نظام کی جگہ قائداعظم اور علامہ اقبال کے فرمودات کے مطابق اسلامی اقتصادی قوانین کا نفاذ

کریں اور اب ہمیں چاہیے کہ سود سے چھٹکارا پائیں اور قوم کو غیظ و غضب الہٰی سے بچائیں ! اسلامی قوانین سے خدا نے چاہا تو ہم طوفانوں اور بحرانوں سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے جن میں ہم آج کل گھرے ہوئے ہیں ۔

سیکولرازم

آج کل بعض سیاست دان سیکولرازم کا نعرہ بھی لگاتے ہیں اور مسلمانی کا دعوے بھی کرتے ہیں حالانکہ آکسفورڈ امریکن ڈکشنری مطبوعہ نیویارک ۱۹۸۰ لکھتی ہے :

Secularism is ipposition to or rejection of religion. P.612

یعنی سیکولرازم کا معنی مذہب کی مخالفت کرنا یا مذہب کو مسترد کرنے کا نام ہے ۔

نوبل انعام یافتہ مشاہیر کے نزدیک بیسویں صدی کی تباہ کاریاں خدا اور اس کے قوانین سے منحرف ہونے کا نتیجہ ہیں

پروفیسر پال جانسن مصنف عظیم لکھتا ہے کہ بیسویں صدی کی تاریخ اس نظریہ کو ثابت کرتی ہے کہ جیسے خدا کا نظریہ ماند پڑتا ہے تو ہم پہلے چالاک بندر بن جاتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کو تباہ کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ (ریڈرز ڈائجسٹ بابت اگست ۱۹۸۵ ص ۸۸)

انگلینڈ کی لیبر پارٹی کا ممبر مشہور سائنس دان ریاضی اور نوبل انعام یافتہ ادیب برٹرینڈ رسل اپنی کتاب ' پاور ' میں لکھتا ہے :

God is dethroned to make room for earthly tyrants.

یعنی خدا کو تخت سے اس لیے اتارا جاتا ہے کہ زمینی جباروں کے لیے جگہ خالی کی جاسکے ۔

۱۹۸۰ء میں امریکن سائنس دان یہ جان کر حیران رہ گئے کہ فقہا ءان سے علم میں صدیوں آگے تھے ۔ جو علم ان کو اب حاصل ہوا ہے ۔ صدیوں پہلے فقہاء اس کو جانتے تھے ۔

مذکورہ بالا رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ کے اگست ۱۹۸۰ء کے شمارے میں یہ مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا کہ کیا ماہرین فلکیات نے خدا کو پا لیا ہے۔ اس مضمون کا آخری پیراگراف ملاحظہ ہو:

Now we would like to pursue that inquiry further back in time, but the barrier seems insurmountable. For the scientist who has lived by his faith in the power of reason, the story ends like a bad dream. He has scaled the mountains of ignorance; he is about to conquer the highest peak; as he pulls himself over the final rock, he is greeted by a band of theologians who have been sitting there for centuries.

جہاں تک سود کا تعلق ہے بہت سے مغربی ماہرین اقتصادیات صفر سود کی باتیں کرتے رہے ہیں مگر ۱۹۸۶ء میں کینیڈا کے اقتصادیات کے پروفیسر مسعود عالم چودھری نے ایک کتاب اسلامی نظام اقتصادیات پر لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے ریاضی کے فارمولوں سے ۲۔ اور ۲۔ چار کی طرح ثابت کیا ہے کہ سود سے مہنگائی بڑھتی ہے۔ بے کاری بڑھتی ہے اور کارکردگی گھٹتی ہے۔ جبکہ مضاربت میں قیمتیں کم ہوتی ہیں۔ بے کاری ختم ہوتی ہے۔ کارکردگی بڑھتی ہے اور مزدوروں کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے دیکھئے عنوان "سود کے خلاف کیس اور اسلامی نعم البدل"۔

Case against interest and the Islamic alternative.

اس کتاب کی تحقیق کے لیے نیویارک کی راک فیلر فاونڈیشن نے اٹلی میں لائبریری اور تحقیقی مرکز میں مصنف کی رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ اور اس کتاب کو میکمیلن کمپنی نے چھاپا ہے۔
ایک وفاقی وزیر علماء کو کیا اجتہاد کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں ایسا اجتہاد جس سے بقول بائبل اور قائداعظم موت و تباہی آتی ہے!

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

وزیر صاحب نے گل افشانی فرمائی کہ:

"علماء جذباتی ہو کر فتوے جاری نہ کریں۔ عالمی مالیاتی نظام سے وابستہ رہ کر ہی ترقی کر سکتے ہیں۔
سود کے بارے میں اجتہاد کرنا ہوگا۔ اسلام پر پاکستان کی ہی اجارہ داری نہیں"!
(نوائے وقت مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۹۲ء) وغیرہ

وزیر صاحب کیا اجتہاد چاہتے ہیں؟ ایسا اجتہاد جیسا اجتہاد آج سے ...۴ سال قبل تک کی موجود تمام الہامی کتب احکام الٰہی اور اخلاقی ضابطوں کو توڑ کر انگلینڈ اور مغرب میں کیا گیا ہے۔ کیا ہم بھی انگلینڈ کی پریوی کونسل کی پیروی کرتے ہوئے اپنے عقیدہ کو بدل دیں اور قرآن اور بائبل وغیرہ تمام الہامی کتب کا انکار کرتے ہوئے دوزخ کے وجود کا انکار کر دیں کہ خوف خدا ہی ختم ہو جائے اور سب کچھ کرنے کی کھلی چھٹی مل جائے جس کے خلاف امریکہ میں بھی آواز اٹھائی جا رہی ہے یعنی مادر پدر آزادی!

مغرب میں نہ صرف سود کو حلال کر دیا گیا ہے حالانکہ انٹرسٹ نہ صرف بائبل کے خلاف ہے بلکہ بائبل نے سے تمام نفرتی کاموں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہمسایہ کی بیوی کو ناپاک کرنے سے لے کر بدترین برائیوں کا ذکر کر کے آخر میں ہے کہ سود پر لین دین کرے تو کیا وہ زندہ رہے گا؟ وہ زندہ نہ رہے گا۔ اس نے یہ سب نفرتی کام کئے۔ وہ یقیناً مرے گا۔ اس کا خون اسی پر ہوگا (حزقی ایل باب ۱۸۔ آیات ۱۲-۱۴)

سود کے بعد مغرب کی جمہوریتوں نے قحبہ گری۔ لواطت کو حلال کر دیا ساتھ ہی دوزخ

کا انکار کر دیا۔
مگر دیکھئے بائبل کے الہامی الفاظ کو قائداعظم نے دہرایا اور یورپ مغرب کے اقتصادی نظام کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مغرب کے اقتصادی نظام نے انسانیت کے لیے ناقابل حل مشکلات پیدا کر دی ہیں اور اسی نظام کی وجہ سے مغرب میں دونوں عظیم جنگیں ہوئیں (حوالہ آگے آرہا ہے)

مغرب میں دوزخ کے انکار اور سود کے جواز کے بعد مزید نئے اجتہادات یہ ہوئے کہ قحبہ گری بھی جرم نہیں۔ ہم جنسی اختلاط یا نکاح بھی جرم نہیں۔ اور اب وہاں کی قانون کی اصلاحی کمیشنز اور دانشور یہ اجتہاد فرما رہے ہیں کہ محرمات سے جنسی تعلقات پر پابندی کو بھی ختم کر دیا جائے اور اس قبیح ترین برائی اور ذلالت اور نفرتی کام کو بھی جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اب ہمارے ملک میں بھی ایسے دانشور اور مجتہد پیدا ہو رہے ہیں جو یہ گل افشانی فرماتے ہیں کہ عالمی مالیاتی نظام اور عالمی تہذیب و کلچر اور عالمی سوشل نظام کے بغیر ہم تباہ ہو جائیں گے۔ علامہ فرماتے ہیں:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

آج ہماری حکومتیں ایوان اقبال تعمیر کر رہی ہیں مگر اقبال کے اصولوں کو ٹھکرا کر مغرب کی حکمت کو بین الاقوامی حکمت کہہ کر اپنا رہی ہیں۔ حالانکہ علامہ نے فرمایا تھا تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا وزیر صاحب کب تک اور کہاں تک مغرب کی جمہوری حکومتوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ سود کے معاملے میں۔ دوزخ سے انکار کے معاملے میں جوا۔ لاٹری۔ ریس۔ ہجوم زنان بازاری۔ موسیقی صورت گری۔ طاؤس و رباب۔ عریانی و بے کاری۔ محرمات سے نکاح اب تو یہ سب باتیں یورپ بلکہ عالمی کلچر اور نظام کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات!
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت!
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

وفاقی شرعی عدالت کے عظیم فیصلے جو ریس۔ جوا لاٹری کے خلاف تھے۔ اب جن میں سود بھی شامل ہو گیا ہے سپریم کورٹ کی شرعی اپیلیٹ بنچ میں رکے پڑے ہیں۔ ریس کا فیصلہ کئی سال سے انصاف کا منتظر ہے۔ پھر انتخاب سے متعلق ایک دوسرا فیصلہ بھی منتظر ہے جس میں اس بات پہ زور دیا گیا ہے کہ کم علم۔ نااہل اور برے کردار کے لوگ پارلیمان میں کسی صورت نہ آنے پائیں۔ ہر ووٹر کی انکی اہلیت کو چیلنج کرنے کا حق دیا جائے۔ خرچہ پہ ایسی پابندی لگائی جائے کہ غریب اور اہل لوگ بھی الیکشن لڑ سکیں۔ اس تاریخ ساز فیصلہ کے خلاف بھی اپیل کر دی گئی۔ یہ اپیل پہلی حکومت نے دائر کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ایسا اجتہاد چاہتے ہیں کہ نااہلوں۔ کم علموں اور ہارس ٹریڈنگ والوں کو حکومت ملتی رہے۔ ریس۔ جوا۔ چلتا رہے۔ سود سے ایک کا بھلا اور لاکھوں کی موت ہوتی رہے وغیرہ وغیرہ مغربی کلچر عام ہو۔ عریانی۔ موسیقی عام ہو۔ عریانی۔ موسیقی عام ہو۔ ٹی وی پہ وہ کچھ دکھانے کا طریقہ جاری رہے جس سے دہشت گردی۔ جرائم بڑھتے رہیں۔ جنسی بے راہ روی بھی چلتی رہے اور یورپ کا کلچر عام ہو۔ مذہب سے بیزاری یہاں بھی ایسی ہی ہو جائے جیسی یورپ میں ہے۔ خدا کو بھولنے سے یہ ملک بھی برباد

ہو جائے ۔ بلکہ تباہی ہو رہی ہے ۔ ہیروئن ۔ رشوت ۔ ڈاکے اغوا معمول بن چکے ہیں ۔
اب اخلاقی برائیوں کے متعلق یورپ کے بعض دانشور بھی چلانے لگے ہیں ۔ اس کی تفصیل
کا یہ موقع نہیں ۔ البتہ سود کے متعلق مختصر سن لیجئے :
امریکن رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ جو دنیا میں ۱۵ زبانوں میں ۲ کروڑ ۔ اسی لاکھ سے زیادہ تعداد
میں چھپتا ہے ۔ اس نے سود کے خلاف مضمون لکھنے والے کو فرسٹ پرسن انعام دیا ۔ یہ ایک
خاندان کی کہانی ہے جو قسطوں پر ٹی ۔ وی وغیرہ خریدتا رہا اور مکان بھی قرضہ پہ بنایا مگر ان اشیاء
پر قرض کے سود نے اس خاندان کو اقتصادی طور پہ تباہ کر دیا ۔ جس طرح قرض سے اشیاء خریدنا
خاندان کے لیے تباہ کن ہے ۔ اسی طرح ملک کے لیے بھی تباہ کن ہے ۔ اس مضمون میں بیوی
نے اپنی تمام بپتا بیان کی ہے :
مزید تفصیل و اطمینان کے لیے ملاحظہ ہو

READER'S DIGEST مورخہ اپریل ۱۹۶۱ء

درجاتِ معیشت اور اسلام

ممتاز احمد سالک اسسٹنٹ پروفیسر
ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

ایک اہم اساسی تصور جو اسلام کے معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے، وہ ہے درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت، اسلام کیونکہ ایک حقیقت پسند اور عملی دین ہے اس لیے وہ حقائق کا اپنے زاویۂ نگاہ اور مزاج و مقاصد کے مطابق شعور دلاتا ہے جن پر معاشی زندگی کی تعمیر و سرگرمی کا دارومدار ہوتا ہے۔ وہ کوئی ایسا نعرہ نہیں لگاتا جو عقل، فطرت اور انصاف کے خلاف ہو، اسلیے وہ اس بات کا قائل نہیں ہے کہ نکمے اور محنتی، سست و چست، کمزور و توانا، قابل و نالائق، ماہر و بے ہنر اور تجربہ کار و اناڑی، معاشی سرگرمیوں میں حصّہ لینے اور تماشہ دیکھنے والے، کاروباری خطرہ و نقصان کے امکان کا مقابلہ کرنے والے اور اس سے دامن بچانے والے سارے لوگوں کو ایک معاشی سطح پر رکھا جائے اور انہیں مساوی معاوضہ و نفع کا حقدار سمجھا جائے، اس کے برعکس وہ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ انسانوں کی چونکہ ذہنی صلاحیتیں اور استعدادیں بھی مختلف ہیں اور جسمانی توانائیاں اور قوتیں بھی، ان کے مزاج و طبائع میں بھی فرق ہے اور جذبات و احساسات میں بھی، ان کے اغراض و مقاصد بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور انہیں حاصل کرنے کے انداز و طریقے بھی، اسلیے ان کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی [1]

---

[1] سورۃ اللیل، ۹۲/۴

"درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں"
اس لیے حق وانصاف کا یہ تقاضہ ہے کہ لوگوں کی آمدنی، منافع اور اجرتوں میں کاموں کی نوعیت اور کیفیت وکمیت کے اعتبار سے فرق ہو۔ یہی اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشا بھی ہے۔ یہ ایک تکوینی حق ہے جو اسے حاصل ہے۔ وہ پورے نظام کائنات کو چلاتا ہے اور بندوں کے احوال کو بھی بخوبی جانتا ہے اس لیے اپنی حکمت وارادے سے رزق کی کمی وبیشی کے فیصلے صادر فرماتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا۔[1]

ترجمہ: "بے شک تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے یقیناً وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔"

درجاتِ معیشت میں اس فطری عدم مساوات کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی نیرنگی وگوناگونی قائم ہے لوگ مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں ترقی ورفعت کی لگن زندہ رہتی ہے، مختلف شعبے اور ادارے معرض وجود میں آتے ہیں، قواعد وضوابط مقرر ہوتے ہیں، حقوق واختیارات کی کمی وبیشی کے دائرے متعین ہوتے ہیں لوگوں کو ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہر آدمی کی معاش آزادی ومفادات کے تحفظ کا انحصار دوسروں کی آزادی ومفادات کے احترام پر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک منظم معاشی نظام تشکیل پاتا ہے اور خواہشات کی کثرت اور وسائل کی قلت کی بنا پر انسانوں کو ترجیحات قائم کرنی پڑتی ہیں، اپنی بہت سی غیر ضروری آرزوؤں کو کنٹرول کرنا پڑتا ہے، اپنی آمدنی کو عیش وعشرت، اسراف، لغویات اور نقصان دہ امور پر لٹانے سے بچانا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کے ٹوٹنے پھوٹنے سے اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں۔ بہت سے لوگ وسائل کی کمی کی وجہ سے شر وفساد اور گمراہیوں اور بدکاریوں سے بچ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ خالق کی نافرمانی اور مخلوق سے ظلم اور مخلوق سے ظلم وزیادتی کرنے سے باز رہتے ہیں۔

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل، ۱۷/۳۰

حدیثِ قدسی میں ہے کہ!

"میرے بندے ایسے بھی ہیں جن کی صلاحیت مالداری میں ہے، اگر میں انہیں فقیر بنا دوں تو وہ دینداری سے بھی جاتے رہیں گے اور بعض میرے بندے ایسے بھی ہیں کہ ان کے لائق فقیری ہی ہے، اگر وہ مال حاصل کرلیں اور تونگر بن جائیں تو اس حالت میں گویا ان کا دین بھی فاسد کردوں" [۱]

یہ وہ بہت بڑی حکمت ہے جس کی وجہ سے خالق ورازقِ کائنات نے تمام انسانوں کو کھلا اور وافر رزق نہیں دیا، وہ اپنے بندوں کے مزاج وطبائع اور خوبیوں، خامیوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰکِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ [۲]

ترجمہ :۔ "اگر اللہ اپنے بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور وہ ان پر نگاہ رکھتا ہے"۔

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تشریح میں بجا طور پر لکھا ہے :۔

"اگر دنیا کے ہر فرد پر ہر قسم کے رزق اور ہر قسم کی نعمت کی فراوانی کر دی جاتی تو انسانوں کا ایک دوسرے کے خلاف بغی وفساد حد سے بڑھ جاتا۔ اس لیے کہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے نہ کوئی کسی کا محتاج ہوتا اور نہ ہی کوئی کسی سے دبتا، دوسری طرف دولت مندی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ جتنی دولت بڑھتی ہے اتنا ہی حرص وہوس میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک دوسرے کی املاک پر قبضہ جمانے کے لیے زور و زبردستی کا استعمال عام ہو جاتا، لڑائی، جھگڑے، سرکشی اور دوسری بداعمالیاں حد سے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر : ۴/۱۱۵

[۲] شوریٰ : ۴۲/۲۷

زیادہ بڑھ جاتیں اسلیئے اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو ہر قسم کا رزق اور ہر قسم کی نعمت دینے کی بجائے ان نعمتوں کو اپنے بندوں پر اس طرح تقسیم کیا ہے کہ کسی کے پاس مال و دولت زیادہ ہے، کوئی صحت و قوت میں دوسرے سے بڑھا ہوا ہے، کوئی حسن و جمال سے مالا مال ہے، کسی کے پاس علم و حکمت کی دولت دوسروں سے زیادہ ہے۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی چیز کے لیے دوسروں کا محتاج ہے اور اسی باہمی احتیاج پر تمدن کی عمارت قائم ہے"[1]

درجاتِ معیشت میں تفاوت کی دوسری بڑی حکمت یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے کام آسکیں اور ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ وہ اس قدر آزاد اور خود مختار نہ ہو جائیں کہ ایک معاشرہ اور منظم اجتماعیت ہی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ انسان ایک معاشرت پسند مخلوق ہے۔ وہ اپنے قیام و بقا، اور تعمیر و ترقی کے لیے اجتماعی زندگی کا محتاج ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک اپنی خواہشات کی تسکین اور ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسروں کا تعاون لینے اور ان سے تعاون کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار، اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے استعمال اور اپنی ترقی و خوشحالی کے حصول کے لیے معاشرتی زندگی کا ضرورتمند ہے۔ وہ معاشی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ اسی صورت میں لے سکتا ہے جبکہ اس کے لیے مواقع کھلے ہوں، کامیابی و ترقی کے امکانات اور مقابلہ و مسابقت کے آزادانہ ذرائع میسر ہوں۔ زیادہ کوشش و کاوش سے اسے زیادہ منافع و صلہ ملے۔ اور درجاتِ معیشت میں بلندیوں تک پہنچ سکے۔ اور پھر معاشی جدوجہد کا سلسلہ حقوق مراتب پر استوار ہوتا ہے۔ کسی بھی کاروباری ادارے کو لے لیں، اس سے وابستہ لوگوں کے کام کی نوعیت اور فرائض و ذمہ داریوں کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک شخص تو وہ ہوتا ہے جو منتظمِ اعلیٰ ہوتا ہے جو سارے ادارے کے تمام معاملات کا نگران اور اس کے نفع و نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی ادارے کی کامیابی و ناکامی ہوتی ہے، دوسری سطح فنی ماہرین، منتظمین و معاونین کی ہوتی ہے جو مختلف ذیلی شعبہ جات کی قیادت کرتے ہیں۔ ایک اور سطح رابطہ رکھنے، ریکارڈ محفوظ کرنے، اشیاء فراہم کرنے اور ارسال کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ ایک اور سطح تکنیکی صلاحیت رکھنے والوں اور جسمانی محنت کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ چپڑاسی، چوکیدار اور مالیوں تک بات پہنچ جاتی

---

[1] معارف القرآن ۶۹۸/۷

ہے۔ یہ ساری سطحیں تقسیم کار کے لیے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ ان کی حکمت یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور منظم و مربوط انداز میں اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکیں۔ ان کی اجرتوں کا فرق کام کی کیفیت و نوعیت اور ذمہ داریوں کے مطابق ناگزیر ہوتا ہے تاکہ انہیں پورا پورا صلہ مل سکے اور اپنی محنت، صلاحیت، مہارت اور تجربے میں اضافہ کر کے مزید آگے بڑھنے کا جذبہ بھی حاصل کر سکیں، ہر قسم کی معاشی سرگرمیوں میں یہ جذبہ قوتِ متحرکہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس پورے معاشرے میں درجات معیشت میں فطری تفاوت کی بنا پر لوگ ایک دوسرے سے کام لینے اور ایک دوسرے کا کام کرنے اور باہمی معاونت و مدد پر مجبور ہیں۔ کوئی فرد یا ادارہ اپنی تمام حاجات ضروریات خود پوری نہیں کر سکتا، معاشرے کے مختلف افراد اور ادارے مل کر اپنی صلاحیت، ذوق، مفادات اور مواقع کے مطابق انہیں پورا کرتے ہیں اسی لیے مختلف پیشے معرض وجود میں آتے ہیں، نئے نئے کاروبار شعبے میدانِ عمل میں اترتے ہیں، نئی سرگرمیاں، تعلقات اور روابط پیدا ہوتے ہیں اور معیشت کی گاڑی رواں دواں رہتی ہے۔ یہ تعلقات و روابط جب ایک خاص شکل میں ڈھلتے ہیں تو "معاشی نظام" جنم لیتا ہے۔ یہی سلسلہ جب بین الاقوامی سطح تک وسیع ہوتا ہے تو "عالمی اقتصادی نظام" نمودار ہوتا ہے۔ اس طرح پوری دنیا ایک دوسرے کی محتاج اور ایک دوسرے کی معاون بن جاتی ہے یہ سب کچھ رب کائنات کی عظیم حکمت کا نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا[1]

ترجمہ:۔ "ہم نے دنیا کی زندگی میں وسائل رزق ان میں تقسیم کر دیئے ہیں اور کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں"

تیسری حکمت جو درجات معیشت کے غیر مساوی ہونے کے بارے میں قرآن حکیم میں بیان کی گئی ہے وہ "آزمائش" ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو وسائل دے کر آزماتا ہے اور کسی سے لے کر، کسی کو فقر، افلاس، مصائب اور معاشی تنگیوں میں مبتلا کر کے یہ دیکھتا ہے کہ کسی حد تک صبر کرتا ہے۔ اور کسی کو مال و اسباب کی

---

[1] سورۃ الزخرف ۴۳: ۳۲

بہتات، عیش و عشرت کے سامان اور فراخی و امارت دے کر یہ دیکھتا ہے کہ اس نے کہاں تک اپنے رب کو پہچانا اور اس کا شکر ادا کیا۔ صبر و شکر محض زبان سے ادا کیے ہوئے الفاظ کا نام نہیں بلکہ رویے اور طرزِ عمل کا نام ہے کہ دونوں صورتوں میں انسان اللہ کو فراموش نہ کرے اور اس کی بتائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرے بلکہ ہر حالت میں اسی کی فرمان برداری و اطاعت کا عملی ثبوت پیش کرے اور گمراہی و فساد کی راہوں پر گامزن نہ ہو وہ انہی رویوں کی بنا پر سزا بھی دیتا ہے اور مغفرت بھی کرتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنے لیے کیا پسند کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [1]

ترجمہ :۔ "وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

امام طبریؒ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جو فضل اس نے تم پر کیا ہے اور جو رزق تمہیں عطا فرمایا ہے اس بارے میں تمہارا امتحان کر کے اطاعت گذار و نافرمان کو جان لے، اور یہ دیکھے کہ جس امر کا حکم اس نے دیا ہے یا منع فرمایا ہے تو کون اس کا حق ادا کرنے والا اور کون اس میں کوتاہی برتنے والا ہے؛ [2] مولانا مودودیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ اس میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں :۔

ایک یہ کہ تمام انسان زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرف کے اختیارات بخشے ہیں۔

---

[1] سورۃ الانعام : ۱۶۵/۶

[2] تفسیر طبری : ۲۸۹/۱۲

دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے، کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدود، کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرف کے اختیارات دیئے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر، کسی کو زیادہ قوتِ کارکردگی دی ہے اور کسی کو کم اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانت ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے، اور جس کو جو کچھ بھی میسر ہے خدا نے دیا ہے اور اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرف کیا، کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی قابلیت یا ناقابلیت کا ثبوت دیا، اسی امتحان کے نتیجہ پر زندگی کے دوسرے مرحلے میں انسان کے درجے کا تعین منحصر ہے[1]

اللہ تعالیٰ فقر و تونگری کے ذریعے صرف عام لوگوں ہی کو نہیں آزماتا بلکہ اس نے انبیاءؑ تک کو آزمایا ہے ایک نبی کی حیثیت سے حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دو مختلف طریقوں پر ان کے ایمان، عقیدے اور اصولوں پر کاربند رہنے کی آزمائش کی حضرت سلیمانؑ کو صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جنوں اور پرندوں کے لشکروں تک حکمرانی دے دی۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ[2]

ترجمہ:۔ "سلیمان کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے"

ان سارے وسائل و اختیارات کے باوجود ان میں نہ تو تکبر پیدا ہوا اور نہ ہی سرکشی، نہ انہوں نے کبھی اپنے رب کی نافرمانی کی اور نہ ہی اپنی شاہی و سلطنت کے گھمنڈ میں لوگوں پر ظلم و استبداد کیا اور ان کے حقوق مارے۔ بلکہ اپنے قول و عمل سے شکر کا مظاہرہ کیا جو کہ صبر سے زیادہ مشکل و کٹھن ہوتا ہے کیونکہ مجبوری و بے چارگی میں تو آدمی صبر کر ہی لیتا ہے لیکن شکر خالصتاً آزاد مرضی و ارادے سے ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سارے وسائل و اختیارات ان کے لیے آزمائش ہیں چنانچہ پلک جھپکنے کی دیر کے اندر ان کے سامنے ملکہ سبا کا تخت حاضر کر دیا گیا تو پکار اٹھے۔

---

[1] تفہیم القرآن ۱ / ۶۰۶

[2] سورۃ النمل ۲۷ / ۱۷

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ط وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ [1]

ترجمہ:۔ "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب غنی اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے"

اس کے برعکس حضرت ایوب علیہ السلام کے مال، جائیداد، اہل خانہ، اولاد اور ہر چیز کو چھین لیا گیا یہاں تک کہ ان کے اپنے جسم میں کیڑے پڑ گئے اور اس آزمائش میں چند دن نہیں بلکہ تقریباً اٹھارہ سال تک مسلسل مبتلا رہے۔ لیکن انہوں نے صبر واستقامت کا پیکر بن کر یہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلیں، نہ تو منہ پر کوئی حرف شکایت لائے اور نہ ہی عقیدہ وایمان میں کوئی خلل واقع ہوا، نہ وہ ہدایت وصداقت کی راہ سے ہٹے اور نہ ہی مایوسی اور ناامیدی کے گڑھے میں گرے۔ اپنے رب کے حضور صرف اتنا کہا:۔

اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ [2]

ترجمہ:۔ "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے"

جب وہ اس آزمائش پر پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کی تمام کھوئی ہوئی چیزیں دگنا کر کے پلٹا دیں اور ان کی تعریف ان الفاظ میں کی:۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ط نِعْمَ الْعَبْدُ ط اِنَّهٗ اَوَّابٌ [3]

ترجمہ:۔ "بلا شبہ ہم نے اسے صابر، بہترین بندہ اور رجوع کرنے والا پایا"

اللہ تعالیٰ کا یہ مستقل طریقہ ہے کہ مختلف انداز سے اپنے بندوں کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ ان میں وسائل رزق کی کمی بیشی بھی شامل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَ

---

[1] سورۃ النمل: ۲۷/۴۰

[2] سورۃ الانبیاء: ۲۱/۸۳

[3] سورۃ ص: ۳۸/۴۴

الثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ [1]

ترجمہ:۔ "ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کرکے آزمائیں گے۔ ان حالات میں صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو،،

مذکورہ بالا آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درجات معیشت میں تفاوت اپنی وسیع تر حکمتوں کے پیش نظر رکھا ہے ان میں ایک معاشی وسماجی امن واستحکام، دوسری لوگوں کا ایک دوسرے سے کام لینا، اور تیسری لوگوں کی آزمائش کرنا ہے۔ علاوہ ازیں ان تینوں حکمتوں سے وابستہ بے شمار دوسری حکمتیں بھی ہیں جن کا ہم روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ مقرر کیا ہے اس لیے ہر اعتبار سے مفید بھی ہے اور اٹل بھی اور فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فطرت اور قوانین فطرت کا بھی خالق ہے۔ ساری دنیا مل کر فطرت کے اس قاعدے اور کلیے کو تبدیل نہیں کرسکتی اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کرے گی تو خود فطرت سے جنگ کرے گی، اور فطرت سے جنگ خود انسان کی اپنی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس سے ان کے پورے نظام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ دور حاضر میں اس کا تجربہ اشتراکیت نے کرکے دیکھ لیا ہے اس نے "معاشی مساوات" کا نعرہ لگا کر اس تفاوت کو مٹاتے مٹاتے انسانوں کے تمام حقوق و آزادیوں کو پامال کردیا لیکن پھر بھی عملاً یہ تفاوت ختم نہ کرسکے، مناصب، اختیارات، وسائل، سہولیات اور آمدنیوں میں فرق آزاد معیشت سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ جن لوگوں کا نام لے کر اور جن کے مفادات کا نعرہ لگا کر زبردستی ان پر یہ غیر فطری نظام مسلط رکھا گیا تھا، خود وہی چیخ اٹھے اور انہوں نے اسے اتار پھینکا ہے۔ اور اس کے بانیوں کے مجسموں کو زمیں بوس کردیا ہے اور اس کی ہر ہر علامت کو مٹانے کے درپے ہو گئے ہیں۔

اس کے برعکس دوسرا نظام جو اس وقت تقریباً ساری دنیا پر مسلط ہے، وہ نظام سرمایہ داری ہے۔ جس کی بنیاد سرمائے پر ہے جو ایسے لوگوں کو پیس کر رکھ دیتا ہے جن کے پاس سرمایہ نہیں ہے جو معاشی تفاوت کو فطری نہیں رہنے دیتا بلکہ مصنوعی مداخلتوں، اجارہ داریوں، بے اعتدالیوں اور فاسد و ظالمانہ کاروائیوں کی کھلی چھٹی دے کر پورے معاشرے کو حریص، لالچی، خود غرض، بے رحم اور سفاک سرمایہ داروں

---

[1] سورۃ البقرۃ : ۲/۱۱۵

اور جاگیر داروں کے قبضے میں دے دیتا ہے۔ یہ لوگ "معاشی مساوات" کے بالمقابل "معاشی آزادی" کے پُرفریب نعرے کے ذریعے سارے وسائل رزق پر قابض ہو جاتے ہیں اور سود، جتھہ بندی، احتکار و اکتناز، دھوکہ، غبن، ملاوٹ، اشتہار بازی اور دیگر بے شمار طریقوں سے معیشت کی رگ رگ کا خون نچوڑ لیتے ہیں اور تمام انسانوں کو مہنگائی، بیروزگاری، فقر و افلاس اور شدید معاشی بحران سے دوچار کر دیتے ہیں اور بڑی چالاکی اور عیاری سے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہی ان کے حقیقی خیر خواہ ہیں۔ اس طرح خود انہیں کے اعتماد اور ووٹوں سے سیاست، معیشت، معاشرت ابلاغیات اور قانون کے دیوانوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

مجلس و آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں نظام عوام کا استحصال کرتے ہیں اور معاشی تفاوت کی خلیج کو وسیع کر دیتے ہیں، ان کے خوش کن نعرے محض دھوکہ اور فریب ہیں۔ ان سے ایک عام آدمی کی مشکلات و مصائب کا مداوا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ افراط و تفریط کا شکار ہیں اور طبقاتی تقسیم ان کا خاصہ ہے۔

ان کے برعکس ایک ہمہ گیر اور جامع معاشی نظام وہ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ جو اپنے مقاصد روح، مزاج اور تقسیم دولت کے طریق کار اور اثرات و نتائج کے اعتبار سے بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ درجاتِ معیشت کے جس تفاوت کا اسلام قائل ہے وہ یہ تفاوت نہیں ہے جس سے آج پوری دنیا دوچار ہے۔ جس کا ہم عملی طور پر صبح و شام مشاہدہ کر رہے ہیں۔ جو اجارہ دار طبقوں کے ظلم، استحصال، سازشوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ جو نہ فطری ہے نہ اخلاقی ہے، نہ قانونی ہے اور نہ ہی انسانی یہ عہدِ حاضر کے ظالمانہ نظاموں کی پیدا کردہ ہے۔ یہ مصنوعی تفاوت ہے جو طلب و رسد کی فطری قوتوں پر حکومتوں اور سرمایہ داروں کے غاصبانہ کنٹرول کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ جس سے تمام معاشرے مسلسل طبقات میں بٹتے جا رہے ہیں۔ جو سرمایہ دار و مزدور، محتاج و غنی، جاگیر دار و کسان، امیر و غریب، حقوق یافتہ و محروم کی صورتوں میں نمایاں ہیں۔ ان میں طبقاتی کشمکش کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے جو معیشت کے تمام شعبوں اور دائروں پر محیط ہے۔ اس سے انتشار و افتراق بھی پیدا ہو رہا ہے اور انسانی

و مادی وسائل کا ضیاع بھی، موجودہ وضعی نظاموں کے ہوتے ہوئے اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ایک تو اس لیے کہ اس کشمکش کے پیچھے کوئی اخلاقی اصول کارفرما نہیں ہے۔ اس کا مدار لالچ، خودغرضی اور دباؤ پر ہے، اور دوسرا اس لیے کہ ان نظاموں نے اسے فلسفیانہ بنیاد فراہم کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ جدوجہد عمل اور تصادم ارتقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ کیونکہ کائنات میں جہد احیاء (ST ruggle To Revive) اور بقائے اصلح (Surrvival of Fitist) کا اصول کارفرما ہے اور فطرت کا قانون یہ ہے کہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"۔

اسلام اس مصنوعی تفاوت کو ختم کرنا چاہتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں فساد کا باعث بنتی ہے، جو معیشت کو تباہ و برباد اور اصل حقداروں کو جائز صلے سے محروم کر دیتی ہے یہ تفاوت خالق کائنات کی مرضی کی بنا پر نہیں بلکہ یہ اس کے خلاف بغاوت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہو رہی ہے اس لیے اس کو مٹانے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر ایک نیا نظام استوار کیا جائے اور ایسے تمام نظاموں کی بساط لپیٹ دی جائے جو تفاوت کو بھی پیدا کرتے ہیں اور تصادم بھی، اسلام اپنے خطۂ اقتدار میں اصلاحی اور قانونی تدابیر سے اس طرح کے مصنوعی تفاوت اور اس کے ذرائع کو مٹا دیتا ہے، احتکار، اکتناز، جتھہ بندی، اجارہ داری، سودی کاروبار، جوا، سٹہ، سب اسلام میں ممنوع ہیں اور یہ قابل گرفت تعزیری جرائم ہیں۔ جو اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے غلط ہیں۔ علاوہ ازیں ہر ایسا کاروبار اور طریقہ غلط ہے جس میں ایک کا فائدہ دوسرے لوگوں، اداروں یا پورے معاشرے کے لیے نقصان و زحمت کا باعث ہو، اس کا فیصلہ بدلتے حالات کے مطابق علماء، فقہاء اور اہل فکر و فن خود ہی کر سکتے ہیں۔

اسلام صرف اس تفاوت کو درست سمجھتا ہے جو خود ساختہ نہ ہو بلکہ خالصتاً فطری ہو، یعنی ذہانتوں، قابلیتوں، استعدادوں، مہارتوں اور محنت کی نوعیت، کمیت اور کیفیت، سرمائے کی مقدار، خطر و نقصان کا اندیشہ مول لینے اور قدرتی حالات کے تغیر و تبدل سے پیدا ہو رہی ہو، اسلام اسے نہ تو مستقل حیثیت دیتا ہے اور نہ ہی مصنوعی طریقے سے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ حلال و حرام کی قید کے ذریعے اسے کنٹرول کرتا ہے، مواقع کی یکسانیت کے ذریعے تبدیل کرتا ہے اور زکوٰۃ و انفاق کے ذریعے تحلیل کرتا ہے۔ اسلام کا بہت بڑا معاشی اصول "گردش دولت" ہے وہ اس بات

کو سخت ناپسند کرتا ہے کہ دولت چند لوگوں یا خاندانوں یا طبقوں یا ملکوں میں مرتکز ہو جائے۔ اس لیے اموال فے کی مستحقین فہرست پیش کر کے اس کی روح یہ بیان کی ہے کہ:

كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْكُمْ [1]

ترجمہ: "تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے"

اسلام نے صرفِ دولت، تقسیم دولت اور تبادلہ دولت کے جو زریں اصول متعین کیے ہیں ان سب کی روح گردش ہے۔ چنانچہ نفقات، کفارات، صدقات، وراثت، وصیت، ہبہ وغیرہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔

علاوہ ازیں اسلام کے نزدیک درجاتِ معیشت کے اس فطری تفاوت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگوں کو حالات کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ جسے چاہیں سربلند کریں اور جسے چاہیں نیست و نابود کر دیں۔ اور مختلف طبقات اور گروہ مقابلہ و مسابقت کی مادی دوڑ میں ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے اور ہڑپ کر جانے کے لیے کوشاں ہوں اور حکومت حالات کے جبر اور طبقات کے استبداد کا تماشائی بن کر مظاہرہ دیکھے۔ بلکہ تصورِ خلافت کی بنا پر اس کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ ہر طرح کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کا ازالہ بھی کرے اور ان کی راہیں بھی مسدود کر دے، تاکہ کوئی کسی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے اور پورے نظامِ معیشت میں طلب و رسد کے قوانین اور فطری عوامل صحیح معنوں میں کارفرما رہیں اور ہر طرح کی مصنوعی مداخلتیں بند کر دی جائیں۔ اس کے باوجود اگر کچھ لوگ اپنی ضروریات کے مطابق نہ کما سکیں تو ان کی کفالت اور بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کے ذمے ہے۔ تاکہ کوئی محروم نہ رہے۔ زکوٰۃ کا پورا شعبہ اس غرض کے لیے قائم کیا گیا ہے کہ تلاشِ معاش میں پیچھے رہ جانے والے لوگوں کو نامساعد حالات کا تر نوالہ بننے سے بچایا جائے اور جو لوگ ان میں قابلِ کار ہوں، انہیں دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا جائے اور جو لوگ مستقل طور پر مجبوری و معذوری سے ہمکنار ہو جائیں تا دمِ مرگ ان کی تمام معاشی ضروریات پوری کی جائیں۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر زکوٰۃ فرضے کی آمدنی ناکافی ہو جائے تو اہلِ ثروت پر مزید ٹیکس لگا کر حکومت کفالتِ عامہ کا اہتمام کرے۔

---

[1] سورۃ الحشر: ۵۹/۷

اسلام درجاتِ معیشت کی بجائے "حقِ معیشت" میں مساوات کا قائل ہے۔ اسلامی ریاست میں بسنے والے ہر مسلم و غیر مسلم، عورت و مرد اور پیر و جواں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے جب، جہاں اور جتنا کمانا چاہے کما سکتا ہے۔ اسے ترقی کے یکساں مواقع اور حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام اشیاء کو سارے انسانوں کے فائدے اور استفادے کے لیے بنایا ہے، کسی خاص خاندان، نسل، طبقے، گروہ، قوم یا ملک کے لیے نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ [1]

ترجمہ:۔ "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا ہے اور تمہارے لیے سامان زیست پیدا کیا ہے"

اس آیت میں سارے انسانوں کو بحیثیت انسان مخاطب کیا گیا ہے اس لیے ایسا انتظام کرنا ناگزیر ہے، جس میں سارے انسانوں کو اپنے ذوق، صلاحیت اور جدوجہد کے مطابق زمین کے اوپر اور اس کے اندر پائے جانے والے بے شمار وسائل و ذرائع سے بھرپور فائدے حاصل کرنے کے یکساں مواقع میسر ہوں، چنانچہ ہر ایسا اصول، ضابطہ، نظام اور طریقہ غلط ہے جو مصنوعی امتیازات، ناروا بندشوں اور اجارہ داریوں کا باعث بنے، جس میں مخصوص طبقات اور اہل اقتدار و ثروت کے مفادات کا تحفظ کیا گیا ہو جو اجتماعیت و عوام الناس کے مقابلے میں انہیں کی فوقیت و بالادستی کا ضامن ہو، اس لیے کہ اسلام کسی طبقے کا نمائندہ اور وکیل نہیں ہے، یہ تو پوری انسانیت کا خیر خواہ ہے اور ایک عالمگیر اور جہانی نظریہ ہے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں عدل کو قائم کر کے تمام لوگوں کو اس کا پابند کر دینا اس کا مطمع نظر ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ [2]

---

[1] سورۃ الاعراف : ۷/۱۰

[2] سورۃ الحدید : ۵۷/۲۵

ترجمہ:۔ "ہم نے اپنے رسولوں کو ہدایت و نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں"

اسلام کے نزدیک معاشی عدل یہ ہے کہ تمام انسانوں کو کمانے کے یکساں حقوق اور مواقع میسر ہوں۔ حلال و حرام کی قید سب کے لیے یکساں ہو۔ اعمال و افعال کی جزا و سزا کا معیار یکساں ہو، اپنی ملکیت و کمائی پر حقوق و اختیارات مساوی ہوں، اور قوانین کے سامنے امیر و غریب، حاکم و محکوم، قوی و کمزور، اعلیٰ و ادنیٰ، کالا و گورا، عربی و عجمی، مرد و عورت، چھوٹا و بڑا اور مسلم و غیر مسلم سب برابر ہوں، کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ برتا جائے اور سب کے جذبات و احساسات، ضروریات و مفادات کا پورا پورا احترام کیا جائے۔ عدل و مساوات کے ان تصورات کو عملی سانچوں میں ڈھالنے اور محسوس حقیقت کا روپ دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی ریاست معرض وجود میں آئے جو اپنی قوت اور وسائل کے ذریعے احکام خداوندی کو نافذ کر کے ایک مثالی معاشرہ دنیا کے سامنے پیش کردے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اور ان کے بعد خلفائے راشدین نے اپنے قول و عمل سے ایسا کر کے دکھایا۔ انہوں نے حق معیشت میں مساوات کے تصور کو پورے معاشی نظام، معاشی سرگرمیوں اور معاشی پالیسیوں کی بنیاد بنایا، اور تمام ناجائز مداخلتیں بند کر دیں۔ جہاں تک ریاست کے اپنے بیت المال اور وسائل کا تعلق ہے اس میں تو بطور خاص مساوی حقوق کا اہتمام کیا، مال غنیمت و خراج کی تقسیم اور سرکاری خزانے سے وظائف کے تعین میں ہی اصول کار فرما رہا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے اپنی خلافت کے پہلے سال غنیمت تقسیم کی تو انہوں نے آزاد، غلام، عورت اور اس کی خادمہ سب کو دس دس درہم دیئے، دوسرے سال سب کو بیس بیس درہم دیئے۔[1] بعض لوگوں نے کہا کہ آپ نے تمام لوگوں کو برابر کر دیا ہے حالانکہ بہت سے لوگوں کے فضائل ان کی ترجیح کی سفارش کرتے ہیں تو جواب دیا "فضائل کا ثواب اللہ تعالیٰ دے گا، یہ تو معاش کا معاملہ ہے، اس میں مساوات ہی بہتر ہے"[2]

---

[1] طبقات ابن سعد : ۳/۱۹۳

[2] کتاب الاموال : ۲۴۵

حضرت عمر فاروق رضؓ نے بھی اس پالیسی کو آگے بڑھایا اور بیت المال میں سب لوگوں کا حق تسلیم کیا اور اسے ادا کرنے کا عزم کیا اور اپنے آپ کو تمام لوگوں کے برابر قرار دیا، البتہ وظائف کی مقدار میں اسلام میں سبقت، اس کی راہ میں قربانیوں اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قربت کی بنا پر درجہ بندی کی چنانچہ حضرت سائب بن یزید سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضؓ کو تین مرتبہ کہتے ہوئے سُنا :

" قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں لوگوں میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا اس مال میں حق نہ ہو کہ وہ اسے دے دیا گیا یا روک لیا گیا، ان میں مملوک غلام کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی سے زیادہ حقدار ہو اور میں خود بھی اس معاملے میں ایسا ہوں جیسا کوئی اور فرد، لیکن ہم لوگ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق کے مطابق اپنے مراتب و اقسام پر ہیں۔ ایک شخص اور اس کا اسلام کی راہ میں مصیبت جھیلنا، ایک اور شخص اور اس کا قبولِ اسلام میں قدیم ہونا، ایک اور شخص اور اسکی اسلام میں بے نیازی، ایک اور شخص اور اس کی اسلام میں محتاجی وغیرہ، اگر میں زندہ رہا تو کوہِ صفا کے چرواہے کے پاس بھی اس مال میں سے اس کا حصّہ ضرور پہنچے گا، حالانکہ وہ اپنے مقام پر ہوگا۔" [۱]

بعد میں انہوں نے درجہ بندی کے سلسلے میں اپنی رائے سے رجوع کرلیا چنانچہ ان کے خادم حضرت اسلم سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضؓ کو یہ کہتے سُنا :

" اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو بالضرور بعد میں آنے والے لوگوں کو پہلے والوں میں شامل کردوں گا تاکہ وہ سب برابر ہو جائیں" [۲] ایک اور روایت کے مطابق فرمایا "سب سے کم مرتبے والوں کو سب سے اعلیٰ مرتبے والے سے ملا دوں گا۔" [۳]

۱؎ کتاب الخراج : ۴۶ ، طبقات ابنِ سعد : ۳/۲۹۹

۲؎ " ، کتاب الاموال : ۲۴۵

۳؎ طبقات ابنِ سعد : ۳/۳۰۲

اسی طرح اموالِ فیٔ کے بارے میں حضرت علیؓ کا طرزِ عمل بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح مساویانہ تقسیم ہی تھا۔[1] حقِ معیشت میں مساوات کے اس اسلامی تصور کا یہ نتیجہ نکلا کہ صدرِ اسلام میں خصوصاً اور مابعد کے مسلم معاشرں میں عموماً درجاتِ معیشت میں تفاوت کے باوجود طبقاتی کشمکش کا کوئی نظریہ کبھی فروغ نہیں پا سکا اور نہ ہی معاشی تفاوت کی بنا پر طبقاتی تصادم و انتشار برپا ہوا۔ جیسا کہ لادینی معاشروں میں عام طور پر رہا ہے۔ کیونکہ وہ معیشت کے کسی اعلیٰ انسانی و اخلاقی اصول کے بجائے انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت اور معاشروں پر "ارباب من دون الله" کی بالادستی و تسلط کے زیرِ اثر رہے ہیں۔ دورِ جدید میں مسلمانوں کی معاشی غلامی و بدحالی، انتشار و افتراق اور کہیں کہیں طبقاتی تفریق و تصادم کا بنیادی سبب یہی ہے کہ فکری و عملی طور پر نظامِ سرمایہ داری و اشتراکیت کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور اسلامی تصورات و اقتدار کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

اسلامی معاشرے کی اساس تعاون ہے۔ جو زندگی کے تمام شعبوں کو منظم و مضبوط کرتا ہے۔ فرد اور فرد کے مابین، فرد اور اجتماع کے مابین، گروہوں اور اداروں کا دوسرے گروہوں اور اداروں کے ساتھ تعاون ہی وحدت و اخوت کی بھی پیش خیمہ بن جاتا ہے اور معاشی استحکام و ترقی کا بھی۔ شرط یہ ہے کہ وہ صرف نیکی، بھلائی اور جائز معاملات کے اندر ہو۔ ظلم، استحصال اور بدنیتیوں کیلئے نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[2]

ترجمہ: "نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ و زیادتی کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو۔"

اسلام نے مالک و ملازم، آجر و اجیر، زمیندار و کسان، امیر و غریب، سب کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور مددگار اور بھائی قرار دیا ہے۔ ان کے باہمی تعلق کی نوعیت آقا و غلام کی نہیں بلکہ برابر کی سطح پر کام کرنے والے کاروباری فریق اور شرکائے کار کی ہے جن کے معاہدے کی بنیاد یہ ہے کہ ایک سرمایہ لگائے گا اور دوسرا محنت، دونوں کا منصب، کام کی نوعیت و حدود اور ذمہ داریاں مختلف ہونے

---

[1] کتاب الاموال : ۲۴۵

[2] سورۃ المائدہ : ۵/۲

کے باوجود مفاد و بھلائی مشترک ہے۔ دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں جن کو ادا کرنے کے وہ یکساں طور پر ذمہ دار اور جوابدہ ہیں، قانون کے آگے بھی اور اپنے رب کے آگے بھی۔ دونوں بطور انسان مقام و مرتبہ اور عزت و احترام کے مستحق ہیں جیسے دو سگے بھائی وسائل کی کمی و بیشی کے باوجود یکساں حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہاں اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ کون اپنی ذمہ داری کو صحیح طور پر ادا کرنے والا اور اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا ہے اور کون کم،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ [1]

ترجمہ: " تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ ڈرنے والا ہے۔"

اسلام نے درجات معیشت کے تفاوت کو تو تسلیم کیا ہے کہ اس میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں لیکن مال و دولت کو سماجی حیثیت کی بنیاد نہیں بننے دیا، کیونکہ تمام معاشی خرابیوں کی جڑ مال و دولت نہیں ہے بلکہ اس کی سماجی اساس ہے۔ مادہ پرستانہ نظاموں میں ایک گروہ کو مال و دولت کی وجہ سے محض آسائشیں، سہولیات اور فراخی حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ قوت حاصل ہو جاتی ہے جس کے ذریعے وہ بڑے بڑے سماجی، سیاسی، معاشی، قانونی اور فکری مراکز پر قابض ہو جاتا ہے۔ اور معاشرے میں فساد و بگاڑ پیدا کرنے اور خلق خدا کو اپنی خواہشات نفس کا غلام بنانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور تمام وسائل و ذرائع کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سفارش، رشوت، اثر و رسوخ، تعلقات، اور اقتدار و اختیار کے ذریعے اپنی اولاد، خاندان اور طبقے کے لیے ترقی کی راہیں ہموار کرتا ہے اور عوام الناس کے آگے مصنوعی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ اگر وہ سیاسی اختیارات و مناصب پر تسلط حاصل کرتا ہے تو فرعون کی طرح اپنے آپ کو اقتدار اعلیٰ کا مالک سمجھتے ہوئے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی [2] کا دعویدار بن جاتا ہے اور اگر اسے مال و دولت کی فراوانی حاصل ہوتی ہے تو اس پر اترانے لگتا ہے۔ اور اسے اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت اور علم معیشت میں اپنی سمجھ بوجھ و مہارت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے قارون کی طرح اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

---

[1] سورۃ الحجرات : ۴۹/۱۳

[2] سورۃ النٰزعٰت : ۷۹/۲۴

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؎۱

ترجمہ: "اس نے کہا "یہ تو مجھے اس علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔"

ہر دور میں انبیاء کرام کی دعوت کو کھاتے پیتے لوگوں اور حقوق یافتہ طبقوں نے اس لیے مسترد کردیا کہ وہ ان کی سماجی حیثیت کو چیلنج کررہی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر مروجہ جاہلانہ نظام ختم ہوا تو ان کے اپنے تسلط کا خاتمہ ہوجائیگا۔ اور پسے ہوئے محروم لوگوں کو سربلندی و سرفرازی ملے گی۔ اس لیے وہ ایسے پیغام و نظام کو برحق ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ عام لوگوں پر اپنا رعب برقرار رکھنے، انبیاء کو لاجواب کرنے اور اپنے دلوں کو جھوٹی تسلیاں دینے کے لیے ہی یہ پراپیگنڈہ کرتے تھے کہ ان کی کثرت مال و اولاد جس طرح دنیا میں ان کے لیے عزت و شرف کا ذریعہ ہے اسی طرح اگر آخرت ہوئی تو اس میں بھی وہ انہیں عذاب سے ہمکنار نہیں ہونے دے گی۔ قرآن حکیم نے ان کے اس رویے اور تصور کو یوں بیان کیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ؎۲

ترجمہ: "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو، "جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں،،

ان کے اس زعم باطل کا جواب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہی بتایا:

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ؎۳

؎۱ سورۃ القصص : ۲۸/۷۸

؎۲ سورۃ سبا : ۳۴/۳۵ و ۳۴

؎۳ سورۃ سبا : ۳۴/۳۶

ترجمہ:۔ "اے نبی، ان سے کہو میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا عطا کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے"

یعنی یہ اہل ثروت درجات معیشت کی اصل حکمت ہی سے ناواقف ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ان کے لیے عزت و تکریم، کامیابی و کامرانی اور مقرب خداوندی ہونے کی دلیل ہے۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک اصل معیار و پیمانہ، ایمان اور عمل صالح ہے جن لوگوں کی ترقی کی بنیاد یہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے احکام، نظام اور آیات کی مخالفت ہے وہ تو عذاب کے مستحق ہیں۔ چنانچہ اگلی آیات میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ [1]

ترجمہ:۔ "یہ تمہاری مال و دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔۔۔۔۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے، رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے"

اسلام یہ کہتا ہے جو لوگ ظلم، استحصال، حرام خوری اور بغاوت و نافرمانی کے ذریعے مال و دولت حاصل کرتے ہیں، وہ کسی عزت و فضیلت کے مستحق نہیں ہیں، حقیقی معنوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی، جاہلانہ نظام مصنوعی طور پر انہیں لوگوں کے سروں پر مسلط کر دیتے ہیں جو خلوص دل سے نہیں بلکہ ان کے شر و فساد سے محفوظ رہنے کے لیے، مجبوراً انہیں سلام کرتے ہیں اور ان کی بات مانتے ہیں یا ان کے کسی دامِ فریب میں مبتلا ہو کر ان کے پیچھے چلتے ہیں، لیکن جب حقیقتِ حال ان

---

[1] سورۃ سبا: ۳۴/۳۷،۳۶

کے سامنے آتی ہے تو ان پر لعنتیں بھیجتے ہیں، ان کے برعکس صداقت، دیانت اور امانت و انصاف کے ساتھ، جائز ذرائع سے کمانے والے لوگ صحیح معنوں میں عزت و تکریم کے مستحق ہوتے ہیں وہ مقدار کے اعتبار سے مال و دولت کم حاصل کریں یا زیادہ، معاشرہ دل کی گہرائیوں سے ان کی قدر کرتا ہے اور انہیں جو سماجی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ اصلی اور حقیقی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کو عدل و انصاف ملتا ہے سائل و محروم کی مدد ہوتی ہے، حقداروں کی داد رسی ہوتی ہے اور نیکیوں اور بھلائی کے کاموں کی ترویج و اشاعت ہوتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں محض مال و زر کی بہتات کی وجہ سے کسی سرمایہ دار، جاگیردار اور حکمران کا نام روشن نہیں رہا نہ ہی انسانیت نے انہیں اسی وجہ سے خراج تحسین پیش کیا۔ بلکہ ہمیشہ ان لوگوں کو عزت و تکریم سے یاد رکھا اور ان کی زندگیوں سے ایک متحرک اور جذبہ حاصل کیا اور ان کے کاموں کو نمونۂ عمل بنایا جو راست باز و صالح تھے۔ نمرود، فرعون، سکندر اعظم، قارون، ہامان، ابوجہل، ابولہب، قیصر و کسریٰ وغیرہ جیسے مال و اختیار رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے جلیل القدر اور دنیوی مال و متاع سے بے نیاز انبیاء کرام اور ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، بلالؓ، صہیبؓ، سلمانؓ جیسی مقدس ہستیوں نے عزت و رفعت پائی۔ اسلام ایسے ہی کرداروں کی سماجی حیثیت کو ابھارنا چاہتا ہے اور دنیا و آخرت دونوں جگہوں پر فضیلت و شرف کا حقدار قرار دیتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۔[1]

ترجمہ: "ذرا دیکھو، دنیا ہی میں ہم نے بعض لوگوں کو بعض پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت میں تو ان کے درجے اور بھی بلند ہوں گے اور ان کی فضیلت اور بھی بڑھ چڑھ کر ہوگی"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام عام زندگی میں سماجی حیثیت کی بنیاد معیشت کے درجات کو نہیں بلکہ ذاتی اوصاف کو بناتا ہے، جن میں ایمان، تقویٰ، امانت و دیانت اور صداقت و شرافت وغیرہ

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل: ۱۷/۲۱

شامل ہیں یہ جن لوگوں میں زیادہ ہوں وہی عزت و احترام کے زیادہ لائق ہیں۔ خواہ ان کی مالی حیثیت کتنا کم کیوں نہ ہو۔ سردارانِ قریش کو اسلام کے خلاف جو بڑے بڑے اعتراضات تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ نچلے درجے کے لوگوں کو ان کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

سماجی حیثیت کا ایک اور دائرہ سرکاری مناصب و عہدے ہیں۔ وہ جن لوگوں کو میسر آتے ہیں معاشرے میں ان کا مقام و مرتبہ بلند ہو جاتا ہے اور ان کے پاس کچھ ایسے اختیارات و وسائل آجاتے ہیں کہ جن کی بنیاد پر کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ اگر اوصافِ حمیدہ سے متصف نہ ہوں اور ان کے دلوں میں خدا خوفی اور ملی و انسانی ہمدردی کا جذبہ نہ ہو تو محض قوانین و ضوابط انہیں ظلم و استحصال سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اسلام نے ان پر تعیناتی کے لیے اہلِ ثروت کے کسی اضافی حق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ میرٹ کے اصول کو رواج دیا ہے۔ اور سب سے بنیادی میرٹ تو اس کے ذاتی اوصاف ہی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اہلیت کے ابتدائی معیار پر وہ پورا پورا اترتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ متعلقہ شعبے اور ادارے کو کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ متعلقہ فن کے بھی ماہر ہوں اس میں خصوصی ذوق و شغف رکھتے ہوں اور اسے سنبھالنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشاورت، کتابتِ وحی، سفارت، انتظام انصرام، تعلیم و تربیت، فقہ و عدالت، زکوٰۃ، صدقات کی وصولی اور جنگی مہمات کے لیے ہمیشہ ایسے صحابہ کرام کو مقرر فرمایا جو زیادہ اہلیت و صلاحیت رکھتے تھے۔ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اسی روایت پر عمل کیا۔ چنانچہ درجاتِ معیشت کے بلند ہونے کی وجہ سے کبھی کسی شخص کو یا اس کی اولاد کو فوقیت نہیں دی گئی۔ فاروق اعظمؓ کا ارشاد ہے کہ:

لا تنظروا الی صلوٰۃ امرئ ولا صیامہ، ولکن انظروا الی صدق حدیثہ اذا حدث والی ورعہ اذا اشفی والی امانتہ اذا ائتمن [1]

ترجمہ: کسی کے نماز، روزے سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دیکھو کہ بات کرتے وقت وہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ، اس کا تقویٰ فراغت و امیری کے دور میں بھی قائم

---

[1] ابنِ جوزی، تاریخ و سیرت عمرؓ: ۱۹۵

رہتا ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جاتی ہے تو وہ خیانت نہیں کرتا۔"

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں، ان کے مقرر کردہ عامل مکہ، حضرت نافع بن عبدالحارث، حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم نے وادی والوں پر کسے عامل بنایا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ابن ابزی کو، پوچھا وہ کون ہے؟ جواب ملا کہ ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک غلام، فرمایا تم نے ایک غلام کو ان پر عامل مقرر کر دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ کتاب اللہ کے قاری و عالم ہیں اور ترکہ کو بانٹنا خوب جانتے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

اما ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم قد قال ان اللہ تعالیٰ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بہ اٰخرین۔[1]

ترجمہ: "ہاں ایسا کیوں نہ ہو جبکہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کچھ لوگوں کو سربلند کرے گا اور کچھ کو گرا دے گا۔"

تقویٰ کے ساتھ اسلام نے ملازمتوں کا میرٹ دو اہم چیزوں کو بنایا ہے۔ ایک قوت اور دوسرا امانت، قوت میں انسان کی متعلقہ کاموں اور عہدوں کو سنبھالنے کے لیے ذہنی، جسمانی اور تکنیکی قوتیں، صلاحیتیں، استعدادیں، اہلیتیں اور مہارتیں شامل ہیں اس کا جائزہ دوسرے لوگ بھی لے سکتے ہیں اور انسان کو منصفانہ طور پر خود بھی اپنے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ اس منصب کو سنبھال سکتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول درخشندہ مثال کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس امر کے لیے مجھ سے زیادہ قوی کے ہوتے ہوئے میں مقدم کر دیا گیا ہوں تو مجھے اس کا والی بننے کی بہ نسبت اپنی گردن کا مار دیا جانا زیادہ پسند ہوتا ہے۔"[2]

دوسری چیز امانت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس عہدے کے تمام متعلقات کی نگہداشت وحفاظت کے تمام تقاضے پورے کر سکے۔ نہ تو خود خیانت کا مرتکب ہو اور نہ ہی افسران بالا اور

---

[1] مسند احمد بن حنبل : ۱/۳۵، صحیح مسلم : ۲/۲۰۱

[2] طبقات ابن سعد : ۳/۲۷۵

ماتحتوں کو خیانت، غبن، اسراف، وسائل کے ضیاع اور لاپرواہی و بددیانتی کا مرتکب ہونے دے۔ نہ تو ان کا حصے دار بنے اور نہ ہی اسے نظر انداز کرے بلکہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے ان کے غلط کاموں کی راہ میں حائل ہو جائے۔

اسلام نے قوت و امانت کی ان دونوں صفات کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اگر کسی کے پاس قوت تو ہے لیکن امانت نہیں ہے تو وہ شعبہ و ادارہ تباہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی طرح امانت تو ہے لیکن قوت نہیں ہے تو بھی وہ شعبہ و ادارہ ترقی کی شاہراؤں پر گامزن نہیں ہو سکتا، دونوں صورتوں میں وہ منصب و عہدہ بے مقصد و بے مصرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے ان دونوں صفات کو حضرت شعیبؑ کی بیٹی کے ذریعے بہت خوبصورت انداز میں اجاگر کیا ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ان دونوں صفات کو محسوس کر کے ملازم رکھ لینے کا مشورہ ان الفاظ میں دیا تھا۔

يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ [۱]

ترجمہ:۔ "اباجان انہیں آپ ملازم رکھ لیجئے بے شک بہترین شخص جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امین ہو"

سماجی حیثیت کے اعتبار سے تیسرا بڑا دائرہ سربراہ مملکت کا ہے۔ یہ وہ منصب ہے جو معاشرے کے ہر طبقے پر ایک آدمی کو حاوی کر دیتا ہے۔ امیر و غریب، محتاج و غنی، سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان، سرکاری افسران و ملازمین سب اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس کے احکام و فیصلوں سے تمام معاشی سرگرمیوں اور پورے معاشی نظام پر مثبت و منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ گویا مادی اعتبار سے سب سے بلند اور موثر مقام و مرتبہ ہے۔ اسلام نے اس کا مستحق بھی درجات معیشت کے کے اعتبار سے کسی برتر شخص یا امیر زادے کو نہیں بلکہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ اوصاف کے حامل، با صلاحیت شخص کو قرار دیا ہے جو ایمان و یقین، علم و فہم، دینی بصیرت، حکمت و تدبر، انتظامی معاملات اور سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قلبی و عملی تعلق میں سب سے بڑھ کر ہو اور اسی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز اور عزت و احترام کا محور ہو، جو ہر اعتبار سے قابلِ اعتماد و بھروسہ

---

[۱] سورۃ القصص : ۲۸/۲۶

ہو۔ کیونکہ یہ منصب شہنشاہی و حکمرانی کا نہیں بلکہ خلافت کا ہے۔ جو ایک ذمہ داری و امانت ہے اور اس کا مقصد پیغمبرانہ دعوت و مشن کی ترویج و تنفیذ ہے۔ اس لیے اہل تر شخص کا انتخاب انتہائی ضروری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا [1]

ترجمہ:۔ "بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے خلیفہ کا انتخاب عمل میں آیا تو مسلمانوں نے مال و دولت کو نہیں بلکہ اسلام میں ان کی سبقت، شرافت و بزرگی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت اور یار غار ہونے کی سعادت اور نماز میں امامت کے منصب پر تقرری کو بنیاد بنایا[2] حضرت عمرؓ نے یہ فرما کر سب سے پہلے بیعت کی:۔

انت سیدنا وخیرنا واحبنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [3]

ترجمہ:۔ "آپ ہمارے سردار، ہم میں سب سے بہتر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں۔"

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم نے امیر خلافت پر نظر ڈالی ہم نے نبیؐ کو اس حالت میں پایا کہ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں آگے کر دیا، لہذا ہم اپنی دنیا کے لیے اس شخص سے راضی ہو گئے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین کے لیے راضی ہوئے، چنانچہ ہم نے ابوبکرؓ کو آگے کر دیا۔" [4]

حضرت ابوبکر صدیقؓ معاشی اعتبار سے مستحکم و مضبوط نہیں تھے۔ چند سال قبل غزوۂ تبوک کے موقع

---

[1] سورۃ النساء : ۴/۵۸

[2] طبری : ۳/۲۲۳

[3] صحیح بخاری : ۴/۱۹۴

[4] طبقات ابن سعد : ۳/۱۸۳

پرتواپنا سارا مال فی سبیل اللہ قربان کر چکے تھے۔ ان سے زیادہ مال و دولت رکھنے والے اصحاب موجود تھے۔ لیکن منصب خلافت پر ان کا انتخاب ان کے ذاتی اوصاف دین کی راہ میں قربانیوں اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت و محبت کی وجہ سے ہوا۔ اور ان کا دینی تشخص دینوی اعتماد کی بنیاد بنا۔

اسی طرح خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی ان کی اہلیت و صلاحیت کی بنیاد پر ہوا، مالی اعتبار سے ان کی حالت بھی اوسط درجے کی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقرر سے قبل استصواب کے لیے مختلف بزرگوں کو بلایا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں رائے دی،

"اے خلیفہ رسولؐ وہ اوروں کی بہ نسبت آپ کی رائے سے بھی افضل ہیں مگر ان کے مزاج میں ذرا شدت ہے۔"

حضرت عثمان، اے بار الہا! میں عمرؓ کے باطن کو ان کے ظاہر سے بہتر سمجھتا ہوں، ہم میں سے ان جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں۔[1]

حضرت عمرؓ کی اہلیت و افضلیت کا تو تمام صحابہ کرامؓ کو اعتراف تھا مگر ان کی سختی و شدت سے خائف تھے اس لیے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بعض اصحاب آئے اور یہ کہا کہ!

"اے خلیفہ رسولؐ! کل جب آپ اپنے رب سے ملیں گے تو اس کا کیا جواب دیں گے کہ آپ نے ہم پر ابن الخطاب کو خلیفہ بنایا؟ انہوں نے فرمایا کہ مجھے بٹھا دو، جب اٹھ کر بیٹھ گئے تو فرمایا! کیا تم لوگ مجھے اللہ سے ڈراتے ہو؟ میں کہوں گا کہ میں نے ان پر ایسے شخص کو خلیفہ بنایا ہے جو ان سب سے بہتر تھا۔[2]

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ دونوں کی سماجی حیثیت درجاتِ معیشت میں کسی قسم کی فوقیت پر نہیں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ ان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا!

---

[1] تاریخ طبری: ۲/۶۱۸

[2] طبقات ابن سعد: ۳/۲۷۴

"دونوں ہدایت کے امام، راستہ پانے والے، راستہ بتانے والے، اصلاح کرنے والے اور کامیابی حاصل کرنے والے تھے جو دنیا سے اس طرح گئے کہ شکم سیر نہ تھے" [1]

علیٰ ہذا القیاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں بھی مذکورہ بالا اصول کارفرما ہے۔

یہ اسلامی نظام ہی کی شان و برکت تھی کہ لوگوں کے ذوق و مزاج اور پسند و ناپسند کے پیمانے بدل گئے۔ قیادت و سیادت کے مناصب کے لیے ان کی نظریں اہل ثروت و سرمایہ کی طرف نہیں بلکہ اعلیٰ اوصاف، صلاحیتوں کے حامل اور مضبوط سیرت و کردار کے مالک لوگوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ اس لیے کہ سماجی حیثیت کی بنیادیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس کے برعکس وہ پرستانہ نظام مال و دولت، نسب و نسل اور زبان و علاقے وغیرہ کو سماجی حیثیت کا مدار قرار دیتے ہیں حالانکہ ان میں کوئی بھی اخلاقی و انسانی وصف نہیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے مطالبے پر جب حضرت طالوت کو ان کا حکمران مقرر کیا تو ان کا ردعمل یہ تھا:

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ [2]

ترجمہ: "وہ بولے! ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں حکمرانی و بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں، وہ تو کوئی بڑا مال دار آدمی نہیں ہے، (نبی نے) جواب دیا! اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا اور اس کو علمی و جسمانی دونوں صلاحیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں"

ہر تہذیب و تمدن اور نظام و معاشرہ کے کچھ اساسی تصورات ہوتے ہیں جن پر وہ استوار ہوتا ہے اور اس کا مخصوص مزاج ہوتا ہے جس سے "ثقافتی ماحول" پیدا ہوتا ہے۔ وہ ماحول ایسی شخصیتوں کو پروان چڑھاتا، اور ابھار کر نمایاں کرتا ہے جو فکر و عمل کے اعتبار سے اس سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ

---

[1] طبقات ابن سعد، ۲۷۴/۳
[2] سورۃ البقرہ: ۲۴۷/۲

ہوں۔ جس طرح پہاڑی علاقوں کے پودے میدانی علاقوں میں پھل پھول نہیں سکتے اور سردی کی فصلیں گرمیوں میں سوکھ جاتی ہیں۔ اسی طرح طبقاتی، جاہلانہ نظاموں کا ثقافتی ماحول کبھی شرافت، اخلاق اور صداقت کے حامل لوگوں کو سربلند نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر میں تمام ملکوں اور پوری دنیا پر بحیثیت مجموعی ایسے اجارہ دار طبقے مسلط ہوگئے ہیں جو اہلیت و صلاحیت رکھنے والے غریب انسانوں کے لیے ترقی کی راہیں مسدود کرتے جا رہے ہیں۔ بقول اقبالؒ

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا[1]

تمام عالم انسانیت کی نجات کا صرف ایک راستہ ہے کہ ایسے تمام نظاموں کی بساط لپیٹ دی جائے اور اسلام کے عادلانہ اور متوازن نظام کو عملی طور پر نافذ کر دیا جائے۔

سماجی حیثیت کا چوتھا اور سب سے بلند تر دائرہ نبوت و رسالت کا منصب ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ معزز و مکرم کسی مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خالق و مالکِ کائنات کسی کو اس دھرتی پر اپنا رسول و پیغمبر بنا دے، اور زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں براہ راست اس کی رہنمائی کرے اسے خطاؤں اور گناہوں سے منزہ مبرا کر دے اور اسے دنیا والوں کا ہادی و پیشوا بنا دے اور اس کی اطاعت و نافرمانی کو حق و باطل کا معیار اور جنت و دوزخ کا ذریعہ قرار دے۔ یہ منصب کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا ہے اسے اس پر سرفراز کیا ہے۔ جب ہم انبیا کرام کی فہرست و احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو یہی بات واضح ہوتی کہ چند ایک کے سوا باقی سب لوگ مال و دولت کے اعتبار سے نہایت کمزور تھے۔ حکمت خداوندی کا فیصلہ یہی تھا کہ ان کی عزت و تکریم کی اساس مادی وسائل کی ریل پیل اور اقتدار و اختیار کا رعب و دبدبہ نہ ہو بلکہ صداقت و شرافت، امانت و دیانت، راستبازی، اتباع وحی اور تعلق باللہ ہو۔ خاتم النبیینؐ کو یہ حکم دیا گیا،

قُلْ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى

---

[1] کلیات اقبال: ۱/۶۵۸

وَالْبَصِيْرُ ط اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ [1]

ترجمہ:۔ اے نبی! ان سے کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے، پھر ان سے پوچھو! کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟۔

بالکل یہی بات حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے سامنے کہی اس کے بعد آگے فرمایا:۔

وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ط اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ [2]

ترجمہ:۔ اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی، ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔

یعنی تمہارے معاشرے نے اور تمہاری ذہنیتوں نے جن لوگوں کو اس لیے پست اور حقیر سمجھ رکھا ہے کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے تو حقیقی معنوں میں وہ پست نہیں ہیں بشرطیکہ وہ قلب و نفس کی کیفیات اور جذبوں کے اعتبار سے راستباز ہیں، مال و دولت دراصل کامیابی و بھلائی کا کوئی پیمانہ نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان کی صلاحیتیں اور اوصاف تم سے کہیں زیادہ ہوں۔ اور ان کو صبر و توکل اور سکون و اطمینان اور عزت و قار کی ایسی نعمتیں میسر ہوں جو ہر طرح کے مادی وسائل رکھنے کے باوجود تمہارے چشم تصور میں بھی نہ آ سکتی ہوں۔

یہ ہے درجاتِ معیشت کے سلسلے میں اسلام کا تصور، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے درجاتِ معیشت کے صرف فطری تفاوت کو تسلیم کیا ہے کیونکہ اس کے ساتھ بے شمار حکمتیں وابستہ ہیں، لیکن اسے مستقل حیثیت نہیں دیتا بلکہ حق معیشت میں مساوات کے ذریعے اسے تبدیل و تحلیل کرتا رہتا ہے

---

[1] سورۃ الانعام: ۶/۵۰

[2] سورۃ ہود: ۱۱/۳۱

اور معاشی جدوجہد کو اہلیت، صلاحیت کے مطابق منافع و اجرت کی بنیاد پر رواں دواں رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ کفالتِ عامہ کا اصول دیتا ہے تاکہ اگر کبھی کچھ لوگ بقدر ضرورت رزق حاصل نہ کر سکیں تو انہیں حالات کے حوالے کرنے کی بجائے انفرادی و اجتماعی اور نجی و سرکاری ذرائع سے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور معاشی سرگرمی میں بھرپور طور پر شریک ہونے کے قابل بنایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام مال و دولت کے سماجی کردار کو محدود کر کے اعلیٰ اوصاف کو سماجی حیثیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ انہیں اوصاف کو اختیار کرنے میں سرگرم عمل رہتے ہیں، مادی دوڑ میں مقابلہ بازی کی بجائے نیکی و بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور قیادت و سیادت کے منصب پر بھی ایسے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں جو قوی و امین ہوتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو متعلقہ ذمہ داریاں سنبھالنے کی پوری اہلیت، واستعداد اور قوت رکھتے ہیں اور دوسری طرف پوری دیانتداری و خلوص کے ساتھ تمام معاملات کو امانت سمجھ کر بجا لاتے ہیں اور ہر چیز کی پوری نگرانی و حفاظت کرتے ہیں۔ اس طرح اسلام کا پیدا کردہ سماجی ماحول پورے معاشرے کے پسند و ناپسند کے معیار کو تبدیل کر کے سیرت و کردار کے اعتبار سے مضبوط اور پاکباز لوگوں کو ابھار کر معاشرے کا رہنما بنا دیتا ہے۔ ایسے افراد کے ہاتھوں میں اختیارات و مادی وسائل کا آجانا پوری انسانیت کے لیے برکت و رحمت کا سبب بن جاتا ہے۔ ان کا مال و اسباب نہ تو دنیا و آخرت میں ان کے لیے کسی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی دوسرے انسانوں اور پورے معاشی نظام کے لیے بلکہ وہ اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔ ارشادِ نبوی ہے۔

لَا بَاسَ بِالْغِنٰی لِمَنِ اتَّقَی اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ وَالصِّحَّۃُ لِمَنِ اتَّقٰی خَیْرٌ مِنَ الْغِنٰی وَطِیْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِیْمِ[1]

ترجمہ: "اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کے لیے مال دار ہونے میں کوئی خطرہ نہیں، متقیوں کے لیے تندرستی مالداری سے بہتر ہے اور دل کا اطمینان و خوشی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔"

---

[1] سنن ابن ماجہ: ۲/۷۲۴

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب بھی کوئی مال آتا تو وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے مستحقین تک پہنچ جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مال و دولت نے دین کے کتنے ہی کاموں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار سرانجام دیا اور کتنے ہی غلاموں کی گردنیں آزاد ہوئیں، حضرت عمرؓ کا بھی ذاتی مال اسلام کی سربلندی میں صرف ہوا اور خلقِ خدا کی مدد و معاونت کا ذریعہ بنا جب ان کے عہد میں فتوحات کے دروازے کھلے اور سرکاری خزانہ بھرا تو ریاست کے طول و عرض میں بسنے والے تمام انسانوں نے معاشی فلاح کے مناظر دیکھے۔ اور حقداروں کو ان کے حقوق ملے یہاں تک کہ شیر خوار بچوں اور غیر مسلموں تک نے استفادہ کیا اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دولت و ثروت نے رفاہی و فلاحی کاموں کو بامِ عروج تک پہنچایا مفلسوں اور ناداروں کے گھروں میں چولہے جلائے۔ زمانۂ قحط میں انہوں نے اپنے تجارتی سامان کو منہ مانگی قیمت پر فروخت کرنے کی بجائے مفت تقسیم کر دیا کہ لوگوں کی مجبوری و شدتِ احتیاج نفع اندوزی کی بجائے ہمدردی و فیاضی کا تقاضا کر رہی تھی۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرامؓ کا مال و اسباب انسانیت کی بھلائی پر صرف ہوا۔ اس سے وحدت و اخوت کے سرچشمے پھوٹے اور ہمدردی و تعاون کی نئی اور انوکھی قدریں معرضِ وجود میں آئیں۔

اسلام نے درجاتِ معیشت کے اس اعلیٰ و ارفع تصور کو معاشی سرگرمیوں کو متحرک کرنے اور معاشی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ مادہ پرستانہ اور جاہلانہ نظاموں کے برعکس اسے طبقاتی تفریق و تقسیم اور بغض و عناد کی بنیاد نہیں بننے دیا۔ ہر درجے کے لوگوں کے حقوق و فرائض، دائرہ کار اور حدود و شرائط کا منصفانہ تعین کر کے انہیں باہمی معاون و مددگار بنا دیا ہے۔ اور حسد و لالچ کی فتنہ انگیزیوں اور تباہ کاریوں سے افراد اور معاشرے کو بچانے کے لیے دو اہم احکام دیئے ہیں۔

ایک یہ کہ مال و دولت کے اعتبار سے بلند تر لوگوں کی طرف دیکھنے کی بجائے نیچے والے لوگوں کی طرف دیکھا جائے کیونکہ انسان کی مادی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگر انسان اسے مقصودِ زندگی بنا لے تو پھر کبھی آرام و سکون کی نیند نہیں سو سکتا۔ نہ تو وہ لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات بہتر اور صاف ستھرے رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا شکر گزار و فرمانبردار رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

أُنظر الیٰ مَن هو تحتك وَلاَ تنظُر اِلیٰ مَا هُوَ فَوقَكَ فَإنّهُ اجدَرُ

اَنْ لَا تَزْدَرِیْ نِعْمَةَ اللهِ عِنْدَكَ[1]

ترجمہ:۔ "ان کی طرف دیکھو جو مال و جاہ کے لحاظ سے تم سے کم تر ہوں اور ان لوگوں پر مت نظر ڈالو جو دینوی لحاظ سے تم سے بڑھے ہوئے ہوں، اس لیے کہ اس سے تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔"

دوسرا حکم یہ ہے کہ ایک دوسرے پر حسد کرنے اور ایک دوسرے کے مال پر نظر رکھنے کی بجائے لوگوں کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے فضل کی درخواست کریں۔ جو کچھ مانگنا ہے اسی سے مانگیں۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات کسی اعتبار سے بھی لائق تحسین نہیں ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ جو دوسرے کے پاس وہی اس سے چھن جائے اور ان کے ہاتھوں میں آجائے یہ ذھنیت ہی نفرت، بغض، عناد اور عداوت و کشمکش پیدا کرنے والی ہے۔ اس سے معاشرے میں فساد و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ چاہتا ہے کہ جس کسی کی بھی کوئی خواہشات و ضروریات ہوں وہ مثبت انداز میں اللہ تعالیٰ سے ان کی تکمیل کے جائز ذرائع کا سوال کرے۔ خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ ارشاد ربانی ہے:۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ط وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔[2]

ترجمہ:۔ "کسی ایسی چیز کی تمنا مت کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے مردوں کے لیے اس میں سے حصّہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے اس میں سے حصّہ ہے جو وہ کمائیں، اور اللہ تعالیٰ ہی سے اس کے فضل کی درخواست کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

حضرت ابن عباس کے بقول اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ آرزو نہ کرے کہ کاش فلاں کا مال اور اولاد میرا ہوتا۔[3]

---

[1] کنز العمال: ۱۳۴/۱۶

[2] سورۃ النساء: ۳۲/۴

[3] تفسیر ابن کثیر: ۴۸۸/۱

اسلام نے ایسے حریص اور لالچی انسانوں کو، جو مال و دولت کی طلب میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے سے حسد کرنے میں لگے ہوئے ہوں، سخت ناپسند کیا ہے ان کے مقابلے ایسے لوگوں کو قابلِ رشک قرار دیا ہے جو اللہ کی راہ میں ضرورتمندوں اور خیر و بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے کو اپنا وطیرہ بنائیں۔ ارشادِ نبوی ہے۔

" قابلِ رشک تو دو آدمی ہیں ایک وہ مالدار جو اللہ کی راہ میں اپنا مال لٹاتا ہے اور دوسرا وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ کاش میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اسی طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتا رہتا، پس اللہ کے نزدیک یہ دونوں اجر میں برابر ہیں،،[1]

اس طرح اسلام مادہ پرستانہ مقاصد کے لیے باہمی مقابلہ و مسابقت کی بجائے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور خلقِ خدا کی خدمت و بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ جس کی بنا پر اہلِ ثروت اپنے مال و دولت کو لٹا کر آخرت میں زیادہ سے زیادہ اجر کے مستحق بن جاتے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی اجر سے محروم نہیں رہتے جو بہت زیادہ وسائل تو نہیں رکھتے لیکن یہ آرزو اور خواہش رکھتے ہیں کہ ان کے پاس بھی مال ہو تو وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں۔

یہ مقدس اور اعلیٰ و ارفع جذبہ اس شعور سے پیدا ہوتا ہے کہ اصلی اور حقیقی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ وسائل حاصل کر لینا نہیں، کیونکہ یہ زندگی چند روزہ اور فانی ہے مرتے وقت آدمی کا سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے وہ خالی ہاتھ یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے وہ طالبانِ دنیا اور طالبانِ آخرت دونوں قسم کے لوگوں کو اپنے فضل و کرم سے رزق دیتا ہے یہ اب انسانوں کی مرضی ہے کہ وہ عارضی زندگی کو اپنی منزل قرار دیتے ہیں یا ہمیشہ کی زندگی کو، جس کی جو منزل ہو گی اسی کی طرف اس کا رُخ ہو گا۔ اسی کے لیئے وہ زادِ راہ تیار کرے گا۔ وہی اس کی تمام سرگرمیوں کا محور ہو گی، اس کے تمام انفرادی و اجتماعی رویے اسی کی روشنی میں تشکیل پائیں گے۔

اَللّٰهُ لَطِيفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۤءُ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ه مَنْ كَانَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ۱/۴۸۸

يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ[1]

ترجمہ: "اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے. جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھا دیتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسی دنیا ہی میں سے دے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔"

---

[1] سورۃ الشوریٰ : ۴۲/۲۰

کسبِ معاش کا اسلامی نظریہ

جناب ڈاکٹر حافظ محمد سلیم صاحب

انسانی زندگی میں وسائلِ معیشت، نظمِ معیشت اور کسبِ معاش کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اس کے پیشِ نظر تاریخ انسانی کے ہر دور میں اس مسئلہ کے حل کے لیے ہمہ نوع اور باہم اکثر متضاد نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں، جو زمان و مکان کے ساتھ ساتھ بدلتے مٹتے اور تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

دورِ جدید میں جب علوم کی نوعی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا تو معاشیات کو ایک الگ علم اور سائنس کی حیثیت حاصل ہوئی، علمِ معاشیات کی تدوین کے موقع پر ماہرین معاشیات نے جب اس کے اصول و قواعد مرتب کیے تو پیداواری عمل کے لیے زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم کو یکجا کرنا لازمی اور ضروری قرار دیا اور اصول وضع کر دیا کہ ان عوامل پیداوار کے مجتمع اور منضبط ہونے کی صورت میں کسی پیداواری عمل کا نتیجہ خیز ہونا ممکن سمجھا جا سکتا ہے۔

اسلام نوع انسانی کے لیے عالمگیر، دائمی، حتمی اور کامیابی کا ضامن لائحہ عمل مہیا کرتا ہے اپنی وسعت ہمہ گیری اور اکملیت کے باوصف اس نے حیات انسانی کے تمام پہلوؤں کیلیے جو جامع و مانع پروگرام مرحمت فرمایا ہے اس میں معاشی زندگی کے مسائل اور ان کے حل کو خصوصی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

معاشی جد و جہد اور کسبِ معاش کے لیے اسلام کے فراہم کردہ اصولوں میں محنت، اس کی ضرورت و عظمت، سرمایہ اس کا حصول و صرف، زمین اس کی ملکیت، پیداواری صلاحیت اور اس پر محنت کے اصول، مارکٹنگ اور معاشی لین دین میں صداقت و امانت و دیانتداری و راست بازی، حق گوئی و سچائی کی اہمیت اور دھوکہ دہی، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، بلیک مارکٹنگ اور ملاوٹ کی مذمت، رشوت اور سود کی حرمت اور مخرب اخلاق ذرائع آمدنی

کی حرمت شامل ہے جبکہ معاشرتی زندگی کے حوالہ سے، ہمدردی، غم گساری، ایثار و قربانی اور انفاق فی سبیل اللہ کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ مختصراً کسبِ معاش کے یہ سنہری اصول جن نقطوں کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ ہے عدالت و امانت اور حق گوئی و راست بازی۔

محنت کسبِ معاش کے حوالہ سے کسی بھی جدوجہد کا آغاز کیا جائے، محنت کو اسمیں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی۔ اسلام محنت و کوشش اور اس کے ذریعہ حاصل شدہ دولت کو خاص قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چند نظائر ملاحظہ ہوں۔

ا۔ مَا اکل احد طعامًا قط خیرٌ ان یاکل من عمل یدہ وان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدہ۔

یعنی کوئی شخص اپنی ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی چیز نہیں کھاتا اور حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے[۱]

ب۔ "لان یحتطب احدکم حزمۃ علیٰ ظھرہٖ خیرٌ من ان یسال الناس احدٌ فیعطیہ او یمنعہ"۔

تم میں سے کوئی اپنی پشت پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے۔ یہ امر اس سے بہتر ہے کہ کسی سے سوال کرے کوئی اسے دے یا نہ دے[۲]

ج۔ کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ[۳]

خلوص کے ساتھ کام کرنے کی عظمت کے بارے میں فرمایا:

"اذا نصح العبد سیدہ واحسن عبادۃ ربہ کان لہ اجرہٗ مرّتین"۔

جو غلام (ملازم) اپنے مالک کا کام خلوص و دیانت سے انجام دے اور اپنے ربّ کی عبادت بھی محبت و خلوص سے بجالائے اس کے لیے دوگنا اجر ہے[۴]

معاشی جدوجہد کے حوالہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر نگاہ ڈالیں تو کئی ایک تجارتی اسفار جن میں شام بصرہ اور یمن کے تجارتی سفر قابلِ ذکر ہیں، قبل از نبوت زندگی میں ملتے ہیں[۵] اسی طرح عرب کے مختلف بازاروں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی مصروفیات

کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے[۶] خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھرپور معاشی جد وجہد فرمائی اور اپنی اس پاک کمائی سے اللہ کی راہ میں صدقہ بھی فرمایا کرتے۔

سرمایہ اور حصولِ سرمایہ

معاشی جد وجہد اور کسبِ معاش کا کوئی بھی عمل دولت (CAPITAL) کے بغیر شروع کرنا اور اسے جاری رکھنا ممکن نہیں بطورِ خاص دورِ حاضر کے معاشی حالات میں اسے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام دولت کو ناپسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اسے خیر کے لفظ سے تعبیر فرماتا ہے۔

ا۔ "وانہٗ لحب الخیر لشدید"

بے شک وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہے[۷]

ب۔ "وما تنفقوا من خیر یوفّ الیکم"

اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرو گے تمہیں پورا ادا کر دیا جائے گا[۸]

ج۔ "وما تنفقوا من خیر فان اللہ بہ علیم"

اور اپنے مال میں سے جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ خوب جاننے والا ہے[۹]

مگر مال کے حصول میں دیانت وامانت کے اصول کو مرکزی نکتہ کی حیثیت دی گئی ہے تاکہ باہمی مفادات کا احترام وتقدس قائم رہ سکے۔ فرمایا:

ا۔ "یایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل"

اے ایمان والو اپنے مال آپس میں باطل طریقہ سے مت کھاؤ[۱۰]

ب۔ "واتوا الیتامیٰ اموالھم ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب"

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور ردّی چیز کو عمدہ چیز سے تبدیل نہ کرو[۱۱]

ج۔ ان الذی یاکلون اموال الیتامیٰ ظلمًا انما یاکلون فی بطونھم نارًا"

بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں وہ اپنے شکموں میں دوزخ کی آگ کھا رہے ہیں[۱۲]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"من اقتطع حق امرئ مسلم بيمينه فقد اوجب الله له النار وحرم عليه الجنة فقال له رجل وان كان شيئا يسيرًا يا رسول الله قال وان قضيبًا من "

جس نے مسلمان کا حق قسم کے ذریعہ ختم کر دیا اسے بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا اور اس پر جنت حرام ہو گی۔ عرض کیا گیا کہ اگر بہت معمولی سی چیز کا معاملہ ہو تو (پھر بھی ایسا ہی ہو گا) فرمایا اگرچہ اراک کے درخت کی شاخ ہی کیوں نہ ہو[13]

"من اقتطع شبرًا من الارض ظلمًا طوقه الله اياه يوم القيامة من سبع ارضين"

جس شخص نے ظالمانہ طور پر کسی سے زمین کا کچھ حصہ لے لیا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں کا بوجھ اس کے گلے میں ڈال دے گا[14]

من ظلم من الارض طوقه من سبع ارضين۔

جو کسی کی بالشت برابر بھی زمین ہتھیائے گا اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا[15]

حلال و حرام کی تمیز

پیدائشِ دولت کے عمل میں ظلم و استبداد کی ظاہری صورتوں کے علاوہ خفیہ اور غیر محسوس طریقوں سے بھی عوام الناس کو ان کے جائز مال سے محروم کیا جا سکتا ہے اسی وجہ سے اکتسابِ رزق کے عمل کو حلال و حرام دو واضح اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جائز ذرائع مثلاً تجارت ملازمت اور محنت وغیرہ سے حاصل کردہ دولت حلال اور اس کے برعکس تمام صورتیں ممنوع اور حرام ہیں۔ ان صورتوں میں سے ایک کے بارے میں بطور مثال قرآن فرماتا ہے:

واحل الله البيع وحرم الربٰو۔

اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام فرمایا ہے[16]

تجارت تمام جائز وسائل دولت اور ذرائع معاش کو بیان کرتی ہے جبکہ سود ظلم و استحصال کی تمام صورتوں کی نشاندہی کرتا ہے کاروبار تجارت اور کسبِ معاش کا عمل ہر چند کہ

انتہائی پاکیزہ ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

عليكم بالتجارة، فان فيها تسعة اعشار الرزق -

تجارت کیا کرو اس میں ۹/۱۰ رزق رکھا گیا ہے[۱۷]

"التاجر الصدوق الامين مع النبيين والصديقين والشهداء"

سچے اور امانتدار تاجر کا حشر انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا[۱۸]

مگر تجارت اور تاجر کی اس عزت و توقیر کیساتھ یہ بھی واضح فرما دیا۔

"التجار يحشرون يوم القيامة فجاراً الا من اتقى وبر وصدق"

قیامت کے روز تاجر فاسق و فاجر اٹھیں گے۔ مگر وہ نہیں جنہوں نے پرہیزگاری بھلائی اور سچائی سے کاروبار کیا[۱۹]

اسی بناء پر صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب معاش کی ایسی تمام صورتوں کو حرام قرار دیا ہے جو غیر عادلانہ بنیادوں پر استوار ہوتی ہوں ناجائز منافع خوری کے حوالہ سے فرمایا:

"من احتكر فهو خاطي"

جو شخص گرانی اور مہنگائی کی غرض سے غلّہ (اور دیگر اشیاء صرف) روکتا ہے وہ گنہ گار ہے[۲۰]

"من احتكر على المسلمين طعامهم ضربه الله بالجذام والافلاس"۔

جو شخص غلّہ کی ذخیرہ اندوزی کرنے کے بعد اسے اسوقت تک مارکیٹ میں نہیں لاتا تاوقتیکہ وہ مہنگا ہو جائے اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جذام اور افلاس میں مبتلا کر دیتا ہے[۲۱]

بلکہ اللہ کی نگاہ میں ذخیرہ اندوزی کرنے والا بدترین شخص ہے۔

بئس العبد المحتكر ان ارخص الله الاسعار حزن وان اغلاها فرح"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا شخص انتہائی برا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ غلّہ

سستا کر دے تو رنجیدہ ہو جائے اور مہنگا ہو جائے تو اظہار مسرت کرے۔[۲۲]
کسب معاش میں ایسے ظالمانہ طرز عمل کے اختیار کرنے والے کا کوئی نیک عمل بھی بارگاہ ایزدی میں شرف باریابی نہیں پاتا۔ آپؐ نے فرمایا:

من احتکر طعامًا اربعین یومًا ثم تصدق به لم یکن له کفارة
جس شخص نے چالیس روز تک غلّہ کو مہنگا ہو جانے کی غرض سے روک رکھا اور بعد ازاں صدقہ و خیرات کی شکل میں تقسیم کر دیا اس کے لیے کوئی اجر نہیں[۲۳] بلکہ ایسا شخص اللہ کی نگاہ میں ملعون و لعنتی ہے۔

"عن عمر عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال الجالب مرزوق والمحتکر ملعون"
تاجر کو اللہ کی طرف سے رزق دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا لعنتی ہے۔[۲۴]

دور حاضر میں اہل ثروت و دولت اور سرمایہ دار بسا اوقات کسی جنس کو مکمل طور پر مارکیٹ سے خرید کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اپنی مرضی سے ان کی رسد طلب میں عدم توازن قائم کر کے من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ ایسی تمام صورتیں اسلام کی نظر میں مطلقاً حرام ہیں۔

سود دنیا کے قدیم و جدید معاشروں میں سود کی شکل میں معاشی استحصال صاحب ثروت کی طرف سے درست سمجھا جاتا ہے۔ دورِ جدید کی معاشیات نے پورے معاشی ڈھانچے اور کاروباری لین دین کو کچھ اس طرح سے ترتیب دیا ہے کہ "سود"، بین الاقوامی سطح کے معاملات میں جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ معاشی تعلقات کا کوئی پہلو، انفرادی اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر ایسا نظر نہیں آتا جہاں یہ "لعنت" کینسر کے پھوڑے کی طرح اپنی جڑیں نہ پھیلا چکی ہو۔ مگر اسلامی معیشت اور کسب معاش کی اسلامی اقدار میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مسلمان ہونے کے بعد کسی مسلمان کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ اپنی کاروباری زندگی کو سہارا دینے کے لیے سودی لین دین کو جائز سمجھ لے، اللہ کریم جیسی مہربان ذات چونکہ استحصال کو کسی بھی صورت میں پسند نہیں فرماتی لہٰذا معاشی استحصال کو سخت ناراضگی اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے فرمایا:

واحل اللّٰہ البیع وحرم الربٰو[۲۵]

یایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ وذروا مابقی من الربٰو۔

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سود کی باقی (تمام رقم) چھوڑ دو[۲۶]

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللّٰہ ورسولہ۔

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کیطرف سے اعلانِ جنگ سن لو[۲۷]

شارح قرآن علیہ التحیہ والتسلیم نے انہیں آیاتِ قرآنیہ کی تعمیل میں فرمایا:

الا ان کل ربا من الجاھلیۃ موضوع لکم رؤوس اموالکم لا تَظلِمون، ولا تُظلَمون[۲۸]

سودی معاملات کی مذمت میں فرمایا:

"الربٰو سبعون جزءً ایسرھا ان ینکح الرجل امہ"

سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں اور اس کا کم تر حصہ یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنی والدہ سے جماع کرے[۲۹]

قرضِ حسنہ

اسلام سودی کاروبار کی بجائے قرضِ حسنہ کا ادارہ قائم کرنے کا خواہاں ہے تاکہ ضرورتمندوں اور حاجتمندوں کی مناسب طور پر امداد کی جاسکے۔ اللہ کریم نے قرضِ حسنہ کے لین دین کو اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے اس کی ضرورت وعظمت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا:

من ذالذی یقرض اللّٰہ قرضاً حسنًا۔

کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیتا ہے[۳۰]

مالی معاونت وتعاون کی ترغیب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا "ایک شخص کو جنت کے دروازہ پر لایا جائے گا۔ جب وہ اپنا سر اٹھائے گا تو وہاں لکھا ہوا دیکھے گا کہ صدقہ دینے کا اجر دس گنا اور قرضِ حسنہ دینے کا اجر اٹھارہ گنا ہے۔ کیونکہ قرض کا تقاضا کرنے والا حقیقی معنوں میں ضرورتمند ہوتا ہے اور جسے صدقہ دیا جارہا ہے ممکن ہے اسے اس وقت ضرورت نہ ہو[۳۱] مالی معاونت کی اس صورت پر مزید ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

من کان له علی رجل حق فمن اخره کان له بکل یوم صدقة
جس کسی پر کسی کا قرض ہو اور وہ اس کے حصول میں تاخیر کرے تو مہلت (کی مدت) کا دن (اس کی طرف سے) صدقہ ہوگا[۳۲]

من انظر معسرًا او وضع عنه اظله الله فی ظله۔
جو شخص مفلس کو قرض کی ادائیگی میں مہلت دے یا معاف کر دے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنے سایہ میں جگہ دے گا[۳۳]

ملاوٹ کسبِ معاش کی جدوجہد کے دوران حصول دولت کی بعض آسان راہیں بھی نکل آتی ہیں جنہیں اسلام قطعًا جائز قرار نہیں دیتا مثلاً اشیاءِ صرف کی کوالٹی کو تبدیل کر کے گھٹیا شئے کو صحیح داموں میں بیچنا، مدینہ منورہ کی غلّہ منڈی سے گزرتے ہوئے آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا:

"ماھذا یا صاحب الطعام قال اصابته السماء یارسول اللہ قال افلا جعلته فوق الطعام کی یراہ الناس ــــــ"
من غش فلیس منی۔
غلّہ کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈالنے کے بعد آپؐ نے دیکھا کہ نچلی سطح پر گیلی گندم پڑی ہوئی ہے آپؐ نے اس تاجر سے فرمایا یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا یارسول اللہ بارش کی وجہ سے ایسا ہوگیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا گیلی گندم کو اس ڈھیر کے اُوپر کیوں نہیں ڈالا گیا تاکہ لوگ اسے بہ آسانی دیکھ سکیں (یاد رکھیئے) دھوکہ باز میرے دین پر نہیں ہوتا ہے[۳۴]

"المسلم اخو المسلم ولا یحل لمسلم باع من اخیه بیعًا فیه عیب الا بینه"
آپؐ نے فرمایا ہر مسلمان دوسرے کا بھائی ہے اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ بغیر بتائے کسی عیب دار چیز کو اپنے بھائی کے ہاتھ فروخت کر دے[۳۵]

گراں بازاری کاروباری زندگی میں بلاجواز قیمتوں کا بڑھانا بھی ایک پرکشش لمر اور حصولِ دولت کا آسان ذریعہ ہے، رحمۃ للعلمینؐ نے اس صورتِ حال پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"عن ابی هریرة نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یبیع حاضر لباد ولا تناجشوا ولا یبیع الرجل علی بیع اخیه ولا یخطب علی خطبة اخیه ولا تسال المرأة طلاق اختها لتکفاء ما فی انائها"

فرمایا شہر والا دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے اور دھوکہ دینے کی غرض سے قیمت مت بڑھاؤ اور کوئی (تاجر) اپنے بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے اور نہ بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام بھیجے اور کوئی عورت اپنی مسلمان بہن کو طلاق نہ دلوائے کہ اس طرح اس کا لقمہ اپنے منہ میں ڈال سکے[۳۶]

"نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن النجش"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نجش (یعنی اشیاء صرف کو مہنگے داموں فروخت کرنے کی منصوبہ بندی کرنا) سے منع فرمایا[۳۷]

مخربِ اخلاق معاشی ذرائع آسان وسہل ذرائع آمدنی میں رشوت کا شمار بھی ہوتا ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ممنوع فرمایا:

"لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم الراشی والمرتشی"[۳۸]

جوا، سٹہ، قمار بازی، شراب سازی، شراب فروشی، زنا اور محرک زنا امور اور دیگر مخربِ اخلاق کام جن سے سوسائٹی کا اخلاقی معیار پست ہوتا ہو اسلام ایسے ذرائع کو وسائل دولت اور کسبِ معاش کے طور پر اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ملاحظہ ہو:

"انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوه لعلکم تفلحون"

بے شک شراب، جوا اور بت اور جوئے کے تیر سب ناپاک ہیں، شیطان کی کارستانیاں ہیں، ان سے بچو تاکہ تم فلاح پا سکو[۳۹]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا:

"ان اللہ ورسولہٗ حرّمَ بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر و لاصنام فقیل یارسول اللہ ارائیت شحوم المیتۃ فانہا یطلی السفن ویدھنَ بہا الجلود ویستصبح بہا الناسُ فقال لاھو حرام ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند ذٰلک قاتل اللہ الیہود ان اللہ لمّا حرّم شحومَھا جملوہٗ ثم باعوہٗ فاکلوا ثمنہٗ"

بے شک اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردہ جانور، سؤر اور بتوں کو فروخت کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مردہ جانور کی چربی کے بارے میں آپؐ کا ارشاد کیا ہے؟ جو کشتیوں میں لگائی جاتی ہے اور کھالیں اس سے چکنی کی جاتی ہیں اور لوگ اس کے ساتھ چراغ بھی جلاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "نہیں وہ بھی حرام ہے"۔ پھر آپ نے اسی وقت فرمایا "اللہ یہود کو غارت کرے۔ جب ان پر اللہ کی طرف سے چربی حرام کر دی گئی تو انھوں نے چربی کو پگھلا کر بیچ لیا اور اس کی قیمت کھا گئے[۴۰]"

یہاں اس امر پر توجہ دینا ضروری ہے کہ جُوا یا سٹہ سے مراد صرف وہی جُوا نہیں جو نقد کے ذریعے کھیلا جاتا ہے بلکہ تجارتی کاروبار میں بھی یہ کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے، عہد جاہلیت میں تجارتی جوا کی چند شکلیں بیع ملامسہ، بیع منابذہ اور بیع مصادرہ وغیرہ رائج تھیں جنہیں اسلام نے حرام قرار دیا تھا۔ جدید نظام معیشت میں بھی جُوا کی یہ صورتیں لاٹری، ریس، سٹہ وغیرہ کے مہذب ناموں کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ جوا اسلام کی نگاہ میں ممنوعہ ذرائع معاش میں شمار ہوتی ہیں[۴۱]

زنا کاری، بطور ذریعۂ معاش اپنائے جانے کے بارے میں آپؐ فرماتے ہیں:

"عن ابی مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن ثمن الکلب ومھر البغی وحلوان الکاھن"

کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت، زنا کی اجرت اور کہانت کا معاوضہ لینے سے منع فرمایا ہے[۴۲]

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ صاحب نے ان حکمتوں کو بیان کیا ہے جن کی وجہ سے بعض ذرائع معاش اور ان سے اکتساب کو حرام قرار دیا گیا ہے فرماتے ہیں۔

"شریعت میں جوا کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصلاً حقیقتاً ایک شخص کو بلا وجہ اس کے مال سے محروم کر دینے ہی کی ایک صورت ہے اور ہارنے والے شخص کا سکوت غصہ اور ناامیدی کے ساتھ ہوتا ہے جوا کھیلنے والا سہل پسندی کا عادی ہو جاتا ہے اور کسب معاش کے جائز ذرائع اختیار کرنے اور باہمی ہمدردی و ایثار، جو اسلامی معاشرت کی بنیاد ہے۔ سے اعراض برتتا ہے، سود کی حرمت کی وجہ بھی یہ ہے کہ سودی کاروبار کے رائج ہو جانے کی صورت میں ہمدردی اور غمگساری اُٹھ جاتی ہے اور اس کی جگہ بڑے بڑے جھگڑے اور نفرتیں جنم لیتی ہیں، شراب سازی اور شراب فروشی اور بتوں وغیرہ کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان چیزوں کا کاروبار جائز قرار دے دیا جائے تو اس سے وہ بُرائی روکنا ممکن نہیں جن کے پیدا ہونے کے احتمال کی وجہ سے انہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ شراب پینے کے لیے اور بت پرستش کے لیے بنایا جاتا ہے۔ لہذا جب یہ امور حرام ہیں تو ان کی بیع بھی حرام ہونی چاہیے[۴۳]

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"ان اللہ اذا حرّم شیئًا حرّم ثمنہ"

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کی قیمت کو بھی حرام فرمایا ہے۔

بخاری شریف کی مذکورہ حدیث میں زنا کی اجرت کو خبیث ناپاک اور حرام فرمایا گیا ہے

اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ" زنا کی اجرت خبیث ہے اور آپؐ نے کاہن کو اجرت دینے اور مننیہ کے کسب سے جو منع فرمایا ہے اس کی دو حکمتیں نظر آتی ہیں، ایک تو یہ کہ ممنوعہ کسب معاش کے اختیار کرنے میں لوگوں کو معصیت کی طرف ترغیب ملتی ہے اور دوسرا یہ کہ ملاءِ اعلیٰ میں ایسے شخص کی حیثیت مبیع کے خصائل و اثرات کی حامل سمجھی جاتی ہے"[۴۴]

قرآن و حدیث کے ان نظائر کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ فلم سازی، فلم فروشی، وی، سی۔آر کے ذریعہ مخرب اخلاق لٹریچر کی ترویج و اشاعت سٹیج اور ٹی۔وی ڈرامے۔ کلب اور تھیٹر، ڈانسنگ، مصوری اور غیر اخلاقی پینٹنگ اور دیگر مخرب اخلاق جن سے قوم اور مسلمان نسل کا اخلاقی اور روحانی معیار و وقار متاثر ہوتا ہو، اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں ایسے معاشی ذرائع ناجائز ہیں۔

زمین کسبِ معاش کا ہمیشہ سے ایک باوقار، قدرتی ذریعہ رہی ہے۔ زمانۂ قدیم میں عام طور پر زمین کو پیداواری کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ صنعتی ترقی کے بعد جب سے زمین بنیادی عوامل پیداوار میں شامل ہوئی ہے، اس کی اہمیت و حیثیت میں تنوع آچکا ہے۔ زرعی پیداوار حاصل کرنے کے علاوہ زمین تمام صنعتی یونٹوں، کارخانوں، فیکٹریوں، تنظیمی اداروں اور دفاتر کے قیام میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زمین کے بغیر دورِ جدید کی ترقی۔ عملاً ناممکن ہو کر رہ جاتی۔

زمین کے حوالے سے اسلام کی بنیادی تعلیم اور فکر یہ ہے کہ یہ اللہ کریم کی ملکیت ہے۔

"لِلّٰہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض"

اللہ ہی کے واسطے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے[۴۵]

"لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکفی باللّٰہ وکیلاً"

اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ کافی کارساز ہے[۴۶]

"وللّٰہ ملک السمٰوٰتِ والارض وما بینہما یخلق ما یشاء"

اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے[۴۷]

ربّ العالمین نے اپنی مخلوق کی ضروریات کی تکفیل وتکمیل کے لیے جو نظام مرتب فرمایا ہے زمین اس میں ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور تقریباً تمام قسم کی غذائی ضروریات کی فراہمی کا آغاز کسی نہ کسی صورت میں زمین ہی سے ہوتا ہے۔ اللہ کریم نے اپنی مخلوق کے استفادہ کے لیے اپنی "ملکیت زمین" کو مخلوق کی "عارضی ملکیت میں دے دیا ہے حقیقی و دائمی مالک تو وہ خود ہے، زمیندار خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اس کی حیثیت ایک امانتدار کی سی ہے۔ لہٰذا اللہ کریم نے زمین کو کسبِ معاش کے طور پر اختیار کرنے میں جو بنیادی تعلیم دی ہے وہ ہے "عدل و احسان" اس اصول کی وضاحت ہمیں ان نظائر حدیث رسول علیہ التحیۃ والتسلیم سے ملتی ہے جن میں آپؐ نے مزارعت کے جواز اور عدم جواز کے احکامات بیان فرمائے ہیں۔

"رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ ظہیر نے بیان کیا کہ آپؐ نے ہمیں اس چیز سے منع فرمایا جو ہمارے لیے فائدہ کا باعث تھی۔ میں نے کہا جو کچھ آپؐ نے منع فرمایا حق ہے۔ ظہیر نے کہا مجھے آپؐ نے بلا کر فرمایا تم کھیتوں کا کیا کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا ہم چوتھائی چند وسق کھجور اور جَو پر کرایہ پر دے دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔

"ازرعوھا او ازراعوھا او امسکوھا قال رافع سمعًا وطاعۃ"

بلکہ یا خود کاشت کرو۔ یا کاشت کے لیے دے دو یا روکے رکھو[۴۸]

"عن جابر بن عبد اللہؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعھا فان لم یزرعھا فلیزرعھا اخاہٗ"

فرمایا جس شخص کے پاس زمین ہو اسے چاہیے کہ خود کاشت کرے اگر خود کاشت نہیں کرتا تو اپنے بھائی کو دے دینی چاہیے[۴۹]

"عن جابر بن عبد اللہ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یوخذ للارض اجر" "او حظ"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ زمین کے ذریعہ

سے عوض یا اجارہ کا فائدہ اٹھایا جائے۔[50]

جوازِ مزارعت کے بارے میں آپؐ کے احکامات بھی بہت واضح ہیں۔ فرماتے ہیں:

"عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عامل اھل خیبر بشطر ما یخرج منھا من ثمر او زرع۔"

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو پیداوار میں سے نصف کی ادائیگی پر کاشت کرنے کی اجازت دے دی۔[51]

"عن معاذ بن جبل اکری الارض علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر وعثمان علی الثلث والربع فھو یعمل بہ الی یوم ھذا۔"

معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر، عمر اور عثمان رضوان اللہ علیہم کے عہد سے آج تک زمین تہائی یا چوتھائی پر بٹائی پر دی جاتی ہے۔[52]

"عن سعد بن ابی وقاص المزارع فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوا یکرون مزارعھم۔"

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ زمانہ نبوت میں لوگ اپنی زمینیں کرایہ پر دیا کرتے تھے۔[53]

مذکورہ بالا احادیث میں بظاہر واضح تضاد نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے جواز اور عدمِ جواز دونوں میں عدل و احسان کی بالادستی قائم کرنا مقصود ہے جیسا کہ کبار صحابہ کرامؓ کی بعض روایات و آراء سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو اجارہ پر دینے کو (مطلقاً) ممنوع قرار نہیں دیا بلکہ یہ پسند فرماتے تھے کہ اپنے بھائی کو حسنِ سلوک کے طور پر بغیر معاوضہ دے دی جائے۔[54]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو حرام نہیں کیا مگر یہ ترغیب دی کہ باہم حسنِ سلوک اور رفق کا معاملہ کریں، لین دین کا معاملہ اس بارہ میں نہ کریں۔[55]

دورِ حاضر میں پائے جانے والے نواب، جاگیردار اور زمیندار جو سینکڑوں مربع اراضی کے مالک ہیں اور زمین کو خود کاشت کرنے یا بٹائی پہ دینے کی بجائے، بعض خاندانوں سے نسلاً در نسلاً اپنی زمینوں پر غلاموں کی حیثیت سے کام کروا رہے ہیں اور ان خاندانوں کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں ان کا یہ رویہ اسلام کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا، کتاب الخراج اور کتاب الاموال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہت سے آثار ملتے ہیں کہ آپؓ نے غلام مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر تقسیم زمین سے متعلق بعض خصوصی اصلاحات جاری فرمائیں [۵۶]

علاوہ ازیں اللہ کی زمین سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اللہ کے حکم پر خمس و عشور کی ادائیگی بھی کسبِ معاش کے اسلامی اصولوں میں شامل ہے۔

تنظیم اور آرگنائزیشن

معاشی پیداوار کا ایک اہم اور حساس مرحلہ انتظامی یونٹ کو جو کلیدی حیثیت حاصل ہے اس کے پیشِ نظر انتظامی تربیت فراہم کرنے کیلئے۔ ایم۔ بی۔ اے، ایم۔ پی۔ اے، آئی۔ سی۔ ایم۔ اے، سی۔ اے اور دیگر بہت سے کورسز پیش کئے جا رہے ہیں۔ ایک منتظم جو بطور سیکرٹری ادارہ، ڈائریکٹر جنرل، مینجنگ ڈائریکٹر، جنرل مینیجر، مینیجر یا کسی بھی انتظامی حیثیت میں کام کر رہا ہو، اس کے لیے اسلام نے راہنمائی کا جو شیڈول فراہم کیا ہے اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کسی بھی پیداواری اور انتظامی یونٹ کا سربراہ جو اس عہدہ کو کسب معاش کے طور پر بطور ملازم یا مالکانہ حیثیت میں اختیار کرتا ہے اسے صاحبِ تقویٰ ہونا چاہیے۔

اللہ کریم ہمیں زندگی کے تمام پہلوؤں میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم فرماتا ہے۔

یایها الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاته

تاکہ معاشی عمل خوفِ خدا کے احساس کے ساتھ جاری رہے [۵۷]

۲۔ منتظم کے لیے عادل و منصف ہونا بھی اسلام کی نظر میں بہت بڑی ضرورت ہے تاکہ اکتسابِ معیشت کے دوران عدل و انصاف کا دامن ہاتھ چھوٹنے نہ پائے۔

۳۔ آجر اور ڈائریکٹر کے لیے پروڈکشن کے معیار کو قائم رکھنا کہ خریداروں تک صحیح اور معیاری پیداوار پہنچ سکے۔ صاحبِ دیانت و امانت ہونا بھی ازبس ضروری ہے۔

۴۔ کاروباری معاہدوں کو ایفائے عہد کے مطابق نبھانا بہت ضروری ہے حکمِ عام ہے :

یایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود[۵۸]

بہت بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سودے اور قیمتیں طے پا جانے کے بعد انھیں منسوخ کرنا قیمتیں بڑھانا قطعاً جائز و مناسب نہیں کہ

لا دین لمن لا عہد له

۵۔ ایک منتظم کے لیے "اخلاق و معیشت" کے باہمی تعلق و ربط کو قائم رکھنا بھی بہت ضروری ہے تاکہ مزدوروں۔ ورکروں، ملازموں اور عام خریداروں کے مفادات کا تحفظ یقینی بنایا جا سکے۔

۶۔ ماپ، تول اور اوزان کے معیار کو درست رکھنا بھی ایک منتظم کے فرائض میں داخل ہے، کیونکہ ایسا نہ کرنا مالکِ حقیقی کی ناراضگی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

ویل للمطففین ہ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون ہ

واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ہ

خرابی ہے کم تولنے والوں کے لیے کہ جب لوگوں سے لیں پورا ماپ کر لیں اور جب لوگوں کو دیں تو کم کر کے دیں۔

۷۔ کاروباری نظم کے دوران حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کو یقینی بنانا بھی منتظم کے فرائض میں داخل ہے اسے اپنے ادارے میں نماز، روزہ کے قیام اور خمس، عشر زکوٰۃ اور رائج الوقت ٹیکسوں کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرنا ہوگا۔

۸۔ معاشی یونٹ کے سربراہ کے لیے صاحبِ اخلاق ہونا بھی ضروری ہے کہ اس سے مارکیٹ میں خوشگوار ماحول پیدا ہوتا ہے اور آجر و آجیر اور خریدار و دکاندار رحمتِ الٰہیہ کے حقدار ٹھہرتے ہیں

رحم اللہ رجلاً سمحاً اذا باع واذا اشتریٰ واذا اقتضیٰ[۶۰]

کسبِ معاش کے مذکورہ اصول اگر ہماری زندگی میں داخل ہو جائیں تو بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ معاشرہ غربت و افلاس اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کے چنگل سے آزاد ہو کر عدل اجتماعی کی منزل کو پا سکے۔

وصلی اللہ علی النبی الامی وعلی الہ وصحبہ وسلم کثیراً کثیراً کثیراً۔

مراجع ومصادر

۱۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح للبخاری، کتاب البیوع۔ کراچی، قدیمی کتاب خانہ، ۱۹۶۱ء، ۱/ ۲۷۸

۲۔ بخاری۔ کتاب البیوع، ۱/ ۲۷۸

۳۔ خطیب تبریزی، ولی الدین، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، کراچی، سعید اینڈ سنز، ۱۲ /۷

۴۔ بخاری، محمد بن اسماعیل۔ صحیح بخاری، کتاب العتق۔ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۳/ ۱۹۵

۵۔ زرقانی۔ شرح مواہب، ۱/ ۹۹

۶۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی۔ ۱/ ۱۹۸

۷۔ القرآن، العادیات / ۸

۸۔ البقرہ / ۲۷۲

۹۔ البقرہ / ۲۷۳

۱۰۔ النساء / ۲۹

۱۱۔ النساء / ۲

۱۲۔ النساء / ۱۰

۱۳۔ مسلم بن حجاج۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان۔ لاہور، نعمانی کتب خانہ، ۱/ ۲۲۹

۱۴۔ صحیح مسلم، کتاب المزارعہ، ۴/ ۲۳۵

۱۵۔ بخاری۔ کتاب فی المظالم والغضب، دار احیاء التراث العربی، ۳/ ۱۷۰

۱۶۔ البقرہ / ۲۷۵

۱۷۔ علی المتقی، کنز العمال، ۱۹۲/۲
۱۸۔ ملاحظہ ہو۔ ترمذی، ابواب البیوع
۱۹۔ ترمذی، ابواب البیوع، مشکوٰۃ المصابیح۔ باب المساہلہ فی المعاملہ، کراچی سعید اینڈ سنز
۲۰۔ صحیح مسلم۔ کتاب المساقاۃ
۲۱۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ کتاب التجارت، داراحیاء التراث العربی بیروت، ۷۲۸/۲
۲۲۔ مشکوٰۃ، ۳۰/۲
۲۳۔ مشکوٰۃ، ۳۱/۲
۲۴۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت ۷۲۸/۲
۲۵۔ البقرہ / ۲۷۵
۲۶۔ البقرہ / ۲۷۸
۲۷۔ البقرہ / ۲۷۹
۲۸۔ ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث السجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، ملتان ۱۳۹۹ھ، ۲۴۹/۲
۲۹۔ مشکوٰۃ، ۱۶/۲
۳۰۔ البقرہ / ۲۴۵
۳۱۔ محمد اکرم خاں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی تعلیمات، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
ص/۲۲۲ (انگریزی مجموعہ احادیث متعلقہ معاشیات)۔
۳۲۔ مشکوٰۃ، ۳۷/۲
۳۳۔ مشکوٰۃ، ۳۲/۲
۳۴۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان ۹۹/۱۰ (باب من غش فلیس منا)
۳۵۔ ابن ماجہ، کتاب التجارۃ بیروت، ۷۵۵/۲
۳۶۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، باب تحریم الظلم، ۱۹۹۷/۴ء (دارالفکر، بیروت ایڈیشن)
۳۷۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، ۹۱/۳
۳۸۔ سنن ابی داؤد، کتاب القضاء، ۳۲۶/۳

۳۹۔ المائدہ / ۹۰
۴۰۔ تجرید البخاری، کتاب البیوع، ص / ۴۱۹
۴۱۔ غفاری نور محمد۔ اسلام کا قانونِ تجارت، لاہور۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ص / ۲،۷
۴۲۔ تجرید البخاری، کتاب البیوع۔ ص / ۴۱۹
۴۳۔ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ۔ ص / ۵۲۷
۴۴۔ ایضاً۔ ص ۳۲ - ۵۲۷
۴۵۔ البقرہ / ۲۸۴
۴۶۔ النساء / ۱۷۱
۴۷۔ المائدہ / ۱۷
۴۸۔ صحیح بخاری، کراچی، سعید اینڈ سنز: ۱۹۶۰، ۱/ ۸۱۰
۴۹۔ صحیح مسلم، باب کرار الارض، دہلی، اصح المطابع، ۲/ ۱۱
۵۰۔ بخاری، ابواب الحرث والمزارعۃ، کراچی، ص / ۳۱۳
۵۱۔ بخاری، ابواب الحرث والمزارعۃ، ۱/ ۸۰۷
۵۲۔ محمد اکرم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی تعلیمات اسلام آباد، ۱۹۸۹، ص۔ ۴۵ (انگریزی ایڈیشن)
۵۳۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، اسلام کا اقتصادی نظام، ملتان، ص / ۲۵۲ (بحوالہ ابوداؤد، نسائی شریف)
۵۴۔ بخاری، باب المزارعہ، ۱/ ۸۱۱
۵۵۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ ص / ۲۵۴
۵۶۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، بیروت دار المعرفہ، ۱۹۷۹۔ ص / ۵۸، ابو عبید کتاب الاموال۔
اسلام آباد، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی ص / ۸۱
۵۷۔ آل عمران / ۱۰۲
۵۸۔ المائدہ / ۱
۵۹۔ مطففین / ۳ - ۱
۶۰۔ بخاری، کتاب البیوع ص / ۲۷۸ (قدیمی کتب خانہ کراچی)

مضاربت قرآن وحدیث کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر فریدالدین شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ڈیرہ اسماعیل خان

مشروعیت مضاربت

مضاربت کی مشروعیت دلائل اربعہ سے ثابت ہے۔ قرآن۔ سنت۔ اجماع اور قیاس۔ مضاربت ضرب سے مشتق ہے یعنی زمین پر پاؤں مارنا۔ چلنا۔ پھرنا۔ چونکہ تجارت کرنے والا زمین میں چل پھر کر کاروبار کرتا ہے اور نفع کماتا ہے چنانچہ اسی طریقہ تجارت کو مضاربت کہتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے :

واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ[1]

ترجمہ : اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زمین میں چل پھر کر اللہ تعالیٰ کا رزق تلاش کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے فقہاء نے مضاربت کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں :۔

اما الکتاب الکریم فقولہ عزّوجل واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ والمضاربُ یضرب فی الارض یبتغی عن فضل اللہ عزّوجلّ[2]

ترجمہ : جب عامل تجارت کے لیے سفر اختیار کرتا ہے اور یہ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سفر اختیار کرے۔ تو قرآن کریم کی اس آیت میں تجارت کے لیے سفر کا ذکر ہے لہذا

اس مناسبت سے یہ آیت مضاربت کے ثبوت کے لیے دلیل ہے۔
چنانچہ مفسرین کرام بھی آیت کے ذیل میں تجارت کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ روح المعانی میں ہے:۔
یسافرون فیھا للتجارۃ و فی قرن المسافرین لابتغاء فضل اللہ تعالیٰ بھم اشارۃ الی انھم نحوھم فی الاخر[۳] یعنی یضربون فی الارض سے مراد زمین میں تجارت کے لیے سفر کرنا ہے اور مسافرین فی الارض للتجارۃ کو مجاہدین کے ساتھ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تاکہ مجاہدین کے ثواب کی طرح تجار کے اجر کی بھی وضاحت ہو جائے۔ یہی وضاحت مضاربت کی درج ذیل تفاسیر میں بھی موجود ہے تفسیر کبیر، احکام القرآن[۴] فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ[۵] اس آیت سے بھی علامہ کاسانی نے مضاربت کے جواز پر استدلال کیا ہے[۶] ایک دوسری آیت ہے:۔ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم۔ اسمیں فضل سے مراد رزق ہے۔ علامہ الماوردی نے بھی اس آیت سے جواز مضاربت پر استدلال کیا ہے[۷]

جواز مضاربت سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بھی لوگوں کے ہاں مضاربت جاری رہی۔ دراصل یہ معاملہ عہدِ جاہلیت میں جانا پہچانا تھا۔ اس وقت قراض کے نام سے موسوم تھا۔ قریش چونکہ تجارت پیشہ تھے اور ان کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ وہ اپنا مال مضاربت پر ان لوگوں کو دے دیا کرتے تھے جو منافع میں ایک مقررہ حصہ پر تجارت کرتے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو اسلام میں جاری رکھا اور مسلمانوں نے اس پر عمل کیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگرچہ ایک طبقہ منکرینِ حدیث کا ہے جو مضاربت کے شرعی جواز سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے جبکہ وہ اسلام کا ایک اہم قانونی ماخذ حدیث کا انکار کرتے ہیں تو مضاربت کے انکار کرنے سے مضاربت کے شرعی جواز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔
اس کے علاوہ امتِ مسلمہ میں سے کسی کو کوئی اختلاف ہوتا تو کوئی اس طرف متوجہ نہ ہوتا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مال بھی قراض کی صورت میں لے کر بیرون ملک تشریف لے گئے تھے[۸] نہایۃ المحتاج میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پچیس ۲۵ سال کی عمر میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مال ملک شام لے جا کر مضاربت کی۔ اس واقع کو استدلال کہا جاتا ہے کہ نبوت کے بعد آپؐ نے اس واقع کی تردید نہیں فرمائی۔ لہٰذا اس کی مشروعیت کے لیے یہی کافی ہے[۹]

صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ و دیگر صحابہ کرامؓ اس پر عمل پیرا رہے۔ اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ الہدایہ میں ہے صحابہ کرامؓ لوگوں سے روپیہ لے کر یا دوسروں کو روپیہ دے کر خود فائدہ حاصل کرتے اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتے تھے[1] علامہ کتانی لکھتے ہیں :-

وعنهم خديجة بنت خويلد ام المومنين فقد علم انه كان لها مال كبير وتجارت تبعث الى الشام فيكون غيرها كعامة غير قريش وكانت تستاجر الرجال و تدفع المال مضاربة ولما خرج عليه السلام فى تجارتها مع غلامها ميسره قالت انا اعطيتك ضعف ما اعطى قومك ففعل رسول الله صلى الله عليه وسلم وخرج الى سوق بصرى وباع سلعة التى اخرج واشترى غيرها وقدم بها فربحت ضعف ما كانت تربح فاربحت رسول الله صلى الله عليه وسلم ضعف ما سمحت له[1]

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر ملک شام میں تجارت کے لیے تشریف لے گئے تو یہ مال حضرت خدیجہؓ نے بطور مضاربت کے دے کر بھیجا تھا۔ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں :-

ان النبى صلى الله عليه وسلم باع واشترى وشراؤه اكثر و اجر واستاجر وايجاره اكثر وضارب وشارك و وكل وتوكل وتوكليه اكثر[2]

ترجمہ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خرید و فروخت فرمایا کرتے تھے آپ کی خرید و فروخت اکثر ہوا کرتی تھی۔ آپؐ بطور آجر اور بطور مستاجر رہے۔ مضاربت اور شراکت میں حصہ لیا وکیل اور توکیل کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔

معلوم ہوا مضاربت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے شرعاً ثابت ہے۔ اور جو لوگ مضاربت کا انکار کرتے ہیں گویا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کا انکار کرتے ہیں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود لوگوں کو بھی مضاربت پر آمادہ فرمایا کرتے تھے۔ المبسوط میں ہے :

وند بهم ایضاً الیہ علی ما قال صلوات اللہ وسلامہ علیہ من عال ثلاث بنات فهو اسیر فاعینوه یاعباد اللہ ضاربوه دا ینوه[۱۳]

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مضاربت پر آمادہ فرماتے ہیں کہ:۔

"جو شخص تین بچیوں کی عیالداری کرے تو وہ اسیر ہے اے اللہ کے بندو تم اس کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کرو اور قرض دو"

مذکورہ بالا حوالجات سے ان لوگوں کی تردید ہو جاتی ہے جو مضاربت کو ایک مرجوح عمل قرار دیتے ہیں اور خصوصیت قائم کرتے ہیں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مضاربت کی ترغیب دی۔ صحابہ کرامؓ نے خود اس مضاربت کو سرانجام دیا۔ سنن ابی داؤد میں ہے:۔

عن عروة البارقی قال اعطاه النبی صلی اللہ علیہ وسلم دینارا یشتری به اضحیة اوشاة فاشتری شاتین فباع احدٰهما بدینار فاتاه بشاةٍ ودینارٍ فدعا له بالبرکة فی بیعه فکان لو اشتری ترابا بالربح فیه[۱۴]

ترجمہ: عروۃ البارقی کو آپؐ نے ایک دینار دیا کہ ایک بکری خرید کر لاؤ۔ عروۃ البارقی نے ایک دینار پر دو بکریاں خرید کر لیں۔ ایک کو ایک دینار پر فروخت کر دیا اور دوسری کو بمع ایک دینار کے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کیا تو آپؐ نے عروۃ البارقی کی اس خرید پر برکت کی دعا فرمائی۔ اس کے بعد عروۃ البارقی اگر مٹی بھی خریدتا تو اس میں بھی نفع پاتا۔

سنن الکبریٰ میں ہے کہ آپؐ نے عروۃ البارقی کے لیے یوں دعا فرمائی:۔

اللھم بارك له فی صفقة یمینة قال انی لا قوم فی الکناسة بالکوفة فما ارجع الیٰ اھلی حتی اربح اربعین الفا[۱۵]

سنن بیہقی میں مضاربت کے بارے حضور علیہ السلام نے حکیم بن حزام کو بھی دعا فرمائی کہ ان کی تجارت میں برکت ہو:۔

عن حکیم بن حزام ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معه بدنیار یشتری له اضحیة فاشتراها بدینار وباعها

بدینارین فربح فاشتری اضحیة بدینار وجاءَ بدینار الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتصدق بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و دعالہ ان یبارك لہ فی تجارتہ[16]

ترجمہ: حضرت حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک دینار دے کر بھیجا تاکہ اس سے ایک قربانی خرید کر لائے۔ پس اس نے ایک دینار پر ایک قربانی خریدی اور پھر اس قربانی کو دو دینار پر بیچ کر نفع حاصل کیا پھر ایک دینار کے بدلے ایک قربانی خریدی۔ یہ ایک قربانی اور ایک دینار لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ایک دینار کو صدقہ کر لیا اور حکیم بن حزام کے لیے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس کی تجارت میں اس کے لیے برکت عطا فرمائے۔

مندرجہ بالا حوالجات سے معلوم ہوا کہ مضاربت کا نہ صرف جواز ہے بلکہ مضاربت باعثِ برکت بھی ہے۔

مضاربت کی شرعی حیثیت آثار صحابہ اور اجماع امت سے بھی ثابت ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ عمل تھا کہ وہ یتیم کا مال مضاربت پر دیا کرتے تھے۔ "عن عمرؓ انہ کان اعطیٰ مال الیتیم مضاربة"[17] حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ عمل تھا کہ وہ اپنا مال زید بن خلیدۃ کو مضاربت پر دیا کرتے تھے۔ ان اعطیٰ زید بن خلیدۃ مالاً مقارضة"[18]

حضرت عثمانؓ کا یہ عمل تھا۔ علا بن عبدالرحمٰن بن یعقوب اپنے والد سے بیان کرتے ہیں:۔

انہ قال جئت عثمان بن عفان فقلت لہ قدمت سلعة فهل بك ان تعطینی مالاً فاشتری بذالك فقال اترك فاعلاً قال نعم و لکنی رجل مکاتب فاشتریها مالاً فاشتریها علی ان الربح بینی و بینك قال نعم فاعطانی مالاً علی ذالك[19] عن یعقوب الجهنی انہ عمل فی مال عثمان بن نهان علی ان الربح بینهما[20]

حضرت جابرؓ کا یہ عمل تھا کہ وہ مضاربت میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے تھے۔ عن جابرؓ انہ لم یر بالقراض باساً"[21]

حضرت ابن عمرؓ کا یہ عمل تھا۔ عن نافع ان ابن عمرؓ کان یکون عنده مال الیتیم فیزکیه ویعطیه مضاربةً ویستقرض فیه[۲۲]

مضاربت کے بارے حضرت عمرؓ کا تفصیلی بیان ملاحظہ ہو:۔

" حضرت عمرؓ کے دونوں صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ ایک لشکر میں عراق کی جانب گئے۔ واپسی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پاس گئے تو انہوں نے ان دونوں کی مہمان نوازی کے بعد کچھ مال ان کے حوالے کیا اور فرمایا کہ عراق جاکر اس مال سے کچھ سامان اور چیزیں خرید لینا اور اس کے بعد مدینہ جاکر فروخت کر دینا اور اصل مال امیرالمومنین کے حوالہ کر دینا۔ منافع تم رکھ لینا۔ چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچے تو انہوں نے سامان فروخت کرنے کے بعد منافع اپنے پاس رکھ لیے اور راس المال حضرت عمرؓ کے حوالہ کرنا چاہا کہ حضرت عمرؓ کو اس تمام معاملہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے ان دونوں سے دریافت کیا کہ تمام لشکر کو تمہاری طرح مال دیا گیا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں یا امیرالمومنین۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ تم امیرالمومنین کے بیٹے تھے اس لیے تمہیں مال دیا گیا۔ آپ نے تمام مال اور اس کے منافع ادا کرنے کا حکم دیا۔ تو حضرت عبداللہ نے تو تعمیل کی لیکن حضرت عبیداللہ نے عرض کیا امیرالمومنین ایسا کرنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اگر مال ہلاک ہو جاتا یا اس میں کوئی نقص پڑ جاتا تو ہم اس کے ضامن تھے۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو عبداللہ خاموش ہی رہے لیکن حضرت عبیداللہ اپنا موقف دہراتے رہے۔ حضرت عمرؓ کے ایک شریک مجلس نے کہا کہ آپ اسے مضاربت اور قراض کی صورت کیوں نہیں دے لیتے۔ تو آپ نے اس پر آمادگی ظاہر کی جس کے نتیجہ میں حضرت عمرؓ نے اصل سرمایہ کے علاوہ آدھا نفع وصول کرنے کے بعد بقیہ نفع حضرت عبداللہ و عبیداللہ کے حوالے کر دیا۔"[۲۳]

ادجز المسالک میں ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ و عبیداللہ پر تمام تر نفع دینا لازم نہ تھا۔ آپ نے تو اس کا اظہار خیال کیا تھا کہ تم راس المال کے ساتھ تمام نفع بھی بیت المال میں داخل کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عبدالرحمن بن عوف نے یہ فرمایا کہ معاملہ مضاربت کر لو۔

آدھا نفع بیت المال کے لیے اور بقیہ آدھا نفع ان دونوں کو دے دیا جائے تو حضرت عمر بن الخطابؓ اس پر راضی ہو گئے۔[۲۴] چنانچہ حضرات صحابہ کرام کے عمل سے پوری طرح واضح ہو گیا ہے کہ مضاربت شرعاً جائز ہے بلکہ باعث برکت ہے ہاں اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ یتیم کے مال سے مضاربت کا ذکر زیادہ ملتا ہے لہٰذا مضاربت یتیم کے مال میں ہی جائز ہونی چاہیے۔ تو اب یہ اعتراض بھی قابل توجہ نہ رہا کہ قرآن و حدیث اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مضاربت کا عمل کسی خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ اکابرین صحابہؓ خود مضاربت سر انجام دیتے رہے کیا یہ لوگ یتیموں کی فہرست میں داخل تھے؟ علاوہ ازیں کسی فقیہ نے اس عمل کو نہ تو کسی خاص طبقہ کے کے ساتھ مسلک کیا ہے اور نہ ہی اس کو مرجوح کہا۔ موجودہ دور میں جو لوگ اس پر بضد ہیں کہ اس معاملہ کو مرجوح قرار دیا جائے یا کم از کم اس کو ایک خاص طبقہ تک محدود کر دیں تو ان حضرات سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ مُقلّد ہیں یا وہ اپنے آپ کو مجتہد گردانتے ہیں اگر وہ مقلد ہیں تو پھر ائمہ اربعہ میں سے جس کی بھی تقلید کے دعویدار ہیں۔ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک مضاربت کی مشروعیت پر متفق ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے مضاربت کو ناجائز نہیں کہا ہے بلکہ ہم تو اس کی حیثیت متعین کر رہے ہیں تو اُن کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شرائط اجتہاد ان میں نہیں پائی جاتیں چہ جائیکہ وہ اپنے آپ کو مجتہد سمجھیں۔

اب مضاربت کی مشروعیت اجماع کی روشنی میں ملاحظہ ہو۔ بدائع الصنائع میں ہے:۔

"واما الاجماع فانه عن جماعة من الصحابة انهم دفعوا مال اليتيم مضاربة منهم عمرؓ وعثمانؓ وابن مسعودؓ وعلیؓ وابن عمرؓ وعبيد الله بن عمرؓ وعائشهؓ ولم ينقل انه انكر عليهم من اقرانهم احدٌ ومثله يكون اجماعاً"،[۲۵]

علامہ کاسانی نے مضاربت پر صحابہ کرامؓ کا اجماع نقل کیا ہے۔ بدایۃ المجتہد میں علامہ ابن رشد لکھتے ہیں کہ مضاربت کی مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے:۔

"ولاخلاف بين المسلمين فى جواز القراض وانه مما كان فى الجاهلية فاقره الاسلام"،[۲۶]

یعنی مضاربت کے جواز میں اُمت مِسلّمہ کا کوئی اختلاف نہیں زمانہ جاہلیت سے اس پر عمل ہے حتیٰ کہ اسلام نے اسے برقرار رکھا۔

ابن قدامہ المغنی میں لکھتے ہیں تمام اہل علم کا مضاربت پر اجماع ہے:۔

واجمع اهل العلم علیٰ جواز المضاربة فی الجملة ۔[۲۷]

کتاب الفقہ میں ہے مضاربت کے اجماع کی دلیل یہ ہے کہ تمام مسلمان اس کے جواز پر جمع ہیں اور آج تک کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے:۔

دلیل المضاربة الاجماع فقد اجمع المسلمون علیٰ جواز ذالك النوع من المعاملة ولم یخالف فیه احد وقد کان معروفاً فی الجاهلیة فاقره الاسلام لما فیه من المصلحة ۔[۲۸]

نیل الاوطار میں علامہ شوکانی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ سے مضاربت کا عمل ثابت ہے اور یہ آثار صحابہؓ اس بات کی دلیل ہیں کہ مضاربت کا عمل ثابت ہے:۔

فهٰذه الآثار تدل علی ان المضاربة کان الصحابة یتعاملون بها من غیر نکیر فکان ذالك اجماعاً علی الجواز ۔[۲۹]

اتحاف سادۃ المتقین میں ہے:۔

واحتجوا لهذا انعقد باجماع الصحابه رضوان الله علیهم اجمعین ولابدّ بلاجماع عن منذٍ وسنده انهم فی زمانه صلی الله علیه وسلم وبعده ۔ رَوُا هٰذه المعاملة شائقة بین المعاملین وتحققوا لتقدیر علیها شرعاً واجمعوا علیٰ ذالك فصار مجمعاً ۔[۳۰]

شرح زرقانی میں ہے:۔

ونقلیة الکافة من الکافة کما نقلت الایة ولاخلاف فی جوازه ۔[۳۱]

بہر حال قرآن وحدیث وسنت وآثار صحابہؓ اور اجماع امت کے بعد معاملہ مضاربت کے جواز میں قیاس بھی مویّد ہے اس لیے کہ معاشرے میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس مال ہوتا

ہے لیکن تجارت کی اہلیت نہیں ہوتی یا ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں کہ تجارت کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن مال نہیں رکھتے لہٰذا شریعت نے دونوں کے لیے آسانی پیدا فرمادی ہے۔ چنانچہ عقد مضاربت کی مشروعیت ضروری ٹھہری تاکہ غبی اور زکی فقید اور غنی سب کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ چنانچہ الہدایہ میں ہے:۔

وھی مشروعیة للحاجة فان الناس بین غنی بالمال غبی غن التصرف فیه وبین مهتد التصرف صفراً الیه عنه فمست الحاجة الیٰ شرع هذا النوع من التصرف ینتظم مصلحة الغبی والذکیّ والفقیر والغنیّ[۳۲]

کشاف القناع میں بھی اسی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مضاربت کو قیاساً بھی جائز قرار دیا گیا ہے:۔

والحکمة تقتضیها لان بالناس حاجة الیها فان النقدین لا تنمی الا بالتجارة ولیس کل من یملکها یحسن التجارة ولا کلّ من یحسنها له مال فشرعت لدفع الحاجة[۳۳]

سُبُل السلام میں بھی قیاساً مضاربت کے جواز کی توضیح پیش کی گئی ہے:۔

وهو نوع من الاجارة الا انه عفی فیها من جهالة الاجر وکانت الرخصة فی ذالك المواضع الرفق بالناس[۳۴]

مضاربت کا مفہوم اور اصطلاحات مضاربت

مضاربت ایک قسم کی تجارتی شرکت ہے جس میں ایک جانب سے سرمایہ اور دوسری جانب سے محنت ہو۔ اس معاہدے کے تحت کہ اسے کاروبار کے نفع میں ایک متعین نسبت سے حصہ ملے گا نیز سرمایہ فراہم کرنے والے اور محنت کرنے والے متعدد افراد ہوسکتے ہیں۔

اصطلاح شریعت میں مضاربت اس عقد کو کہتے ہیں جس میں ایک جانب سے مال ہو اور دوسرے کی جانب سے عمل ہو اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔

جس کی جانب سے مال ہو اس کو رب المال کہتے ہیں اور جس کی جانب سے عمل ہو اس کو مضارب کہتے ہیں۔ اور جو مال دیا جائے اس کو مالِ مضاربت کہتے ہیں۔

مفردات القرآن میں ہے کہ مضاربت ایک قسم کی تجارتی شرکت ہے جس میں ایک شخص کا سرمایہ دوسرے کی محنت ہوتی ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں۔[۳۵]

شاہ ولی اللہ مضاربت کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "معاونت باہمی کی چند قسمیں ہیں ان میں سے ایک مضاربت ہے وہ یہ کہ مال ایک شخص کا اور محنت دوسرے شخص کی ہو اور رضامندی طرفین کی تصریح کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو"[۳۶] چونکہ اس میں ایک آدمی پیسہ دیتا ہے اور دوسرا آدمی اپنی محنت اور دوڑ دھوپ سے مزید پیسہ پیدا کرنے اور فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے اس معاملہ کو مضاربت کہتے ہیں[۳۷] شرعاً ایک طرف سے مال اور دوسری طرف سے عمل کے ساتھ نفع میں شریک ہونے کے معاہدہ کو مضاربت کہتے ہیں۔ پس اگر باوجود ایک طرف سے مال اور دوسری طرف سے عمل ہو لیکن نفع میں شریک نہ ہو بلکہ یہ شرط ہو کہ نفع تمام رب المال کا ہوگا تو یہ بضاعت ہوگی اور اگر یہ شرط ہو کہ سارا نفع مضارب یعنی عامل کا ہوگا تو یہ صورت قرض کی ہوگی[۳۸] عام طور پر فقہاء کے نزدیک مضاربت دو فریق کے درمیان اس امر پر مشتمل ایک معاہدہ ہے کہ ایک فریق دوسرے کو اپنے مال پر اختیار دے کہ وہ نفع میں سے ایک مقررہ حصہ نصف یا تہائی یا چوتھائی وغیرہ کے عوض مخصوص شرائط کے ساتھ اس مال کو تجارت میں لگائے[۳۹]

امام مالکؒ مضاربت کی تعریف میں فرماتے ہیں" مضاربت اس طرح درست ہے کہ کوئی کسی سے اس شرط پر روپیہ لے کہ وہ محنت اور کام کرے گا لیکن اگر نقصان ہوا تو وہ ذمہ دار نہیں اور سفر میں کھانے پینے اور سواری کا خرچہ دستور کے مطابق اسی مال سے دیا جائیگا اقامت کی مدت سے نہیں دیا جائے گا۔"[۴۰] مضاربت کی صورت میں مال فراہم کرنے والے اور کاروبار کرنے والے متعدد افراد ہو سکتے ہیں یعنی سرمایہ چند افراد مل کر فراہم کریں اور اس سے چند آدمی مل کر کاروبار کریں یا چند افراد مل کر سرمایہ فراہم کریں اور اس سرمایہ سے ایک فرد کاروبار کرے یہ سب صورتیں جائز ہیں۔[۴۱]

اس سلسلہ میں حنفی مالکی اور حنبلی فقہ کے مندرجہ ذیل مآخذ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے :۔

منہاج الطالبین وعمدۃ المفتیین ، المغنی ، المبسوط ، الشرح الصغیر[۴۲]

بہر حال مندرجہ بالا حوالجات سے معلوم ہوا کہ تجارت کی طرح مضاربت بھی دو آدمیوں یا دو فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ کا نام ہے جس میں ایک شخص اپنا روپیہ دیتا ہے اور دوسرا محنت

کرنے کا اقرار کرتا ہے اور پھر یہ دونوں معاہدہ کرتے ہیں کہ اس کے روپیہ اور دوسری کی محنت سے اس میں جو کچھ فائدہ ہوگا اس میں آدھا یا چوتھائی وغیرہ سرمایہ لگانے والا پائیگا اور آدھا یا تین چوتھائی وغیرہ محنت کرنے والے کو ملے گا یا اس قسم کی نفع کی کوئی نسبت متعین کر دی جائے۔

مضارب کی حیثیت کا تعین

مالِ مضاربت میں مضارب قبل از تصرف امین ہوتا ہے۔ بعد از تصرف وکیل ہوتا ہے۔ بعد از وصول منافع میں شریک ہوتا ہے۔ مضاربت فاسد ہونے سے اجیر ہوتا ہے۔ رب المال کے حکم کے خلاف کرنے سے غاصب ہوتا ہے۔ اپنے لیے کل منافع کی شرط لگا دینے سے قرض لینے والا ہوتا ہے اور کل نفع کی شرط رب المال کے لیے کرنے سے سرمایہ لینے والا ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مضارب کی حیثیت کو تفصیل کی روشنی میں ملاحظہ کریں۔ یعنی مضارب جو مال لیتا ہے اس میں وہ قبل از تصرف امین ہوتا ہے کیونکہ وہ مالک کی اجازت سے بلا مبادلہ و وثیقہ مال پر قابض ہوتا ہے پس اگر مال ہلاک ہو جائے تو مضارب پر تاوان نہ ہوگا اور عمل کرنے کے بعد وکیل ہوتا ہے کیونکہ وہ ربُّ المال کے حکم سے تصرف کرتا ہے پس جو ذمہ داری اس کو لاحق ہوگی۔ وہ رب المال کو بھی لاحق ہوگی۔ اور نفع حاصل کرنے کے بعد شریک ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے عمل کے ذریعے جزو مال کا مالک ہو چکا ہوتا ہے اور جب کسی وجہ سے مضاربت فاسد ہو جائے تو اجیر کے درجہ میں ہوتا ہے کہ اس کو محنت کی مزدوری ملتی ہے۔ خواہ تجارت میں نفع ہو یا نہ ہو۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے یہی روایت منقول ہے۔ اور اگر مضارب نے رب المال کے حکم کے خلاف کیا مثلاً کسی ایسی چیز کی خرید و فروخت کی جس سے رب المال نے منع کر دیا تھا تو وہ غاصب ہوگا کیونکہ غیر کے مال میں تعدی پائی گئی ہے لہذا مضارب پر ضمان لازم ہوگا۔ اور اگر مضارب کے لیے کل نفع مشروط ہو تو مضارب مستقرض ہوگا گویا اس نے رب المال سے مال بطور قرض لے لیا ہے۔ اور اگر کل نفع کی شرط ربُّ المال کے لیے ہو تو مضارب مستبضع ہوگا یعنی عقدِ مضاربت نہ رہے گا بلکہ عقدِ بضاعت ہو جائے گا اور مضارب ربُّ المال کے حق میں محسن شمار ہوگا۔

فتاوی ہندیہ میں ہے مختلف حالات میں مضاربت کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ کارکن

ابتدا میں تو امین ہوتا ہے اور جب کام شروع کر دے تو وکیل بن جاتا ہے اور جب اس میں نفع حاصل کر لیتا ہے تو شریک بن جاتا ہے کیونکہ فریقین نفع میں شریک ہیں اور اگر معاملۂ مضاربت فاسد ہو جائے تو وہ مزدور کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں یعنی اس حالت میں کارکن کام کے مطابق مزدوری کا حقدار ہوتا ہے امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مزدوری اتنی زیادہ نہیں ہوگی جتنی کہ معاہدہ کے وقت مضاربت میں مقرر کی گئی تھی اور اگر مالک کی مخالفت کر دے یعنی معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں غاصب ہو جاتا ہے اگرچہ بعد میں اس کو اختیار حاصل ہو جائے اور اجازت بھی مل جائے [۴۳] ہدایہ میں ہے اگر کارکن نے اس مقصد کے خلاف کام کیا جس کے لیے مال اس کو سپرد کیا گیا تھا تو یہ مال اور حاصل شدہ نفع مالک مال کو واپس کر دے۔ محنت کے معاوضہ کا بھی اسے کوئی حق نہیں ہے کیونکہ غاصب کے بارے میں یہی حکم ہے [۴۴] کافی میں ہے اگر پورا نفع مالک مال کے لیے شرط کیا گیا ہو تو بضاعت ہو جاتی ہے اور اگر سارے کا سارا نفع کارکن کے لیے شرط کر دیا گیا ہو تو قرض ہو جاتا ہے [۴۵] فتاویٰ قاضی خان میں ہے اگر مضاربت صحیحہ ہو اور کارکن نے کچھ نفع نے کمایا تو اس کو کچھ نہ ملے گا اور اگر مضاربت فاسدہ میں کارکن کے پاس سے مال ضائع ہو گیا تو کارکن ضامن نہیں ہوگا۔

المبسوط میں ہے کہ اس کو اپنے کام کا اجر مثل یعنی محنت کے مطابق مزدوری ملے گی [۴۶] ابن رشد لکھتے ہیں مضارب نفع کی صورت میں نفع میں حصہ پائیگا معاہدہ مضاربت فاسد ہونے کی صورت میں وہ اجرت پانے کا مستحق ہوگا اگر وہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرے گا تو غاصب شمار ہوگا کیوں کہ اس نے دوسرے کے مال میں زیادتی کی ہو گی [۴۷]

مضارب اور رب المال میں نفع کی تقسیم نسبت سے ہونا ضروری ہے

صحت مضاربت کے لیے مال لینے والے یعنی مضارب اور مال کے مالک یعنی رب المال دونوں کے لیے طے کیا جانے والا حصۂ نفع ایک عام نسبت سے ہو۔ اگر ایک متعین رقم طے کر لی گئی تو مضاربت فاسد ہو جائے گی۔

صحت مضاربت کے لیے نفع کا دونوں کے درمیان شائع اور عام ہونا شرط ہے مثلاً نصف یا تین تہائی وغیرہ۔ اگر مضارب نے یا رب المال نے اپنے لیے معین مقدار کی شرط کر لی یا دس درہم

زائد کی شرط کرلی تو عقد فاسد ہو جائیگا۔ اور مضارب کو اس کی محنت کی مزدوری ملے گی لیکن جو مقدار مشروط تھی امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس مقدار سے زائد مزدوری نہیں دی جائیگی۔ امام محمدؒ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک پوری مزدوری دی جائیگی گو مشروط سے زائد ہو۔

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مصنف نے صراحت کر دی ہے اس بات پر کہ مضاربت اور شرکت میں کسی فریق کا حصہ نفع متعین رقم کی صورت میں نہیں طے کیا جا سکتا۔ چاروں مکاتب فکر متفق ہیں۔ نیز اس بات پر بھی کہ مضاربت میں فریقین باہمی رضامندی سے نفع کی تقسیم کی جو نسبت بھی چاہیں طے کر سکتے ہیں[۴۸] فقہائے احناف کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ شرکت میں کسی شریک کے لیے طے کردہ حصہ نفع کل نفع کا ایک عام حصہ باعتبار نسبت ہو متعین رقم نہ ہو[۴۹] اور یہ بھی ضروری ہے کہ مضاربت پر مال لینے والے اور مال کے مالک دونوں کے لیے طے کیا جانے والا حصہ نفع ایک عام نسبت سے ہو مثلاً آدھا۔ تہائی۔ یا چوتھائی اگر ایک متعین عدد طے کر لیا گیا ہو مثلاً یہ کہ ان میں سے ایک کے لیے نفع میں سو درہم یا اس سے کم یا زیادہ درہم ہوں گے اور باقی دوسرے کے لیے ہوگا تو یہ جائز نہیں ہے۔ اور مضاربت فاسد ہو جائیگی[۵۰]

مضاربت کے سلسلہ میں مالکی اور شافعی فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ :-

"اگر ایک آدمی دوسرے کو سرمایہ بطور مضاربت دے اور اس سے یہ طے کرلے کہ نفع میں سے کچھ اسی کے لیے مخصوص ہوگا اس کے کاروبار کرنے والے ساتھی کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا۔ تو یہ درست نہ ہوگی خواہ مخصوص کی ہوئی یہ رقم ایک درہم ہی کیوں نہ ہو۔ صحیح صورت صرف یہ ہے کہ وہ آدھا نفع اپنے لیے طے کرلے اور آدھا کاروباری فریق کے لیے یا تہائی یا چوتھائی یا اس سے کم یا زیادہ طے کرلے"[۵۱]

مالکی فقہاء کے نزدیک ضروری ہے کہ مضاربت میں کاروباری فریق کے لیے طے کیا جانے والا حصہ نفع کل نفع کا ایک عام اور متعین جز ہو۔ مثلاً چوتھائی یا آدھا غیر متعین نہ ہو۔ اسی مال کے نفع کا حصہ ہو جو صاحب سرمایہ نے دیا ہے۔ کسی اور مال کا نفع نہ ہو اور کوئی متعین رقم نہ طے کی جائے مثلاً یہ کہ خواہ نفع کم ہو یا زیادہ اس میں سے دس دینار کاروباری فریق کو ملیں گے[۵۲]

شافعی فقہاء کے نزدیک جب ایک فریق سرمایہ فراہم کرے اور دوسرا اس سے کاروبار کرے

تو ضروری ہے کہ نفع انہی دونوں کے لیے مخصوص ہو اور دونوں اس میں شریک ہوں ہر ایک کا حصّہ کل نفع کے ایک جزء کے طور پر متعین و معلوم ہو اگر کسی فریق کے لیے دس درہم طے کیے گئے یا کسی خاص قسم کے مال تجارت کا نفع طے کیا گیا ہو تو معاہدہ فاسد ہو جائیگا[۲۳] حنبلی فقہاء کا مسلک وہی ہے جو حنفی فقہاء کا ہے یعنی جب دو افراد شرکت کریں تو نفع ان کے مابین ان کے طے کردہ نسبت سے تقسیم پائیگا۔ شرکت کی تمام صورتوں میں جہاں تک مضاربت کی سادہ شکل کا سوال ہے اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا[۴۴] اور کسی شریک کے لیے مخصوص طور پر چند متعین درہم زائد دینا نہیں طے کیا جا سکتا[۵۵] شرکت یا مضاربت میں دونوں فریقوں میں سے کوئی اگر اپنے لیے درہموں کی تعداد طے کر لے تو ایسا کرنا درست نہیں ہوگا[۵۶]

شرط فاسد سے مضاربت فاسد ہو جاتی ہے

جو شرط نفع میں جہالت پیدا کرے وہ مفسد مضاربت ہے اگر کوئی شرط ایسی لگائی گئی ہے جو موجب جہالت نفع یا موجب قطع شرکت نہ ہو تو ایسی شرط سے عقد فاسد نہیں ہوتا بلکہ خود شرط باطل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر مضاربت میں کوئی موجب جہالت نفع شرط لگائی ہو مثلاً رب المال نے مضارب سے بطریق تردید کہا کہ تیرے لیے نصف نفع ہے یا تہائی یا کوئی ایسی شرط لگائی گئی ہو جو قاطع شرکت ہو مثلاً کسی ایک کے لیے معین دراہم کی شرط کر لینا تو ایسی شرطوں سے عقد مضاربت فاسد ہو جاتا ہے کیوں کہ مضاربت میں نفع معقود علیہ ہوتا ہے اور جہالت معقود علیہ مفسد عقد ہوتی ہے اور اگر کوئی ایسی شرط لگائی گئی جو جہالت نفع یا موجب قطع شرکت نہ ہو جیسے مضارب پر نقصان اور خسارے کی شرط کرنا تو ایسی شرط سے عقد فاسد نہیں ہوتا بلکہ خود شرط باطل ہو جاتی ہے جیسے وکالت اور عقد بلکہ یہ شرط فاسد سے فاسد نہیں ہوتی

مصادر قانون اسلامی میں ہے کہ ہر وہ شرط جو نفع میں جہالت کا سبب بنے یا شرکت میں قطع تعلق کا باعث ہو تو وہ مضاربت کے فاسد ہونے کا موجب ہوگی اور جن شرائط سے اس قسم کا احتمال نہیں ہے وہ شرائط غیر معتبر ہیں اور اُن سے مضاربت بھی فاسد نہیں ہوتی[۵۷] اگر مال والے نے کارکن سے کہا کہ تجھ کو تہائی ⅓ نفع ملے گا اور دس درہم ہر مہینہ میں ملیں گے اگر تو

مضارب کا کام کریگا تو مضاربت جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ لہٰذا اگر اس کارکن نے اس شرط پر کام کیا اور نفع اٹھایا تو نفع شرط کے مطابق تقسیم ہوگا اور کارکن کو اس میں سے کوئی مزدوری نہیں ملے گی۔ اگر آدھے کی مضاربت پر ہزار درہم کارکن کو اس شرط پر دیئے کہ مال والا ایک سال تک اپنی زمین مضارب یعنی کارکن کو دے گا اور وہ اس زمین میں زراعت کریگا یا کوئی گھر اس کو دے دیا تاکہ وہ اس میں رہائش رکھے تو شرط باطل ہے۔ اور مضاربت جائز ہے۔[۵۵]

ان امور کا بیان جنکا مضاربت کیلیے سر انجام دینا جائز یا ناجائز ہے

اگر عقد مضاربت کسی مکان وزمان اور تصرف خاص کے ساتھ مقید نہ ہو بلکہ مطلق ہو تو مضارب کے لیے وہ تمام امور جائز ہیں جو تجار کے یہاں معتاد ہوں۔ اگر رب المال نے تجارت کے لیے کوئی خاص شہر یا کوئی خاص سامان یا کوئی خاص وقت یا کوئی خاص آدمی معین کر دیا ہو جس کے ساتھ وہ معاملہ کرے تو مضارب کے لیے اس کا خلاف کرنا جائز نہیں۔ رب المال کو یہ حق حاصل نہیں کہ کوئی ایسی شرط عائد کرے جو سود مند نہ ہو۔

مندرجہ بالا عبارت کی تفصیل یہ ہے اگر عقد مضاربت کسی مکان وزمان اور تصرف خاص کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ مطلق ہو تو وہ مضارب کے لیے ان تمام امور کا معاملہ کرنا جائز ہے جو عام طور پر تجارت کے سلسلہ میں ان امور کی ضرورت واقع ہوتی ہے جیسے ہاتھ در ہاتھ یا ادھار خرید و فروخت کرنا۔ وکیل بنانا۔ سفر کرنا۔ بطریق بضاعت مال دینا۔ کسی کے پاس مال ودیعت رکھنا۔ گروی لینا۔ گروی رکھنا۔ کرایہ پر لینا۔ کرایہ پر دینا وغیرہ کیونکہ یہ سب امور سوداگروں کے یہاں معتاد ہیں اور تجارت کے سلسلہ میں ان کی ضرورت واقع ہوتی ہے ہاں مال مضاربت سے خرید کردہ غلام یا باندی کا نکاح نہیں کرا سکتا۔ کیوں کہ تزویج ممالک اعمال تجارت سے نہیں ہے اور نہ کسی کو مال مضاربت پر دے سکتا ہے۔ ہاں اگر رب المال کی طرف سے اس کی اجازت ہو یا اس نے کہہ دیا ہو کہ اپنی رائے سے کام لے۔ اگر رب المال نے تجارت کے لیے کوئی خاص شہر یا کوئی خاص سامان یا کوئی خاص وقت یا کوئی خاص آدمی معین کر دیا ہو جس کے ساتھ وہ معاملہ کرے تو مضارب کے لیے اس کے خلاف کرنا جائز نہیں کیونکہ مضارب جو مال میں تصرف کرنیکا مالک ہوتا ہے وہ رب المال کی تفویض سے ہوتا ہے اور رب المال نے تفویض کو

امور مذکورہ کے ساتھ خاص کیا ہے جو فائدہ سے خاص نہیں۔ کیونکہ تجارت اختلاف امکنہ وامتعہ اور اختلاف اوقات واشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے مضارب کو اس کی تفویض کے خلاف کرنا جائز نہیں ہوگا لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک اگر ربُّ المال نے ان چیزوں کی تعیین کردی ہو تو مضاربت ہی صحیح نہیں ہوگی۔ اگرچہ مسالک مختلف ہیں جو تفصیل طلب ہیں لیکن اجمالاً سب سے پہلے احناف کے مسلک کو تحقیق کی روشنی میں سمجھیئے۔ احناف کہتے ہیں کہ مالک مال کو خصوصی اختیارات حاصل ہیں۔

۱ر مالک مال کو حق حاصل ہے کہ معاملہ مضاربت کے لیے خاص معیاد مقرر کردے اور اس کی یہ شرط درست ہے کہ کارکن صرف اس موسم میں کاروبار کریگا جس میں پیاز یا روئی ہوتی ہے یا یہ قید لگادے کہ صرف موسم سرما یا موسم گرما میں تجارت کا کام کیا جائے۔ یا یہ سال بھر سے زیادہ عرصہ تک کاروبار جاری نہ رہیگا وغیرہ۔

۲ر مالک مال کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تجارت کے لیے کسی خاص مقام کی تعیین کردے لہذا اگر وہ یہ کہے کہ کاروبار صرف پاکستان یا سعودی عرب یا ایسے ہی کسی اور شہر میں کیا جائے تو اسے اختیار حاصل ہے۔

۳ر مالک مال کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ کارکن کو کسی خاص قسم کی چیز کی تجارت کا پابند کردے لہذا یہ شرط درست ہے کہ فلاں شخص کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ مال فروخت نہ کیا جاوے یا فلاں کے سوا کسی اور سے نہ خریدا جائے۔ تمام صورتوں میں کارکن کے لیے یہ درست نہیں کہ مالک مال کی عائد کردہ شرائط کی خلاف ورزی کرے اگر اس کے خلاف کیا تو اسے غاصب یعنی ناجائز قبضہ کرنے والا تصور کیا جائیگا اور اسی طرح اگر مضاربت کے سرمایہ سے کارکن نے کوئی مال خریدا تو یہ کاروبار اس کے اپنے کھاتے سے تصور کیا جائے گا۔ اور اس پر مالک مال کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی ذمہ داری کارکن پر عائد ہوگی اور اس کام کے معاوضہ کا حق دار نہ ہوگا۔ البتہ اگر کسی شرط کے خلاف کیا اور اس کو درگزر کرنا ممکن ہو اور اس سے رجوع کرلیا تو معاملہ مضاربت بدستور قائم رہیگا۔ مثلاً اگر کارکن نے مال کی خریداری اس شہر کے علاوہ جس کی شرط مالک مال نے عائد کی ہے کسی اور جگہ سے کی لیکن اسے واپس کردیا اور پھر وہیں سے خرید کرلیا جہاں کی شرط تھی تو معاملہ مضاربت بدستور قائم رہیگا۔

۴ر مالک کو یہ حق نہیں ہے کہ کوئی ایسی شرط عائد کرے جو سودمند نہ ہو مثلاً یہ ممانعت

کردے کہ کوئی مال نقد درہم لے کر فروخت نہ کیا جائے ایسی شرط پر عمل نہیں کیا جائیگا۔ کیونکہ اس میں منافع کا نقصان ہے جس میں کارکن کا بھی حصہ ہے البتہ اگر مال کی فروخت ادھار ضمانت پر ہو اور درہم سے زیادہ درہم ملیں تو مالک کو حق ہے کہ نقد فروخت سے روک دے کیونکہ اس میں فائدہ زیادہ ہے۔

اگر کاروبار کے لیے کوئی ایسی شرط عائد کردے جس میں تھوڑا سا فائدہ کا احتمال ہو مثلاً یہ کہا جائے کہ لاہور کے انارکلی بازار یا لوہاری گیٹ میں کاروبار کیا جائے تو اس قسم کی پابندی پر عمل نہیں کیا جائے گا سوائے اس صورت کے جب کہ کسی خاص جگہ کے سوا اور جگہ کاروبار کرنے کی ممانعت کردی ہو۔ مثلاً یہ کہہ دیا ہو کہ صرف بازار میں کاروبار کرنا کیوں کہ مالک اپنے مال کا والی اور اس کی حالت کا نگران ہوتا ہے لہذا اس کے متعلق جس بات سے منع کرے اس کے مطابق عمل کرنا لازمی ہے [۵۹]

الہدایہ میں ہے کارکن کو ہر ایسا کام کرنے کا حق اور اختیار ہے کہ جو عام ہو اور لوگوں کے درمیان تجارتی معاملات میں معروف ہو کارکن کے لیے جائز ہے کہ وہ مضارب کے مال کو کسی کے پاس امانت رکھ دے اسے بوقت ضرورت خرید و فروخت کے معاملہ میں کسی کو وکیل بنانے کی بھی اجازت ہے رہن پر چیز رکھ دینا اور لینا۔ کرایہ پر دینا اور لینا۔ ودلیعت رکھنا یا بضاعت کے طور پر مال دے دینا اور مال مضاربت کے ساتھ سفر کرنا وغیرہ سبھی امور میں کارکن کو اختیار حاصل ہے کارکن صرف مضاربت کے معاہدہ ہی سے ان امور کا مختار اور مستحق نہیں البتہ اس کو یہ کہہ دیا جائے کہ اپنی رائے سے جو چاہو کام کرو تو اس وقت اس کو اس قسم کے جملہ امور کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے [۶۰]

امور ثلاثہ میں مضارب مختار نہیں جبتک کہ رب المال ان امور کی صراحت نہ کردے

معاملہ مضاربت میں وہ مخصوص امور اور افعال جن کا مضارب مختار نہیں ہوتا نہ مطلق عقد مضاربت کی وجہ سے اور نہ رب المال کے صرف یہ کہہ دینے سے کہ تو اپنی رائے سے جو چاہے اس پر عمل کر جب تک رب المال ان امور کی صراحت نہ کردے۔ وہ امور تین ہیں ایک معاملہ استدانت

دوسرا معاملہ سفاتج تیسرا معاملہ ہبہ یا صدقہ کرنا۔

۱۔ معاملۂ استدانت

اس قسم کے افعال میں سے ایک معاملہ استدانت کا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ کارکن نے درہم دنانیر نقد کے بدلے کوئی چیز خریدی اور اس سے قبل وہ کل سرمایہ کے بدلے کچھ سامان بھی خرید چکا ہو۔ لہٰذا اسی قسم کی طرح جو معاملہ بھی اس کے مشابہہ ہوگا تو کارکن کو اس قسم کے عمل کا اختیار نہیں ہے۔ جیسے مضارب اصل سرمایہ سے زائد رقم کی کوئی چیز خرید کرلے یعنی اصل سرمایہ ایک ہزار تھا اور کارکن نے ایک ہزار سے زائد کچھ سامان خرید لیا تو اس کا حکم یہ ہے کہ ایک ہزار کا حساب تو مضاربت کے مطابق ہوگا اور اس سے جتنا زائد ہے اس کا ذمہ دار کارکن ہوگا۔ اس لئے کہ اس صورت میں مضاربت کے مال کی مقدار اس اصل سرمایہ سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ جس پر مضاربت کا معاملہ طے ہوا تھا لہٰذا اس زائد مال پر مال والا راضی نہ ہوگا۔ اور نہ ہی وہ زائد سامان کی خریداری کی وجہ سے اپنے حصّے کو قرض میں مشغول کر دینے کو پسند کریگا جوکہ اس کی قیمت قرض ہوگئی ہے[61] کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب یہ زائد سامان رأس المال کے بدلے نہیں خریدا گیا بلکہ نقد درم و دنانیر کے بدلے خریدا گیا ہے تو یقیناً یہ قرض مال والے ہی کے ذمہ ہوگا۔ جس پر مال والے کا راضی ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔ اور اگر مال والے نے کارکن کو استدانت کی اجازت دے دی تو پھر اس طرح سے خرید کردہ سامان دونوں کے درمیان آدھا آدھا مشترک ہوگا جیسا کہ شرکت وجوہ میں ہوتا ہے[62] تو اس وقت مضاربت پیش ہوگی۔

۲۔ سفاتج

ان امور و افعال میں سے ایک معاملہ سفاتج ہے اس کا بھی کارکن مختار نہیں۔ سفاتج کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو کوئی مال اس شہر میں دے دینا جس کا دوسرے شہر میں یہ مال موجود ہے اور اس کی رسید پر سامان کی وہ قسم دوسرے شہر میں لے لینا تاکہ راستے کے خطرہ سے امن میں رہے یہ ایک قسم کا قرض ہے اس لیے کارکن کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے کیوں کہ یہ بھی استدانت کی ایک قسم ہے اور سفاتج کا مطلب دراصل مال کو قرض دے دینا ہے اس لیے اس کا اختیار نہیں ہے۔

۳۔ ہبہ یا صدقہ کا اختیار

کارکن کو قرض دینے ہبہ کرنے یا صدقہ کرنے کا بھی اختیار نہیں کیوں کہ یہ سخاوت اور نیکی میں شامل ہے[63]

اور ظاہر ہے کہ مال دینے والے کی طرف سے کارکن کو صرف ایسے تصرفات کی اجازت دی گئی ہے جو نفع حاصل کرنے کا ذریعہ ہوں نہ کہ نیکی اور صدقات وخیرات واحسان کی باتیں ہوں۔

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی شرکت و مضاربت کے شرعی اصول میں لکھتے ہیں۔ مضاربت کی بحث میں علامہ کاسانی مصنف بدائع الصنائع نے یہ لکھا ہے کہ مضاربت میں کاروباری فریق کو ادھار فروخت کرنے کا اختیار حاصل ہونے کی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے ایک ہے اور امام محمدؒ کی رائے دوسری ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ اختیار از روئے معاہدہ خودبخود حاصل ہوجاتا ہے اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک بغیر اجازت کے نہیں حاصل ہوسکتا۔ فقہ حنفی میں جو رائے اختیار کی گئی ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے۔ ادھار خریدنے کے اختیار میں حنفی فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ یہ اختیار صاحب سرمایہ کی صریح اجازت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ مال ادھار خریدنا قرض لینے کے مترادف ہے اگر کاروباری فریق صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر ایسا کریگا تو یہ اقدام اس کی جانب سے اس کی ذاتی حیثیت میں سمجھا جائیگا۔ کاروبار مضاربت سے اس کا تعلق نہ ہوگا۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں قرض لینے کی صورت یہ ہے کہ کاروباری فریق کچھ سامانِ تجارت اس طور پر خریدے کہ اس کی قیمت قرض رہے اور اس کے پاس قیمت کی جنس کا مال موجود نہ ہو...... کاروبار مضاربت کی جانب سے ایسا کرنا جائز نہیں..... جبکہ کاروباری فریق مضاربت کے سرمایہ پر قبضہ حاصل کرلے تو اسے اس کا اختیار نہیں کہ جو سرمایہ اس کے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ دام کا سامان خریدے کیوں کہ یہ زیادہ قرض ہوگا۔ اور اس کے پاس مضاربت کے سرمایہ میں سے اس قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر اس نے کچھ سامان دو ہزار درم پر خریدا اور مضاربت کا اصل سرمایہ صرف ایک ہزار ہے تو خریدے ہوئے سامان میں سے ایک ہزار کا مال تو کاروبار مضاربت کیلئے ہوگا اور باقی مال کاروباری فریق کا اپنی ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ اس کا نفع اسی کو ملے گا اور خسارہ ہوا تو یہ خسارہ بھی اسی کو برداشت کرنا ہوگا۔ یہ زائد قیمت اس کے ذمہ قرض رہیگی جسے وہ اپنے ذاتی سرمایہ میں سے ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا اگر دوسرے شرکاء مضاربت میں سرمایہ فراہم کرنے والے اجازت دے دیں تو کسی مقدار میں بھی ادھار مال خریدا جا سکتا ہے۔ شرکت میں اس مال کی نوعیت مشترکہ مال کی اور اس کی قیمت کی نوعیت مشترکہ ذمہ داری پر لیے ہوئے قرض کی ہوگی۔ مضاربت میں حنفی فقہاء

کے نزدیک اس مال کی نوعیت صاحب سرمایہ اور کاروباری فریق کے مشترکہ مال کی اور اس کی قیمت کی نوعیت مشترکہ ذمہ داری پر لیے ہوئے قرض کی ہو گی۔ اس مال کو صاحب سرمایہ کا مال اور اس قیمت کو صرف صاحب سرمایہ کے ذمہ قرض کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ مضاربت کا معاہدہ قرض سرمایہ کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا قرض سرمایہ کی بنیاد پر کاروبار کی جائز شکل شرکت وجوہ کی شکل ہے۔ دو افراد کسی سرمایہ کے بغیر صرف اپنی کاروباری ساکھ کی بنیاد پر ایک دوسرے کی شرکت میں کاروبار کا معاہدہ کرتے ہیں تو یہ معاہدہ شرکت وجوہ قرار پاتا ہے۔ یہ دونوں ادھار مال خریدتے ہیں اور اس کی فروخت کے ذریعہ نفع کماتے ہیں [۲۶۴]

مضارب کا دوسرے شخص کو مضارب بنانے کا حکم

مضارب نے رب المال کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے شخص کو مضاربت پر مال دے دیا تو مضارب اول پر صرف مال دینے سے ضمان عائد نہ ہو گا جب تک کہ مضارب ثانی عمل تجارت نہ کرے خواہ مضارب ثانی کو نفع حاصل ہو یا نہ ہو۔ مندرجہ بالا مسئلہ کی حقیقت صاحبین کے مطابق ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اگرچہ اس مذکورہ مسئلہ پر اختلاف پایا جاتا ہے تاہم جمہور فقہاء اسی پر متفق ہیں۔ امام اعظمؒ صاحب سے امام حسنؒ کی روایت ہے کہ جب تک مضارب ثانی کو نفع حاصل نہ ہو اس وقت تک مضارب اول پر ضمان نہ آئے گا امام زفرؒ کے نزدیک صرف مال دینے ہی سے ضمان لازم ہو جائے گا۔ خواہ مضارب ثانی عمل کرے یا نہ کرے۔ ائمہ ثلاثہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ کیوں کہ مضارب کو بطریق ودلیعت مال دینے کا حق ہے نہ کہ بطریق مضاربت جیسا کہ ابتدا میں گزر چکا ہے۔

صاحبین یہ فرماتے ہیں کہ مضارب کا مال دینا درحقیقت ایداع ہے۔ مضاربت کے لیے تو وہ اس وقت ہو گا جب مضارب ثانی کی طرف سے عمل پایا جائے گا۔

امام صاحبؒ یہ فرماتے ہیں کہ دفع مال قبل از عمل ایداع ہے اور بعد از عمل ابضاع ہے اور مضارب کے لیے دونوں طرح دینے کا حق ہے پس نہ ایداع سے ضامن ہو گا۔ کیوں کہ اب مال میں مضارب ثانی کی شرکت ثابت ہو گئی۔

مذاہب فقہ میں ہے احناف کہتے ہیں کہ اگر کارکن نے کسی اور شخص سے معاملہ مضاربت کیا تو

دیکھنا چاہیئے کہ آیا اس نے یہ مالک مال کی اجازت سے کیا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی اجازت سے نہیں کیا تو معاملہ مضاربت فاسد ہو جائیگا۔ لیکن کارکن اس مال کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ بجز اس صورت کے جبکہ مضارب نے اس سے کاروبار کیا ہے چنانچہ اگر خالد نے وہ رقم جو رب المال نے دی ہے دوسرے شخص کو دی ہے کہ وہ شخص اس کو بطور مضاربت کاروبار میں لگائے اور وہ رقم کام میں لائی جانے سے پہلے تلف ہو گئی تو خالد اس کا ذمہ دار نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں وہ مال جو دوسرے کو دیا گیا ہے اس کی حیثیت سپردگی میں دیئے ہوئے مال کی ہے۔ اور کارکن کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ مضاربت کی رقم کسی کے سپردگی میں دے دے اور اس کے تلف ہونے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس مال کو دوسرے شخص نے کاروبار میں لگا لیا تو اب وہ شخص سچے معنوں میں محض مال کا تحویل دار نہیں بلکہ مضارب ہو گیا اور کسی کارکن کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مالک مال کی اجازت کے بغیر اس رقم سے کوئی اور معاملہ مضاربت کرے۔ [۶۵]

مضارب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مالک مال کی اجازت کے بغیر کسی شخص کو مال مضاربت پر دے دے تو اسے واضح الفاظ میں اجازت دے دے یا اسے اختیار دے دے کہ اپنی رائے اور سمجھ بوجھ کے مطابق کاروبار کرو۔ [۶۶] اگر کسی شخص نے جو کہ خود مضارب اور کارکن ہے۔ اس نے مضاربت کا مال کسی دوسرے شخص کو بطور مضاربت دے دیا حالانکہ مالک مال نے کارکن کو اس کی اجازت نہیں دی تھی تو اس صورت میں مضاربت کا مال دوسرے کارکن کو دے دینے سے یا دوسرے کارکن کے کاروبار اور کام کرنے کی وجہ سے کارکن اول اس وقت تک مال کا ضامن نہیں ہوگا جب تک کہ دوسرے کارکن کو نفع حاصل نہ ہو جائے اور جب نفع حاصل ہو جائے تو پھر کارکن اول مالکِ مال کے سرمایہ کا ضامن نہ ہوگا۔ یہ روایت حسن بن زیادؒ کی ہے جسے وہ امام ابوحنیفہؒ سے نقل کرتے ہیں لیکن امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جس وقت دوسرا کارکن کام شروع کر دے گا خواہ اُسے نفع حاصل ہو یا نہ ہو کارکن اول پر اس وقت ضمان لازم آئے گا۔ یہ ظاہر روایت ہے جسے فقہاء احناف بیان کرتے ہیں اور اس پر فتویٰ ہے۔ امام زُفرؒ فرماتے ہیں کہ کارکن اول دوسرے کارکن کو محض مال مضاربت پر دے دینے سے ضامن ہو جائیگا خواہ دوسرا کارکن کچھ کاروبار کرے یا نہ کرے۔ [۶۷] ایک روایت امام ابویوسفؒ سے بیان کی جاتی ہے کہ پہلے کارکن کو مضاربت کا مال کسی کو دینے کا جو اصل حق اور اختیار حاصل ہے وہ صرف امانت کے طور پر کسی کے پاس رکھنے کا ہے۔

مضاربت پر آگے دینے کا حق حاصل نہیں ہے لہذا مالک مال کی اجازت سے اور مرضی کے بغیر کسی دوسرے کو بطور مضاربت دینے پر ہی پہلے کارکن پر مال کی ضمانت لازم آئے گی[۶۸]

۵) صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ محض مال مضاربت کسی کو دے دینا ایسا ہے جیسے کسی دوسرے کے پاس امانت رکھ دینا ہے اور بطور مضاربت مال سپرد کر دینا اسوقت معلوم ہوگا اور ثابت ہوگا جبکہ اس میں کاروبار بھی کر لیا جائے اس لیے کاروبار اور عمل کرنے سے قبل مال کو بطور امانت ہی تصور کیا جائیگا۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ کسی کو مضاربت کا مال دے دینا تو کاروبار سے قبل اس کی حیثیت امانت کی ہے اور کاروبار کے بعد وہ مال بطور بضاعت ہو جائیگا یعنی اس کی صورت یہ ہو گی کہ کچھ سامان کوئی نفع بخش معاملہ یا کاروبار کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص کو اس طرح سے دے دینا کہ نفع میں اسکی شرکت طے نہ کی جائے لہذا یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ جن کا کارکن کو اختیار حاصل ہے اس لیے محض ان دو چیزوں کی وجہ سے تو پہلا کارکن ضامن نہیں ہوگا البتہ جب دوسرے کارکن نے اپنے کاروبار کے ذریعے اس مال میں کچھ نفع بھی حاصل کر لیا ہے تو اس مال میں دوسرے کارکن کی شرکت ظاہر اور ثابت ہو گئی تو پھر وہ ضامن ہوگا[۶۹]

مختلف حیثیات سے رب المال مضارب اول اور مضارب ثانی میں نفع کی تقسیم

(۹) اگر مضارب نے رب المال کی اجازت سے دوسرے شخص کو مضاربت بالثلث یعنی ۱/۳ پر مال دیا اور جبکہ رب المال کی جانب سے مضارب اول کے لیے یہ طے تھا کہ جو کچھ نفع ہوا ہم دونوں میں نصف نصف ہے تو رب المال کو کل نفع کا نصف ملے گا مضارب ثانی کو ۱/۳ یعنی تہائی اور باقی ایک سدس یعنی ۱/۶ مضاربِ اول کو ملے گا۔

(ب) اگر رب المال نے بوقت مضاربت یہ کہا جو تجھے نفع ہوا وہ ہم میں نصف نصف ہے جبکہ مضارب اول نے دوسرے شخص کو مضاربت بالثلث یعنی ۱/۳ پر مال دیا تو مضارب ثانی یعنی ۱/۳ اور باقی نفع رب المال اور مضارب اول کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم ہوگا۔

(ج) اگر رب المال نے بوقت مضاربت یہ کہا جو تجھے نفع ہوا وہ ہم میں نصف نصف ہے جبکہ مضارب اول نے دوسرے شخص کو مضاربت بالنصف پر مال دیا تو مضاربِ ثانی کے لیے نصف

یعنی ۱/۲ اور باقی نصف میں رب المال اور مضارب اول دونوں برابر ہوں گے۔

(د) اگر رب المال نے بوقت مضاربت یہ کہا جو کچھ نفع ہوا اس میں نصف میرا ہے جبکہ مضارب اول نے دوسرے شخص کو مضاربت بالنصف پر مال دیا تو نصف یعنی ۱/۲ رب المال کا ہوگا اور نصف یعنی ۱/۲ مضارب ثانی کا ہوگا۔ اور مضارب اول کو کچھ نہ ملے گا۔

(ہ) اگر رب المال نے بوقت مضاربت یہ کہا جو کچھ نفع ہوا اس میں نصف میرا ہے جبکہ مضارب اول نے دوسرے شخص کو مضاربت بالثلثین یعنی ۲/۳ پر مال دیا تو کل نفع کا نصف یعنی ۱/۲ رب المال کو ملے گا اور باقی نصف یعنی ۱/۲ مضارب ثانی کو ملے گا جبکہ مزید کل نفع کا سدس یعنی ۱/۶ مضارب اول اپنے پاس سے مضارب ثانی کو دیگا۔

صورت مذکورہ بالا کے پانچ اجزا ہیں ہر جز کا مفہوم اور حکم علیحدہ علیحدہ ہے جبکہ دقیق نظر سے دیکھا جائے تو فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے وضاحت درج ذیل ہے۔

صورت مذکورہ بالا کی جز الف یہ ہے کہ مضارب نے رب المال کی اجازت سے دوسرے شخص کو مضاربت بالثلث پر مال دیا جبکہ رب المال نے مضارب اول سے یہ طے کر لیا تھا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ دے گا وہ ہمارے درمیان نصف نصف ہوگا تو رب المال کو اس شرط کے بموجب کل نفع کا نصف ملے گا اور مضارب ثانی کو ایک ثلث کیونکہ مضارب اول نے اس کے لیے کل نفع کا ایک ثلث مقرر کیا تھا اب باقی رہا ایک سدس وہ مضارب اول کو ملے گا ۔ مثلاً مضارب ثانی کو چھ (۶) روپے کا نفع ہوا تو تین روپے رب المال کو ملیں گے اور دو روپے مضارب ثانی کو اور ایک روپیہ مضارب اول کو ملے گا۔ اس لیے کہ دوسرے کارکن کو یہ مال مضاربت پر دینا صحیح ہے کیوں کہ مالک مال کی طرف سے پہلے کارکن کو اس کی اجازت حاصل ہے اور پھر مالک مال نے اپنے لیے نصف کی شرط بھی کی ہوئی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نفع عطا فرمائے گا آدھا آدھا ہوگا۔ اس لیے جب پہلا کارکن مالک مال کو اس کا آدھا نفع دے دے گا تو اب اس کے پاس علاوہ باقی نصف کے کچھ نہیں بچا اور اس نے اپنے نصف حصے میں دوسرے کارکن کے لیے تہائی حصہ مقرر کیا ہے جو اسی آدھے میں ادا کیا جائے گا اس لیے اب مضارب اول کے لیے چھٹے حصے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا اور یہ نفع دونوں کارکنوں کے واسطے حلال و جائز بھی ہوگا کیونکہ دوسرے کارکنوں کا کام پہلے کارکن کے لیے ہی کیا جا رہا ہے جس کی اجازت مالک

کی طرف سے اس کو پہلے ہی حاصل ہے ان کا یہ عمل ایسے ہی ہو گا جس طرح کسی شخص کو کپڑے کی سلائی کے لیے مزدور لگایا گیا اور سلائی ایک درہم طے پائی تو اس درزی نے آگے ایک اور درزی کو یہ کپڑا نصف درہم میں سِلنے کے لیے دے دیا تو دونوں کے واسطے یہ اُجرت حلال ہو گی[۱۱]

صورت مذکورہ بالا کی جز "ب" کی تفصیل یہ ہے اگر رب المال نے بوقت مضاربت طے ہونے مضارب اول سے یہ کہا ہو کہ تجھ کو جو کچھ نفع ہو گا وہ ہمارے درمیان نصف نصف ہو گا اور مسئلہ کی حیثیت علی حالہ ہے تو مضارب ثانی کو ایک ثلث ملے گا اور باقی دو ثلث رب المال اور مضارب اول کے درمیان نصف نصف میں تقسیم ہو گا پس اس صورت میں تینوں کو دو دو روپے ملیں گے کیونکہ یہاں رب المال نے اپنے لیے نفع کی اس مقدار کا نصف مقرر کیا ہے جو مضارب اول کو ہو گا اور وہ یہاں ۲/۳ دو ثلث ہے لہٰذا رب المال کو اس کا نصف یعنی ۱/۳ ایک ثلث ملے گا بخلاف پہلی صورت کے کہ اس میں رب المال نے اپنے لیے کل نفع کا نصف مقرر کیا تھا[۱۲]

الہدایہ میں ہے اگر مالک نے کارکن سے یہ کہا تھا کہ میں مضاربت کا معاملہ اس شرط پر کرتا ہوں کہ جو نفع اللہ تعالیٰ تجھ کو عطا فرمائے وہ ہمارے درمیان آدھا آدھا پورا ہو گا تو اس صورت میں دوسرے کارکن کے لیے ایک تہائی نفع ہو گا اور باقی نفع پہلے کارکن اور مالک مال کے درمیان برابر آدھا آدھا تقسیم ہو گا کیونکہ مالک مال نے تصرف اور مضاربت کے معاملہ کا اختیار پہلے کارکن کو اس طرح سپرد کیا ہے کہ جو کچھ نفع پہلے کارکن کو حاصل ہو گا اس کے نصف کا مستحق مالک مال ہو گا اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پہلے کارکن کو دوسرے کارکن کا حصّہ نکالنے کے بعد دو تہائی ۲/۳ حصّہ حاصل ہوا ہے اس لیے یہ دو تہائی ۲/۳ حصّہ مالک مال اور پہلے کارکن کو برابر تقسیم ہو گا برخلاف پہلی صورت کے کیونکہ وہاں مالک مال نے اپنے واسطے نصف نفع کی شرط کر لی تھی اس لیے دونوں صورتوں میں مذکورہ بالا حیثیت سے فرق واضح ہو گا[۱۳]

صورت مذکورہ بالا کے جز "ج" کی تفصیل یہ ہے اگر رب المال نے مضارب سے یہ کہا کہ تو جو نفع حاصل کرے وہ ہمارے درمیان نصف ہے اور مضارب اول نے مضارب ثانی کو مضاربت بالنصف پر مال دیا تو مضارب ثانی کو اس کی شرط کے بموجب نصف ملے گا اور باقی نصف میں رب المال اور مضارب اول دونوں برابر کے شریک ہوں گے یعنی رُبع ۱/۴ رب المال اور رُبع ۱/۴

مضارب اول کا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں اس صورت میں مضارب ثانی کو تین روپے ملیں گے رب المال اور مضارب اول کو ڈیڑھ ڈیڑھ ۱½ روپیہ ملے گا[۱۴۴] مصادر قانون اسلامی میں یہی تفصیل ہے کہ اگر مالک مال نے کارکن سے یہ کہا کہ جو کچھ تو نفع حاصل کرے وہ میرے اور تیرے درمیان برابر نصف نصف ہے اور حال یہ ہے کہ پہلے کارکن نے یہ مال مضاربت کسی دوسرے شخص کو نصف نفع کی مضاربت پر دے دیا تو اب اس صورت میں دوسرے کارکن کے لیے نصف نفع ہوگا اور باقی نصف پہلے کارکن اور مالک کے درمیان برابر مشترک رہے گا۔ اس لیے کہ پہلے کارکن نے دوسرے کارکن سے نصف نفع کی شرط کرلی تھی اور اس چیز کا اختیار اس کو مالک مال کی طرف سے حاصل ہے اس وجہ سے دوسرا کارکن نصف حصہ کا مستحق ہے اور صورت حال یہ ہے کہ مالک مال نے اپنے لیے نفع کی اس مقدار کا نصف مقرر کیا ہے جو پہلے کارکن کو حاصل ہو اور پہلے کارکن کو صرف نصف حاصل ہوا ہے لہذا یہی نصف مقدار نفع کی ان دونوں یعنی مالک مال اور پہلے کارکن کے درمیان برابر مشترک رہے گی[۱۴۵]

صورت مذکورہ بالا کے جز "د" کی تفصیل یہ ہے اگر رب المال نے مضارب اول سے کہا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ دے گا اس کا نصف میرا ہے اور مسئلہ علی حالہ ہو تو نصف نفع رب المال کا ہوگا اور نصف مضارب ثانی کے لیے اور مضارب اول کو کچھ نہ ملے گا کیونکہ اس نے اپنا نصف نفع مضارب ثانی کو دے دیا[۱۴۶]

مصادر قانون اسلامی میں بھی یہی وضاحت موجود ہے۔ اگر رب المال یعنی مالک مال نے کارکن سے یہ کہا کہ اس شرط پر عقد مضاربت کرتا ہوں کہ جو کچھ نفع اللہ تعالیٰ عطا فرمائے تو میرے واسطے اس کا آدھا حصہ ہوگا یا اس نے کارکن سے یہ کہا کہ جو کچھ اصل سرمایہ میں اضافہ ہو تو وہ میرے اور تیرے درمیان برابر نصف نصف ہوگا اور حال یہ ہے کہ پہلے کارکن نے یہ مال نصف نفع کی مضاربت پر دوسرے کارکن کو دے دیا ہے تو ایسی صورت میں نصف نفع مالک مال کا ہوگا اور نصف نفع دوسرے کارکن کا ہوگا اور پہلے کارکن کے لیے نفع میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا اس لیے کہ مالک مال نے اپنے واسطے مطلقاً نفع اور اضافہ میں نصف مقدار مقرر کرلی ہے اس وجہ سے پہلے کارکن کی دوسرے کارکن کے واسطے نصف نفع کی یہ شرط اس کے پورے حصے کی طرف لوٹے گی لہذا یہ نصف حصہ اس شرط

اور معاہدہ کی رُو سے دوسرے کارکن کے لیے ہی ہوگا اور پہلا کارکن بغیر کسی نفع ان میں سے خارج ہوگا اور معاملہ سے کسی قسم کا نفع حاصل کئے بغیر نکل جائے گا جیسے کسی شخص کو بطور اجیر (مزدور) مقرر کیا گیا ہو کہ وہ ایک درہم کے عوض کپڑے کی سلائی کر دے تو اس نے ایک شخص کو مزدوری پر لگا دیا کہ اسی ایک درہم کے عوض وہ کپڑا سی دے تو دوسرا مزدور ایک درہم کی اجرت کا حق دار ہوگا۔ اس معاملہ کے درست ہونے کی وجہ سے پہلے مزدور (درزی) کو کچھ نہیں ملے گا کیوں کہ اس نے اپنی ہی مرضی سے اپنے حق کو دوسرے کے لیے مخصوص کر دیا[۲۳]

صورت مذکورہ بالا کی آخری جز "د" کی تفصیل یہ ہے اگر مضارب اول نے مضاربِ ثانی کے لیے نفع کے دو ثلث کی شرط کر لی تو مضاربِ اول مضاربِ ثانی کو نفع کا ایک سدس یعنی ۱/۶ اپنے پاس سے دے گا کیونکہ کل نصف تو رب المال کا ہوا اور مضاربِ ثانی کل نفع کے دو ثلث ۲/۳ کا مستحق ہے تو اس کے حصہ میں جو سدس ۱/۶ کی کمی واقع ہوئی ہے وہ مضاربِ اول اپنے پاس سے پوری کرے گا[۲۴]

مصادر قانون اسلامی نے جز مذکورہ کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اگر پہلے کارکن نے دوسرے کارکن سے دو تہائی ۲/۳ حصہ نفع کی شرط مقرر کر لی تو مالک مال کے واسطے نصف نفع ہوگا اور دوسرے کارکن کے واسطے اسی نفع میں سے نصف ہوگا اور پہلا کارکن دوسرے کارکن کو اپنے مال میں سے نفع کے چھٹے حصے کا ضمان ادا کرے گا۔ حصہ کی صورت یہی ہے کہ مالک نے اپنے واسطے نصف نفع کی شرط کی تھی اس لیے کہ پہلے کارکن نے دوسرے کارکن کے واسطے ایک ایسی چیز کی ذمہ داری شرط کر لی ہے کہ جس کا مالک مال ہی مستحق ہے۔ اس لیے مالکِ مال کے حق میں تو کارکن کی شرط نافذ نہ ہوگی کیوں کہ اس صورت میں مالک مال کے حق کو باطل کرنا لازم آتا ہے جس کا کارکن کو اختیار نہیں ہے لیکن دوسرے کارکن کے واسطے نفع کی شرط مقرر کرنے میں جو وضاحت کی ہے وہ صحیح اور درست ہے کیوں کہ وہ ایک ایسی تصریح اور معلوم شدہ چیز ہے اور جو ایسے معاہدہ کے ضمن میں بھی پائی جاری ہے اور جس کا یہ کارکن حق دار بھی ہے اور مختار بھی ہے اور یہ پہلا کارکن دوسرے کارکن کیلئے اس حقدار کی سلامتی کا ضامن بھی ہو چکا ہے لہٰذا اس حقدار کا پورا کرنا اس کے لیے لازم ہوگا۔ اس بنا پر دو تہائی ۲/۳ کو پورا کرنے کے لیے نفع کے چھٹا حصہ کا ضمان ادا کرے گا۔ یہ ضمان اس

وجہ سے بھی ادا کرے گا کہ پہلے کارکن ہی نے دوسرے کارکن کو اس معاہدے کے بارے میں دو تہائی ⅔ نفع کی شرط کر کے دھوکے میں رکھا ہے حالانکہ اتنی مقدار کا وہ خود بھی حق دار نہیں ہے اور یہ دھوکہ ہی دوسرے کارکن کے رجوع کرنے کا سبب ہے لہذا یہ پہلے کارکن سے چھٹا حصہ لے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی شخص کسی کپڑے کی سلائی کے لیے ایک درہم مزدوری کے بدلے لگایا گیا تو اس نے یہی کپڑا کسی دوسرے مزدور کو ڈیڑھ درہم کے بدلے سینے کے لیے دیا تو اس صورت میں پہلا مزدور ایک درہم تو وہ دے گا جو اس کو کپڑے کے مالک کی طرف سے ملے گا اور جو زائد نصف درہم ہے وہ اپنی گرہ سے دوسرے مزدور کو ادا کرے گا۔[۹]

معاہدۂ مضاربت کے باطل ہونے کی صورتیں

(۱) فریقین (ربُّ المال۔مضارب) میں سے کسی ایک کی موت واقع ہو جائے تو معاہدہ مضاربت باطل ہو جاتا ہے۔

(ب) رب المال کے مرتد ہو جانے پر جبکہ وہ دارالحرب میں کافروں کے ساتھ جا ملا ہو تو مضاربت باطل ہو جاتی ہے۔

جزء "الف" کی تفصیل تحقیق کی روشنی میں ملاحظہ ہو۔ اگر رب المال یا مضارب مر جائے تو مضاربت باطل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ مضارب کے عمل کے بعد مضاربت تو وکیل کے حکم میں ہوتی ہے اور وکالت موکل یا وکیل کے مرنے سے باطل ہو جاتی ہے تو مضاربت بھی باطل ہو جائے گی۔ نیز اگر رب المال خدانخواستہ مرتد ہو کر دارالحرب میں چلا جائے تب بھی مضاربت باطل ہو جاتی ہے۔ فقیہہ علی خفیف تمام فقہاء کا متفقہ مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب کوئی شریک انتقال کر جائے تو اس کے حصّہ کی حد تک معاہدہ شرکت ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ حصّہ وراثت میں اس کے وارث کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لہذا مورث کا کیا ہوا معاہدہ کالعدم ہو جاتا ہے یہی حکم مضاربت میں صاحب سرمایہ یا کاروباری فریق کی موت کا ہے۔ اس اصول کے مطابق اگر شرکت تین افراد کے درمیان تھی اور ان میں ایک کی موت واقع ہو گئی تو وہ صرف اس شریک کے حصے کی حد تک شرکت ختم ہو جائے گی۔ باقی دو شرکاء کے حصے میں نہیں ختم ہو گی۔[۸]

علامہ کاسانی لکھتے ہیں کہ فریقین میں سے کسی ایک کی موت سے معاہدہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ مضاربت میں ایجنٹ بنانا شامل ہے اور ایجنسی ایجنٹ بنانے والے یا ایجنٹ کی موت سے ختم ہو جاتی ہے۔ خواہ کاروباری فریق کو صاحب سرمایہ کی موت کا علم ہو یا نہ ہو۔ کیوں کہ یہ قانوناً معزولی ہے جو علم و اطلاع پر موقوف نہیں ایسا ہی ایجنٹ بنانے میں ہوتا ہے البتہ اگر سرمایہ اشیاء تجارت کی شکل میں ہو تو ایجنٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے فروخت کرے تاکہ وہ نقد کی صورت میں آجائے [۸۱]

مالکی فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے۔ احمد الدردیر الشرح الصغیر میں لکھتے ہیں۔ جو وفات پا جائے اور اس کی جانب یعنی اس کے پاس مضاربت پر لیا ہوا مال ہو..... تو اگر یہ مال اس کے ترکہ میں بعینہٖ پایا جائے اور یہ بات ثابت ہو گئی تو اسے بعینہٖ لے لیا جائے گا اور اگر بعینہٖ نہیں پایا گیا تو اس کے ترکہ میں اس طرح کا مال یا اس کی قیمت لی جائے گی [۸۲]

شافعی فقہاء کے نزدیک یہی صراحت ہے کہ مضاربت کی صورت میں بھی مضاربت ایک جائز معاہدہ ہے جو فریقین میں سے کسی ایک کے ختم کر دینے سے یا اس کی موت سے ختم ہو جاتا ہے [۸۳]

حنبلی فقہاء کا مسلک بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ ابن قدامہ المغنی میں لکھتے ہیں کہ مضاربت جائز معاہدوں میں سے ہے جو فریقین میں سے کسی کے ختم کرنے یا کسی کی موت سے ختم ہو جاتا ہے [۸۴] چنانچہ چاروں فقہی مکاتب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی موت سے اس فریق کے حصہ کی حد تک مضاربت کا معاہدہ ختم ہو جائے گا البتہ کاروبار اور حساب کتاب میں نزاعی صورتِ حال پیدا ہو جانے پر حنفی اور شافعی فقہاء کی رائے کے مطابق اس کام کی تکمیل کے لیے مزید وقت دیا جائے گا۔

اب جزء "ب" کی تفصیل تحقیق کی روشنی میں ملاحظہ ہو۔ رب المال کے مرتد ہو جانے پر جبکہ اسنے دارالحرب میں جا کر پناہ حاصل کر لی ہو تو معاہدہ مضاربت ختم متصور ہو گا۔ اس سلسلے میں تراجم مصادر قانون اسلامی کی تحقیق درج ذیل ہے۔

اگر خدانخواستہ مال والا اسلام سے مرتد ہو کر دارالحرب میں کافروں کے ساتھ جا ملے تو مضاربت باطل ہو جائے گی اس لیے کہ دارالحرب میں الحاق کر لینا موت کی طرح ہے چنانچہ مرتد ہو کر دارالحرب میں چلے جانے والے کا مال اس کے وارثوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ دارالحرب سے جا ملے جبکہ وہ مرتد ہو چکا ہے اس کے کارکن کا تصرف معلق رکھا جائے گا۔ یہ مسلک امام ابو حنیفہؒ

کا ہے اس لیے کہ کارکن جو کچھ تصرفات کرتا ہے وہ مال والے کے لیے اور کارکن کا تصرف خود مال والے کے تصرف کی طرح ہوگا۔ تو جن صورتوں میں اصل سرمایہ دار کا تصرف رک جاتا ہے ان ہی صورتوں میں اس کے کارکن کا تصرف بھی رک جانا چاہیئے[۸۵] نیز الہدایہ میں ہے:-

واذا مات رب المال او المضارب بطلت المضاربۃ لانہ توکیل علی ما تقدم وموت الموکل یبطل الوکالۃ وکذا موت الوکیل۔ وان ارتد ربُّ المال عن الاسلام والعیاذ باللہ ولحق بدار الحرب بطلت المضاربۃ لان اللحوق بمنزلۃ الموت[۸۶]

فقہاء جعفریہ کے نزدیک صرف اتنا ہے کہ اگر کوئی شریک شریکوں میں سے مرجائے یا دیوانہ ہو جائے یا بے ہوش ہو جائے تو دوسرے شریک مشترکہ مال میں سے تصرف نہیں کر سکتے اسی طرح اگر ایک ان میں سے سفیہ ہو جائے کہ جو اپنے مال کو بیہودہ کاموں میں خرچ کرنے لگ جائے تو بھی دوسرے شریک مشترکہ مال میں تصرف نہیں کر سکتے[۸۷]

معاہدۂ مضاربت ختم ہو جانے پر بقیہ قرضوں کی وصولی کا حکم

اگر فریقین معاملہ مضاربت ختم کر کے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں لیکن تا حال مضاربت کے سلسلہ میں لوگوں پر کچھ قرضے باقی ہیں جبکہ مضارب مال مضاربت پر نفع بھی حاصل کر چکا ہے تو شرعی عدالت مضارب کو قرضوں کی وصولی پر مجبور کرے گی بصورتِ دیگر اگر مضارب نے مال مضاربت پر نفع حاصل نہیں کیا تو مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ مضارب کے لیے یہ لازمی ہوگا کہ وہ ربُّ المال کو قرضوں کی وصولی کے لیے وکیل بنائے۔

تجارت میں نفع حاصل ہونے کی صورت میں مضارب قرض وصول کرنے پر اس لیے مجبور کیا جائے گا کیونکہ مضارب اجیر کی مانند ہے اور نفع اجرت کی مانند ہے۔ لہٰذا اس کو اس تمام عمل پر مجبور کیا جائے گا اور اگر مضارب کو نفع حاصل نہ ہوا تو مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس صورت میں مضارب مُتبرع اور مُحسن ہے اور مُتبرع پر جبر نہیں ہوتا بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ قرض وصول کرنے کیلئے رب المال کو وکیل بنا دے تاکہ اس کا حق ضائع نہ ہو۔ الہدایہ میں ہے اگر کارکن اور مال والا مضاربت ختم کر کے

ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں حالانکہ اس مضاربت کے سلسلہ میں لوگوں کے ذمے کچھ قرضے ہیں اور کارکن نفع بھی حاصل کر چکا ہے تو قاضی قرضوں کے مطالبہ اور قرضداروں سے قرضوں کی وصولی کے بارے میں کارکن کو مجبور کرے گا کیوں کہ کارکن اجیر کے مانند ہے اور نفع گویا اس کی اُجرت ہے اور اگر کارکن نے عمل مضاربت میں کوئی نفع حاصل نہیں کیا ہے تو اس پر قرضوں کا تقاضا لازمی نہیں ہوگا اس لیے کہ ایسی صورت میں وہ محض وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا کام بھی احسان اور نیکی کی خاطر ہے تو نیکی کرنے والے اور احسان سے کام لینے والے کو اس کے عمل پر مجبور نہیں کیا جاتا البتہ قاضی کی طرف سے کارکن کو کہا جائے گا کہ وہ مالکِ مال کو قرضوں کے تقاضے کے لیے وکیل بنا دے کیوں کہ حقوق معاہدہ کرنے والے کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کا وکیل بنانا اور مالک مال کا وکالت قبول کر لینا ضروری ہے تاکہ اس کا حق ضائع نہ ہو[۹۸]۔

مال مضاربت میں نقصان کا واقع ہونا

اگر مال مضاربت کا کچھ حصہ ہلاک ہو جائے تو اس کو نفع سے مجرا کیا جائے گا کیوں کہ راس المال یعنی سرمایہ اصل ہے اور نفع اس کے تابع ہے اور نقصان کو تابع کی طرف پھیرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے جیسا کہ نصاب زکواۃ میں ضائع ہونے کو زائد از نصاب میں سے شمار کرتے ہیں یعنی ہلاکت مقدار عفو کی طرف راجع ہوتی ہے اور اگر اتنا مال ہلاک ہو جائے یعنی ضائع یا نقصان ہو جائے کہ نفع سے بڑھ جائے تو مضارب اس کا ضامن نہ ہوگا کیوں کہ وہ امین ہے اور امین پر ضمان نہیں ہوتا۔

کنز الدقائق میں ہے: اور جو مال ہلاک ہو جائے مال مضاربت سے تو وہ نفع سے ہوگا اور اگر نفع سے زیادہ ہلاک ہو جائے تو ضامن نہ ہوگا یعنی مضارب۔ اور اگر نفع تقسیم کر لیا گیا ہو اور مضاربت باقی رہی ہو پھر کل مال ہلاک ہو گیا یا کچھ مال تو نفع کو لوٹا دیں تاکہ مالک اپنا راس المال لے لے اور جو بچے وہ ان دونوں کے درمیان ہوگا اور اگر کم پڑ جائے تو مضارب ضامن نہ ہوگا[۹۹] کیونکہ یہ اصول ہے کہ مشترکہ کاروبار خواہ وہ مضاربت کی بنیاد پر ہو یا شراکت کی بنیاد پر نقصان ہونے کی صورت میں یہ نقصان اصحاب سرمایہ کو یا صرف صاحبِ سرمایہ کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ تمام مکاتب فکر اور فقہ اس پر متفق ہیں اسی اصول کی صراحت ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں یوں کی ہے:۔

مسلمانوں کے درمیان مضاربت کے جواز کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ...... اور وہ

سب اس پر متفق ہیں ..... کاروباری فریق پر اصل سرمایہ کے ضائع ہوجانے والے حصہ کے سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں بشرطیکہ اس میں اس کی زیادتی کو دخل نہ ہو۔"[۹۰]

مشہور حنفی محقق شمس الدین سرخسی لکھتے ہیں کہ :۔

"نقصان سرمایہ کے ہلاک جانے والے حصہ کا نام ہے اور یہ کہ اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ نقصان کی کوئی ایسی نسبت طے کرنا جو سرمائے کی مقدار کے مطابق نہ ہو باطل شرط ہے۔ مضاربت میں مضاربت پر مال لے کر کام کرنے والے کے ذمے کچھ بھی نقصان طے کرنا جائز نہیں[۹۱] یہ بات کہ مضاربت میں کاروباری فریق جو اپنا سرمایہ کاروبار میں نہ لگائے نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا۔"

موطا امام مالک کی کتاب القراض سے بھی واضح ہے کہ مضاربت اس طور پر درست ہے کہ آدمی ایک شخص سے روپیہ لے اس شرط پر کہ محنت کرے گا لیکن اگر نقصان ہو تو اس پر ضمان نہ ہوگا[۹۱]
شافعی مکتب فکر کا اصول بھی یہی ہے نفع اور نقصان دونوں سرمایوں کی مقدار کے مطابق تقسیم ہوگا خواہ شرکا کے کاروباری اعمال برابر ہوں یا ان میں فرق ہو۔ اگر وہ اس کے خلاف تقسیم کا کوئی اصول طے کرتے ہیں تو معاہدہ فاسد ہو جائیگا۔

شافعی فقہ کی مستند کتابوں میں مضاربت کی بحث میں یہ واضح کر دیا گیا ہے یہ ایک معاہدہ ہے جو کاروبار کرنے والے فریق کے ساتھ سرمائے کا مالک کاروبار کے نفع میں ایک متعین حصہ کے ساتھ شرکت کرتا ہے نقصان سے کاروباری فریق کا کوئی تعلق نہیں ہے[۹۳]

حنبلی محقق ابن قدامہ المقدسی لکھتے ہیں نقصان یعنی خسارہ شرکت میں ہر شریک کا اسکے سرمایہ کے مطابق ہوگا اور مضاربت میں نقصان مخصوص طور پر سرمائے پر ہوگا۔ کاروباری فریق پر نہ ہوگا کیوں کہ خسارہ اصل سرمایہ میں کمی کا نام ہے جو صاحب سرمایہ کی ملکیت ہے جس میں کاروباری فریق کا کوئی حصہ نہیں لہذا نقصان مالک کے سرمایہ میں ہی ہوگا دوسرے فریق کا نہیں ہوگا[۹۴]



فہرست کتب برائے حوالجات

۱/ القرآن (سورۃ المزمل)

۲/ علامہ علاؤ الدین کاسانی - بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ٦، ص ۷۹، سعید کمپنی ادب منزل کراچی ۱۹۸۶ء۔

۳/ محمود آلوسی - روح المعانی - دار العلم بیروت - ج ۱۰، ص ۱۱۴۔

۴/ تفسیر کبیر - ج ۸، ص ۳۴۶ - ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری القرطبی - احکام القرآن ج ۴، ص ۸۸۲ - م - دار المکتب مصریہ طبع ثانی ۱۹۳۷ء / ۱۳۵۷ھ۔

۵/ القرآن سورۃ الجمعہ۔

۶/ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع - ج ۶، ص ۷۹۔

۷/ علامہ ماوردی - مغنی المحتاج - ج ۲، ص ۳۰۹۔

۸/ ابن حزم - احکام القرآن - ج ۸، ص ۲۴۷۔

۹/ نہایۃ المحتاج - ج ۵، ص ۲۴۷۔

۱۰/ برہان الدین علی بن ابوبکر المرغینانی - الہدایہ - ج ۳، ص ۵۵۷ (کتاب المضاربت)۔

۱۱/ علامہ کتانی - تراتیب الدرایۃ - ج ۲، ص ۲۶۔

۱۲/ ابن قیم - زاد المعاد - ج ۱، ص ۴۰ - نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء۔

۱۳/ شمس الدین السرخسی - المبسوط - م - عالم الکتب بیروت، ۱۹۸۳ء - ج ۲۲، ص ۱۸۔

۱۴/ خلیل احمد - بذل المجہود فی حل ابی داؤد - ج ۴، ص ۲۵۳ - مکتبہ الیحویہ - مظاہر العلوم سہارنپور۔

۱۵/ احمد بن الحسین بن علی - السنن الکبریٰ - ج ۶، ص ۱۱۳ - مکتبہ نشر السنۃ،

بیرون بوہڑ گیٹ ملتان۔
۱۶ ، احمد بن الحسین بن علی = السنن الکبریٰ۔ مکتبہ نشر السنۃ ملتان۔ ج ۶ ، ص ۱۱۳۔
۱۷ ، " " ۔ ج ۶ ، ص ۱۱۲
۱۸ ، کنز العمال کتاب القراض ، ج ۷ ، ص ۳۲۳۔
۱۹ ، السنن الکبریٰ ، ج ۶ ، ص ۱۱۲۔
۲۰ ، " " "
۲۱ ، " " "
۲۲ ، السنن الکبریٰ ، ج ۶ ، ص ۱۱۱۔
۲۳ ، ظفر احمد عثمانی = اعلاء السنن۔ ج ۱۴ ، ص ۸۴ ۔ مکتبہ ادارۃ القرآن دار العلوم الاسلامیہ کراچی ۱۳۸۶ھ۔
۲۴ ، شیخ محمد زکریا۔ اوجز المسالک ، ج ۱۱ ، ص ۴۰۵۔
۲۵ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۔ ج ۵ ، ص ۲۲۔
۲۶ ، ابو الولید محمد بن احمد بن رشد القرطبی = بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد۔ ج ۲ ، ص ۱۷۸۔ م۔ مکتبہ علمیہ لاہور۔
۲۷ ، ابن قدامہ : المغنی۔ ج ۵ ، ص ۲۲۔ مکتبہ ریاض الحدیقۃ المملکت سعودی عرب ۱۹۸۱ء۔
۲۸ ، علامہ عبد الرحمٰن الجزیری ، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ ج ۳ ، ص ۶۱۔ م، علماء اکیڈمی لاہور ۱۹۸۳ء / ۱۴۰۳ھ۔
۲۹ ، قاضی محمد بن علی بن الشوکانی = نیل الاوطار شرح الاخبار۔ ج ۵ ، ص ۲۶۸ ، مکتبہ۔ المطبعۃ الاخیرت مطبع البابی الحلبی۔
۳۰ ، اتحاف سادۃ المتقین۔ ج ۵ ، ص ۴۶۵۔
۳۱ ، ابو عبد اللہ محمد بن عبد الباقر الزرقانی = الزرقانی شرح الموطا۔ ج ۳ ، ص ۳۴۵۔ مطبع مصطفیٰ محمد مصر ۱۹۳۶ء۔
۳۲ ، سید امیر علی مرحوم : عین الہدایہ شرح الہدایہ۔ ج ۳ ، کتاب المضاربت ، ص ۵۵۵،

مکتبہ قانونی کتب خانہ لاہور۔
۳۳۔ شیخ منصور بن یونس بن ادریس البھوتی = کشاف القناع۔ ج ۳، ص ۵۰۷ مکتبہ عالم الکتب بیروت ۱۹۸۳ء۔
۳۴۔ محمد بن اسماعیل؛ سبل السلام۔ ج ۳، ص ۷۷۔ داراحیاء التراث العربی لبنان بیروت۔
۳۵۔ امام راغب اصفہانی؛ مفردات القرآن باب ض۔ ر۔ ب۔
۳۶۔ شاہ ولی اللہ؛ حجۃ اللہ البالغہ۔ ج ۲، ص ۱۱۶۔ اطبع مصر ۱۳۵۲ھ۔
۳۷۔ عین الہدایہ شرح الہدایہ۔ ج ۳، ص ۵۵۶۔
۳۸۔ ادارہ تحقیقات جامع اسلامیہ؛ تراجم مصادر قانون اسلامی۔ ج ۴، ص ۲۰۴ مکتبہ جامع اسلامیہ اسلام آباد۔
۳۹۔ تراجم مصادر قانون اسلامی۔ ج ۴، ص ۲۰۶۔
۴۰۔ امام مالک، موطا امام مالک کتاب القراض۔ ص ۵۰۹۔ مکتبہ اسلامی اکیڈمی لاہور ۱۴۰۲ھ
۴۱۔ علی الخفیف؛ الشرکات فی الفقہ الاسلامی۔ ص ۶۵ ۱۹۶۲ء۔ طبع دار نشر للجامعات المصریہ قاہرہ۔
۴۲۔ المبسوط للسرخسی: ج ۲۲، ص ۳۰ - ۳۱، یحیٰ بن شرف النووی منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین ۱۳۳۴ھ۔ ص ۶۵۔ م۔ داراحیاء المکتب العربیۃ القاہرہ۔
۴۳۔ السلطان ابی المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب؛ فتاویٰ ہندیہ۔ ج ۴، ص ۲۸۸ مکتبہ نورانی کتب خانہ پشاور۔
۴۴۔ الہدایہ کتاب المضاربت۔ ج ۳، ص ۲۷۵۔
۴۵۔ فتاویٰ ہندیہ۔ ج ۴، ص ۲۸۸۔
۴۶۔ فتاویٰ ہندیہ۔ ج ۴، ص ۲۸۸۔
۴۷۔ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد۔ ج ۲، کتاب القراض ص
۴۸۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ ج ۳، مباحث شرکت:۔ حنفی مسلک ص ۱۰۴۔ مالکی مسلک ص ۱۱۰۔

شافعی مسلک ص ۱۱۲ ۔ حنبلی مسلک ص ۱۱۳۔
مباحث مضاربت :۔ حنفی مسلک ص ۴۶ ۔ مالکی مسلک ص ۵۰ ۔ شافعی مسلک ص ۵۵
حنبلی مسلک ص ۵۹ ۔

۴۹ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۔ ج ۶ ، ص ۵۹
۵۰ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۔ ج ۶ ، ص ۸۵
۵۱ ، احمد الدردیر ۔ الشرح الصغیر ۔ ج ۲ ، ص ۳۲۷ کتب خانہ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۴۰ھ
۵۲ ، نووی ۔ منہاج الطالبین ص ۶۴ ۔ ۶۵ (تلخیص)
۵۳ ، نووی ۔ منہاج الطالبین " "
۵۴ ، ابن قدامہ المقدسی ۔ الشرح الکبیر علی المقنع ۔ ج ۵ ، ص ۱۱۶
۵۵ ، الشرح الصغیر ۔ ج ۲ ، ص ۱۵۷
۵۶ ، ابو حامد غزالی ۔ کتاب الوجیز مذاہب الامام شافعی ۔ ج ۱ ، ص ۱۸۷ ، مکتبہ الاداب والموید قاہرہ ۱۳۱۳ھ
۵۷ ، تراجم مصادر قانون اسلامی ۔ ج ۴ ، ص ۲۴۸
۵۸ ، فتاویٰ ہندیہ ۔ ج ۴ ، ص ۲۸۷ ۔ ۲۸۸
۵۹ ، تراجم مصادر قانون اسلامی ۔ ج ۴ ، ص ۲۷ تا ۲۷۲ (تلخیص)
۶۰ ، عین الہدایہ شرح الہدایہ ۔ ج ۳ ، ص ۵۵۸ ۔ ۵۵۹ (تلخیص)
۶۱ ، عین الہدایہ شرح الہدایہ ۔ ج ۳ ، ص ۵۷۶ ۔ وفتاوی عالمگیری اردو ۔ ج ۴ ، ص ۲۹۲
۶۲ ، الہدایہ و عین الہدایہ ۔ ج ۳ ، ص ۵۷۶ فصل فیما یفعلہ المضارب
۶۳ ، الہدایہ و عین الہدایہ ۔ ج ۳ ، ص ۵۷۶
۶۴ ، ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ۔ شرکت و مضاربت کے شرعی اصول ۔ ص ۱۰۲ تا ۱۰۴ (تلخیص)
۶۵ ، ابن عابدین ۔ رد المحتار علی الدر المختار ۔ ج ۵ ، ص ۵۰۹ ۔ المطبع مصطفےٰ البابی الحلبی مصر

۶۶ ، رد المختار علی الدر المختار۔ ج ۴ ، ص ۵۰۹
۶۷ ، الہدایہ وعین الہدایہ باب المضارب یضارب۔ ج ۳ ، ص ۵۶۷
۶۸ ، عبداللہ بن شیخ محمد بن سلیمان : مجمع الانہر فی شرح الملتقی الابحر۔ ج ۲ ، ص ۳۲۸
۶۹ ، عبداللہ بن محمد بن سلیمان : " " "
مکتبہ داراحیاء التراث، بیروت۔ لبنان ۱۳۱۹ھ
۷۰ ، ابی بکر بن علی بن محمد الحداد الیمنی : الجوہرۃ النیرۃ۔ ج ۱ ، ص ۳۵۴، مکتبہ امدادیہ ملتان
۷۱ ، عین الہدایہ۔ ج ۳ ، ص ۶۹ - ۷۰
۷۲ ، الجوہرۃ النیرۃ۔ ج ۱ ، ص ۳۵۴
۷۳ ، عین الہدایہ۔ ج ۳ ، ص ۶۹ - ۷۰
۷۴ ، الجوہرۃ النیرۃ۔ ج ۱ ، ص ۳۵۴ - ۳۵۵
۷۵ ، تراجم مصادر قانون اسلامی۔ ج ۴ ، ص ۲۷۸
۷۶ ، الجوہرۃ النیرۃ۔ ج ۱ ، ص ۳۵۵
۷۷ ، مصادر قانون اسلامی۔ ج ۴ ، ص ۲۷۹
۷۸ ، الجوہرۃ النیرۃ۔ ج ۱ ، ص ۳۵۵
۷۹ ، مصادر قانون اسلامی۔ ج ۴ ، ص ۲۷۹ - ۲۸۰
۸۰ ، علی الخفیف : الشرکات فی الفقہ الاسلامی ، ص ۲۰۳
۸۱ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ ج ۶ ، ص ۱۱۲
۸۲ ، الشرح الصغیر۔ ج ۲ ، ص ۲۳۶
۸۳ ، منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین۔ ص ۶۵
۸۴ ، المغنیٰ۔ ج ۵ ، ص ۱۷۹
۸۵ ، تراجم مصادر قانون اسلامی۔ ج ۴ ، ص ۲۸۹
۸۶ ، عین الہدایہ۔ ج ۳ ، ص ۵۷۲
۸۷ ، اختر عباس : توضیح المسائل ، ص ۴۳۶ ، مکتبہ ناصر لاہور

۸۸ / تراجم مصادر قانون اسلامی۔ ج ۴ ، ص ۲۹۰-۲۹۱

۸۹ / محمد حنیف گنگوہی۔ معدن الحقائق ، شرح کنز الدقائق۔ ج ۲ ، ص ۲۱۱ ، مکتبہ جامعہ اشرفیہ لاہور

۹۰ / بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد۔ ج ۲ ، ص ۱۷۸

۹۱ / المبسوط للسرخسی۔ ج ۱۱ ، ص ۱۵۷

۹۲ / موطا امام مالک ، کتاب القراض ، ص ۵۰۹

۹۳ / منہاج الطالبین۔ ص ۵۶

۹۴ / الشرح الکبیر علی المقنع۔ ج ۵ ، ص ۱۱۵

اسلامی حکومت اور اُس کی معاشی ذمہ داریاں

جناب محمد لطیف اللہ نائب صوبیدار

اسلامی حکومت کے فرائض میں جہاں امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اسلامی تعلیم و تربیت، دفاع، دعوت الی الحق اور اس سلسلہ میں اگر ضرورت پڑے تو جہاد، عدل و قسط اور امن و امان کے قیام کے ذریعے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کرنا سرفہرست ہے۔ وہاں اُس کی معاشی نوعیت کی ذمہ داریاں بھی بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ کیونکہ معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے بغیر وہ اپنے وسیع مقصد میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی۔ اسلامی حکومت کی معاشی ذمہ داریوں میں اعداد و شمار اور کفالت عامہ، معاشی تعمیر و ترقی کا انتظام اور تقسیم دولت میں پائے جانے والے تفاوت اور فرق کو کم کرنا شامل ہے۔ زیر موضوع مقالہ میں اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کے ان ہی پہلوؤں پر مفصل بحث کی جائے گی۔

اعداد و شمار اور کفالتِ عامہ

اسلام کے معاشی نظام میں اعداد و شمار بظاہر دخیل نظر نہیں آتا لیکن بنیادی طور پر معاشی مسائل میں اعداد و شمار کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب تک کسی ملک کی صحیح مردم شماری نہ کی جائے اور پھر عوام کی معاشی زندگی کے درجات یعنی برسر روزگار، بے روزگار، تاجر، کاریگر، نیز معذور، فقیر صاحبِ مرض اور صاحب حاجت افراد کے صحیح اعداد و شمار مرتب نہ ہوں اور زمین، کارخانے، معدنیات یعنی محاصل و مصارف کی تعیین میں اعداد و شمار

کا لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر کوئی حکومت نہ اس مقصد کی تکمیل کر سکتی ہے کہ قلمرو حکومت میں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہے اور نہ وہ معاشی عدل و انصاف کا حقیقی توازن قائم رکھ سکتی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر جب فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تو اعداد و شمار کو خاص اہمیت دے کر خلافت کے مختلف مسائل میں اُن سے مدد لی گئی۔ چنانچہ جب مفتوحہ ممالک سے کثیر مال و دولت حاصل ہوا تو آپ نے صحابہؓ کے مشورہ سے عطایا اور وظائف کے سلسلے میں مردم شماری کے رجسٹر قبائل اور منازل کے لحاظ سے مرتب کرائے اور حضرت عثمانؓ نے تو اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا:

"اریٰ مالا کثیرًا یسع النّاس وان لم یحصوا حتی تعرف من اخذ ممن لم یأخذ خشیت ان ینتشر الامر"[1]

ترجمہ: میں دیکھ رہا ہوں کہ مال اب اس قدر کثرت کے ساتھ حاصل ہو رہا ہے کہ لوگوں کے لیے وُسعت کے ساتھ کفایت کر سکتا ہے۔ سو اگر لوگوں کا شمار کر کے ان کی تعداد کا احاطہ نہ کیا گیا تاکہ پانے والے اور نہ پانے والے کا صحیح پتہ معلوم ہو سکے تو مجھ کو خوف ہے کہ اس معاملہ میں انتشار نہ پیدا ہو جائے۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عثمانؓ کی اس رائے کو شرفِ قبولیت سے ہمکنار کیا:

وکتب الناس علی قبائلهم وفرض لهم العطاء[2]

ترجمہ: اور لوگوں کی قبائل وار فہرست بنائی اور اُن کے روزینے مقرر کیے۔

فدعا عقیل بن ابی طالب ومخرمه بن نوفل وجبیر بن مطعم وکانوا من نسّاب قریش فقال اکتبوا الناس علی منازلهم[3]

---

[1] طبری جلد ۵ صـ ۲۲-۲۳

[2] ایضاً

[3] ایضاً

ترجمہ: حضرت عمرؓ نے عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جُبیر بن مطعم کو بلایا اور یہ تینوں قریش کے نسب کے ماہر تھے اور فرمایا کہ لوگوں کا شمار ان کے مکانات کے اعتبار سے کرو۔

اعداد و شمار کی اہمیت کے یہی اسباب تھے جن کی بدولت تدوینِ دواوین کا افتتاح ہوا

والسبب فی تدوین الدواوین ان عامل عمر علی البحرین اتاه یومًا بخمس مائة الف درهم فاستعظمها وجعل علیها حراسًا فی المسجد فاستشار علیه بعض من عرفوا فارس والشام ان یدون الدواوین یکتبون فیها الاسماء وما لواحد واحد وجعل الارزاق مشاهرة[1]

ترجمہ: ابتدا میں اعداد و شمار کے رجسٹروں کی ترتیب کا سبب یہ پیش آیا کہ بحرین کے گورنر کے پاس سے پانچ لاکھ درہم موصول ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو بڑی تعداد سمجھتے ہوئے مسجد میں اس پر محافظ مقرر کر دیے اور صحابہؓ سے مشورہ کیا اور بعض صحابہؓ نے جو فارس و شام کے حالات سے واقف تھے یہ مشورہ دیا کہ رجسٹروں کی ترتیب کی جائے جن میں لوگوں کے نام اور ان سے متعلق روزینہ کا تذکرہ ہو اور روزینہ کا معاملہ ماہواری ہو جائے۔

حضرت بلالؓ جب بحرین سے مال کثیر لے کر آئے تو حضرت عمرؓ نے مجلس مشاورت طلب فرمائی اور ارشاد فرمایا:

ایها الناس انه قد جاء مال کثیرٌ فان شئتم ان نکیل لکم کلنا وان شئتم ان نعدّ کم عددنا وان شئتم ان نزن لکم وزنا لکم فقال رجلٌ من القوم یا امیر المؤمنین دوّن للنّاس دواوین یعطون علیها فاشتهی عمر ذالک[2]

---

[1] اشہر مشاہیر الاسلام جلد ۲ صفحہ ۳۶۴

[2] کتاب الخراج صفحہ ۴۵

ترجمہ: "لوگو یہ مال کثیر آیا ہوا ہے پس اگر تم چاہو تو میں پیمانہ سے ناپ کر تم میں بانٹ دوں اور اگر تمہاری یہ خواہش ہو کہ گن کر دوں تو شمار سے بانٹ دوں اور اگر یہ مرضی ہو کہ وزن کر کے دوں تو اس طرح تول کر دوں۔ قوم میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا امیر المؤمنین لوگوں کے شمار کے لیے رجسٹر مرتب کرائیے تاکہ اس کے مطابق وظائف دیا کریں حضرت عمرؓ نے اس کو بہت پسند کیا۔"

اسی سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

ان کنت صادقًا لیاتینّ الراعی نصیبہٗ من ھذا المال بالیمن ودمہ فی وجہہ[1]

ترجمہ: بلال اگر یہ سچ ہے کہ روپیہ کی مقدار وہ ہے جو تم بتا رہے ہو تو پھر یمن کے رہنے والے چرواہے تک کا اس مال میں حصّہ ہے بایں حالت کہ سفر کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتماتا ہوا ہو۔

اس جگہ یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ اعداد و شمار اور رجسٹروں کی ترتیب کا یہ سلسلہ تو ہر ایک حکومت میں ہوتا ہے اور مختلف ضروریاتِ حکومت میں سے یہ بھی ایک اہم ضرورت ہے خواہ وہ حکومت سرمایہ دارانہ نظام کی حامی ہو یا اس کی مخالف و معاند ہو اس کا صالح معاشی نظام کے بنیادی مسائل سے کیا تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ اعداد و شمار اور اس سے متعلق دواوین و سجلات کا ہر قسم کی حکومت کے ساتھ تعلق ہے اور کسی خاص طرزِ حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن اس سلسلہ میں صالح معاشی نظام اور فاسد معاشی نظام کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس حکومت کا نظام ایسے اصول پر قائم ہے کہ ان سے مذموم سرمایہ داری عالمِ وجود میں آتی ہے تو اس نظامِ حکومت میں اعداد و شمار کی اہمیت اس لیے ہوگی کہ اس سے معلوم کیا جائے کہ ملک میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں

---

[1] کتاب الخراج ص ۴۶

کی ترقی کی صورت کیا ہو اور کس طرح اس ناپاک مقصد کو ترقی دینے کے لیے عوام اور غریب طبقے کو آلۂ کار بنایا جائے اور اس کے برعکس جب حکومت کا طرز وطریق سرمایہ داری کے خلاف خلقِ خدا کی فلاح وبہبود پر قائم ہے اس کے نظام معاشی میں اس مسئلہ کی اہمیت اس طرح کارفرما نظر آئے گی کہ ہر ممکن طریقہ سے اس کو عوام وخواص سب کی حاجت روائی کے لیے ذریعہ بنایا جائے خصوصاً محروم المعیشت افراد کی حق رسی کا بہترین وسیلہ ثابت ہو۔

اسلام میں اعداد وشمار کی اہمیت ان ہر دو نظریوں میں سے دوسرے نظریے کے پیش نظر ہے اس لیے معاشی نظم وانتظام کے لحاظ سے ضروری ہے کہ اولی الامر اپنے قلمرو میں مردم شماری کا انتظام کرے اور مسلم وغیر مسلم کی تفصیلات کو جُدا جُدا رجسٹروں میں درج کرائے، تاکہ کفالتِ عامہ کی عظیم ذمہ داری سے سرخرو ہو سکے۔

اَب دیکھنا یہ ہے کہ کفالتِ عامہ سے کیا مراد ہے؟ دراصل کفالتِ عامہ کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ دارالاسلام کے حدود کے اندر رہنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا بندوبست کیا جائے یہ بندوبست اس درجہ تک ہونا چاہیے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازمی طور پر شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی حکومت اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر فرد کو ان ضروریات کی تکمیل کرنے والی اشیاء اور خدمات کی مطلوبہ مقداریں بہم پہنچاتی رہے۔ بلالحاظ اس کے کہ وہ خود اپنے مال سے یا اپنی محنت کے ذریعے کسبِ مال کرکے ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، عام حالات میں عام افراد ان ضروریات کو خود اپنے طور پر پورا کرتے رہیں گے۔ بقدرِ ضرورت مال نہ حاصل کر سکنے والے افراد کو اپنے خاندان یا عام افراد اجتماع سے اتنی مدد مل سکے گی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو عارضی بے روزگاری، مرض، بڑھاپے یا کسی حادثے کے سبب معذور ہو جانے کی صورت میں کارخانہ یا متعلقہ صنعت سے اتنا امدادی وظیفہ دلوانے کا اصول بنایا جا سکتا ہے جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ سماجی تحفظ کے ان انتظامات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس اصول کا منشاء

یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد ان انتظامات کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو بالآخر اسلامی حکومت اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ فرد ان وسائل حیات سے محروم نہ رہے جو ضروریات زندگی کے لیے درکار ہیں۔ حکومت کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اجتماعی خزانے سے بقدرِ ضرورت مال حاصل کر سکیں اور دار الاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا، پیاسا، ننگا، بے ٹھکانہ اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔ حضورؐ نے یہ اصول واضح فرما دیا ہے کہ اصحابِ امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔ حدیث نبوی ہے:

من ولاہ اللہ عزّوجل شیئًا من امور المسلمین فاحتجب دُون حاجتھم وخلّتھم وفقرھم احتجب اللہ تعالیٰ عنه دون حاجته وخلّته وفقره [1]

ترجمہ: جسے اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ انکی ضروریات اور فقر سے بے پرواہ ہو کر بیٹھ رہا اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔

قال عمرو بن مرّة لمعاویة انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول: ما من امامٍ یغلق بابه دون ذوی الحاجة والخلّة والمسکنة الا اغلق اللہ ابواب السماء دون خلّته ومسکنته - فجعل معاویة رجلاً علیٰ حوائج الناس [2]

ترجمہ: عمرو ابن مرّہ نے معاویہؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو امام ضرورت مندوں، فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر دیتا ہے اللہ اس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے

---

[1] ابوداؤد: کتاب الخراج والفیئ والامارۃ۔ باب فیما یلزم الامام من امر الرعیۃ والاحتجاب عنہم۔
[2] ترمذی: کتاب الاحکام۔ باب جاء فی امام الرعیۃ۔

بند کر لیتا ہے۔ (یہ سُن کر امیر معاویہؓ نے ایک آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے) پہ مامور کر دیا۔

حضورؐ کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اگر صاحبِ امر ضرورت مند افراد کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو اللہ کی سخت ناراضگی مول لے گا۔ یہ وعید اس بات کے لیے کافی ہے کہ تکمیل ضروریات کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دیا جائے۔ اسلامی حکومت کی اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ خلافت کی اس تعریف سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت سلمانؓ فارسیؓ نے کی ہے جسے سُن کر کعب احبارؓ نے ان کی تصویب فرمائی ہے:

عن سلمان قال - ان الخلیفة هو الّذی یقضی بکتاب الله ویشفق علی الرّعیة شفقة الرجل علی اهله - فقال کعب الاحبار - صدق [1]

ترجمہ: سلمانؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل و عیال پر شفقت کرتا ہے یہ سُن کر کعب بن احبار نے کہا: سچ کہا۔

رعایا کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا اہتمام دراصل اس خیر خواہی کے اندر شامل ہے جو صاحبِ امر پر لازم قرار دی گئی ہے جو حکمران رعایا کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتے اس کا اخروی انجام بُرا ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ما من عبدٍ یسترعیه الله رعیةً فلم یحطها بنصیحةٍ لم یجد رائحة الجنّة [2]

ترجمہ: جس بندہ کو خدا نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اس کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

---

[1] ابو عبید: کتاب الاموال ص۶

[2] بخاری: کتاب الاحکام - باب من استرعی رعیة فلم ینصح

شریعت نے اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا ولی قرار دیا ہے۔ سرپرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اللّٰہ و رسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہٗ[1]

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔

السلطان ولیّ من لا ولیّ لہ[2]

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔

یہ سرپرستی صرف نکاح کے معاملہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک عمومی سرپرستی ہے جس میں رعایا کی ضروریات کی تکمیل بدرجہ اولیٰ شامل ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خط سے صاف ظاہر ہے جو آپ نے ایک نومسلم قبیلہ کے سردار زرعہ بن ذی یزن کے نام لکھا تھا۔ آپ سردار کے توسط سے اس کے قبیلہ حمیر کے لوگوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

"وانیّ امرکم یا حمیر خیراً فلا تخونوا ولا تحادوا وان رسول اللّٰہ مولیٰ غنیکم و فقیرکم وان الصدقۃ لاتحل لمحمد ولا لاھلہ۔ انمّا ھی زکوٰۃ تزّکون بھا الفقراء المومنین[3]

"اہل حمیر میں تم کو بھلی روش اختیار کیے رہنے کی تلقین کرتا ہوں نہ خیانت کرنا اور نہ مخالفانہ روش اختیار کرنا اللہ کا رسول تمہارے مال دار اور غریب تمام لوگوں کا سرپرست ہے۔ صدقہ کا مال محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم یا اس کے گھروالوں

---

[1] ترمذی: ابواب الفرائض - باب ماجاء فی میراث المال

[2] ترمذی: ابواب النکاح - باب ماجاء لانکاح الابولیّ

[3] ابوعبید: کتاب الاموال ص۲۰۲

کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ ہے جسے تم اپنی پاکیزگی کے لیے غریب مسلمانوں کے لیے نکالتے ہو۔"

اس سرپرستی میں بنیادی ضروریات کے علاوہ بشرطِ گنجائش افراد کی دوسری ضروریات کی تکمیل بھی داخل ہو جاتی ہے۔ فتوحات کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما دیا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وفات پا جائیں ان کے قرضے اسلامی ریاست کے خزانے سے ادا کیے جائیں گے۔ فرمایا:

انا اولیٰ بالمومنین من انفسھم فمن توفیٰ وعلیہ دینٌ فعلیّ قضاءُہ[1]

مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے پس جو مقروض وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔

فلما فتح اللہ علیہ الفتوح قال: انا اولیٰ بالمومنین من انفسھم فمن توفیٰ من المؤمنین فترک دینًا فعلیّ قضاءہ ومن ترک مالاً فلورثتہ[2]

پھر جب اللہ نے آپؐ پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو آپؐ نے فرمایا "مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے لہٰذا جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے قرض کے علاوہ مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دوسری ذمہ داریوں مثلاً بے سہارا اہل و اولاد کی کفالت کے سلسلہ میں بھی یہی اعلان فرمایا تھا:

عن ابی ھریرۃؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابوعبید: کتاب الاموال ص ۲۲۰

[2] بخاری: کتاب النفقات۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ترک کلًا او ضیاعًا فالیّ۔

من ترك مالاً فلاهله ومن ترك ضياعًا فإليّ ۔
هٰذا حديث حسنٌ صحيح ... ومعنى قوله ترك
ضياعًا يعني ضائعًا ليس لهٗ شيءٌ ۔ فإليّ ۔ يقول انا
اعوله وانفق عليه [۱]

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو
مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو (کسی کو)
بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری میرے سر ہوگی۔
(امام ترمذی فرماتے ہیں کہ) یہ حدیث حسن صحیح ہے ۔ ... ترك ضياعًا
کے معنی یہ ہیں کہ اس حال میں چھوڑ جائے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو فإليّ
کے معنی یہ ہیں کہ میں اس کی کفالت کروں گا اور مال خرچ کروں گا اسی مفہوم
کی ایک حدیث ابو عبید نے حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے روایت
کی ہے جس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ترك مالاً
فلورثته ومن ترك كلاً فالى الله ۔ وربما قال فالى الله و
رسوله ۔ قال ابو عبيد: الكلّ عندنا كلّ عيلٍ والذرّية
منهم [۲]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو متوفی مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے
وارثوں کے لیے اور جو ذمہ داریاں چھوڑ کر مرے وہ اللہ کے ذمہ ہیں اور
کبھی یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ہیں۔
ابو عبید کہتا ہے کہ ہمارے نزدیک "کل" میں وہ تمام افراد شامل ہیں جن

---

[۱] ترمذی: ابواب الفرائض ۔ باب ما جاء من ترك مالاً فلورثته
[۲] ابو عبید: کتاب الاموال ص ۲۳۷

کی کفالت متوفی کے ذمّہ ہو اور بچے بھی اس میں شامل ہیں ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو افراد اسلامی ریاست کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے انہیں اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا ۔ اس حقیقت پر خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے ۔ حضرت عمرؓ نے اپنی ذمہ داریاں گناتے ہوئے ایک عام خطبہ میں یہ فرمایا تھا :

ایّھا الناس ان اللہ قد کلّفنی ان اصرف عنہ الدعاء[1]

لوگو اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں ۔

اس ارشاد کی تشریح کرتے ہوئے مشہور شافعی فقیہہ ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسّلام لکھتے ہیں :

"اللہ کے حضورؐ کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں ۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری کرے تاکہ اُن کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ ربّ العالمین سے ان کی تکمیل کے طالب ہوں (حکمرانوں پر) مسلمانوں کے جملہ حقوق کے بیان میں یہ جُملہ کتنا جامع اور واضح ہے[2]

عوام کی معاشی ضروریات کی تکمیل کا امیر المؤمنین کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس خطبہ سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت عمرؓ نے قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام کے سامنے دیا تھا ۔

انی حریصٌ علیٰ ان لا اریٰ حاجۃً الا سددتھا ما اتسعَ

---

[1] ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسّلام : قواعد الاحکام فی مصالح الانام جلد ۱ صفحہ ۱۴۸

[2] ایضاً

بعضنا لبعض فاذا اعجز ذٰلك عنّا تأسّينا فی عیشنا حتی نستوی فی الکفاف - ولو ددت انّکم علمتم من نفسی مثل الذی وقع فیھا لکم ولست معلّمکم الا بالعمل. انی واللّٰہ لست بملك فاستعبدکم ولٰکنّی عبد اللّٰہ عرض علیّ الامانۃ فان ابیتھا ورددتھا علیکم واتبعتکم حتی تشبعوا فی بیوتکم وترووا سعدت بکم وان اناحملتھا واستتبعتکم الیٰ بیتی شقیت بکم ففرحت قلیلاً وحزنت طویلاً - فبقیت لا اُقال ولا اُردّ فاستعتب [1]

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں اسے پورا کر دوں جب تک ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے اندر اتنی گنجائش نہ رہ جائے تو ہم باہمی امداد کے ذریعے گزر اوقات کریں گے یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے لیکن میں یہ بات تمھیں عمل کے ذریعے ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنا کر رکھوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں (حکمرانی کی یہ) امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اس کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ (تمہاری چیز سمجھ کر) تمہاری طرف واپس کر دوں اور (تمہاری خدمت کے لیے) تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو میں تمہارے ذریعہ فلاح پاؤں گا اور اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور (اپنے حقوق کے مطالبہ کے لیے) اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو تمہارے ذریعہ میرا انجام خراب ہوگا (دنیا میں) کچھ عرصہ میں خوشی منا لوں گا مگر (آخرت میں) عرصہ دراز تک

---

[1] ابن کثیر : البدایۃ والنہایۃ جلد ۷، ص ۴۶

غمگیں رہوں گا۔ میرا حال یہ ہوگا کہ نہ کوئی مجھ سے کچھ کہنے والا ہوگا نہ کوئی بات کا جواب دے گا کہ میں اپنا عذر بیان کر کے معافی حاصل کر سکوں"

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی حکمران نے اسلامی ہدایات کو اپنا رہنما بنایا اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا تو کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کی گراں باری محسوس کر کے غم کے آنسوؤں کے دریا بہا دیئے۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز خلیفہ بنے تو اس ذمہ داری کا بوجھ محسوس کر کے رونے لگے۔

قالت فاطمة امرأته : دخلت عليه وهو فى مصلاه ودموعه تجرى على لحيته فقلت أحدث شئ ؟ فقال انى تقلدت امر امة محمد فتفكرت فى الفقير الجائع والمريض الضائع ، والغازى والمظلوم المقهور والغريب الاسير والشيخ الكبير وذى العيال الكثير والمال القليل واشباههم فى اقطار الارض فعلمت ان ربى سيسألنى عنهم يوم القيامة وان خصمى دونهم محمد صلى الله عليه وسلم الى الله فخشيت ان لا تثبت حجتى عند الخصومة فرحمت نفسى فبكيت [1]

ان کی بیوی فاطمہ کہتی ہیں کہ میں ایک بار آپ کے پاس گئی آپ جائے نماز پر تھے اور آنسوؤں سے آپ کی داڑھی تر تھی۔ میں نے پوچھا کیا کوئی نئی بات ہوگئی ہے آپ نے فرمایا میں نے پوری امت محمدیہ ﷺ کی ذمہ داری لے لی ہے لہذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار قیدیوں، بہت بوڑھے افراد اور ان لوگوں کے بارے میں سوچ

---

[1] ابن الاثیر: تاریخ الکامل جلد ۵ ص ۲۴

رہا تھا جو بکثرت اہل وعیال والے ہیں مگر مالدار نہیں ہیں اور مختلف علاقوں کے بسنے والے اسی قسم کے دوسرے افراد کے بارے میں متفکر تھا مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے دن اللہ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلہ میں ان لوگوں کے وکیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہونگے. مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات نہ ثابت ہو سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔"

نہ صرف آپ کو اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا بلکہ آپ نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ :

وما احدٌ منکم تبلغنی حاجتہ الّا حرصت ان اسدّ من حاجتہ ما قدرت علیہ[1]

تم میں سے جس کسی کی بھی کسی ضرورت کا علم مجھے ہو گا اس کی ضرورت پوری کرنے میں حتی الامکان پوری کوشش کروں گا۔"

یہی اعلان آپ سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ بھی کر چکے تھے۔ فرمایا :

ومن اراد ان یسئال عن المال فلیاتنی فانّ اللہ جعلنی خازنًا وقاسمًا[2]

"اور جو مال مانگنا چاہے وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ نے مجھے (اپنے مال کا) خزانچی اور تقسیم کنندہ بنا دیا ہے۔"

کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کے بارے میں حضرت عمرؓ کا تصور اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر دار الاسلام کے حدود کے اندر کوئی جانور بھی بھوک سے مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ کے حضور مجھے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

---

[1] ابن جوزی : سیرت عمر بن عبد العزیز ص۱۴۱

[2] ابن جوزی : سیرت عمر بن الخطاب ص۱۰۱

لو مات جمل ضياعًا على شط الفرات لخشيت ان يسألني الله عنه[1]

اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا۔

لو ماتت شاة على شط الفرات ضائعة لظننت ان الله سائلي عنها يوم القيامة[2]

اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے تو میرا خیال ہے کہ اللہ قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا۔

وكان يقول : لو تركت عنزٌ جرباء الى جانب ساقية لم تدهن لخشيت ان اُسأل عنها يوم القيامة[3]

اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشی بکری اس حالت میں چھوڑ دی جائے کہ اُسے (علاج کے طور پر) تیل کی مالش نہ کی جا سکے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔

آپ اپنے ماتحت حکام کو بھی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ بصرہ کے والی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جب ایک وفد کے ساتھ آپ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپ نے ان لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ :

ألا واوسعوا النّاس في بيوتهم واطعموا عيالهم[4]

---

[1] محمد ابن سعد : الطبقات الکبریٰ جلد ۳ ص ۳۰۵

[2] ابن جوزی : سیرۃ عمر بن الخطاب ص ۱۶۱

[3] امام غزالی : التبر المسبوک ص ۱۷

[4] طرطوشی : سراج الملوک ص ۱۰۹

سنو یا لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین کو کھلانے کا سامان کرو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے دورِ خلافت میں جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ کے ساتھ جو عیسائی تھے معاہدہ کیا تو اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی :

وجعلت لھم ایّما شیخ ضعف عن العمل واصابتہ آفۃ من الآفات اوکان غنیًا فافتقر وصار اھل دینہ یتصدّقون علیہ طرحت جزیتہ' وعُیّل من بیت مال المسلمین وعیالہُ' ما اقام بدارالھجرۃ ودارالاسلام[1]

میں نے ان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آپڑے یا جو آدمی پہلے مال دار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں اسکا جزیہ ساقط کر دیا جائے گا اور جب تک وہ دار الہجرت اور دار الاسلام میں مقیم رہے گا۔ اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کفالت مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔

اُوپر جو احادیث و آثار بیان کیئے گئے ہیں ان کا تعلق بنیادی ضروریات سے ہے۔ اگرچہ بعض احادیث میں ادائے قرض کا بھی تذکرہ ہے اور سرپرستی کی احادیث، کا تعلق ہر طرح کی بنیادی ضروریات سے ہے۔ بعض دوسرے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ غذا، لباس، مکان اور علاج جیسی بنیادی ضرورتوں کے علاوہ دوسری ضروریات کی تکمیل کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

ان دوسری ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت عام تعلیم کی ہے۔ اسلامی حکومت اپنے شہریوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھانے کا بھی اہتمام کرتی تھی۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ لوگ لکھنا اور پڑھنا سیکھیں آپؐ ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ نے

---

[1] ابو یوسف : کتاب الخراج ص۱۴۲

یہود کی زبان سیکھی تھی۔ بدر کے موقع پر متعدد قیدیوں کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دے۔ صفہ کی اسلامی درسگاہ میں شریک ہونے والے قرآن کریم اور تعلیمات دین کے ساتھ لکھنا بھی سیکھتے تھے متعدد روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دیہات کے علاقوں میں عوام کو اسلامی آدابِ زندگی سکھانے کے لیے مدینہ سے اپنے کسی صحابی کو بھیجتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بچوں کی تعلیم کے لیے معلّم مقرر کیے تھے۔

عن الوضیف بن عطاء قال ثلاثة کانوا بالمدینة یعلمون الصّبیان و کان عمر بن الخطاب یرزق کل واحدٍ منهم خَمسة عشر درهمًا کل شهر[1]

ترجمہ: وضیف بن عطار سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ مدینہ میں تین آدمی تھے جو بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اور عمر بن الخطّاب ان میں سے ہر ایک کو پندرہ درہم ماہانہ دیا کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ آپ کو ان لوگوں کی فہرست بھیجی جائے جن کو قرآن کریم حفظ ہے تاکہ ان کو اونچے وظیفے دے کر مختلف علاقوں میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے پر مامور کر دیا جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی دیہات کے مسلمانوں کو اسلامی آدابِ زندگی کی تعلیم دینے کے لیے باتنخواہ معلّم مقرر کیے تھے۔ آپ نے طالب علموں کے لیے اور ایسے افراد کے لیے جو اپنے علمی مشاغل کے سبب کسبِ معاش سے قاصر تھے وظائف بھی مقرر کیے تھے۔

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کی طرف سے علم سکھانے کا اہتمام کیا گیا تھا بلکہ معذور افراد کو خادم بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے شام میں نابینا افراد یا دوسرے مرض کے سبب معذور افراد اور بے سہارا یتیم بچوں کی خدمت کے لیے سرکاری طور پر خادم فراہم کیے تھے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں شدید قحط پیش آیا تو

---

[1] کنز العمال جلد ۲ بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ

آپ نے سرکاری طور پر کھانا پکوا کر تمام ضرورت مند لوگوں کو کھلانے کا اہتمام کیا تھا۔ انہی دنوں ایک واقعہ یہ پیش آیا:

كان عمر بن الخطّاب يطعم الناس بالمدينة وهو يطوف عليهم بيده عصًا ـ فمرّ برجلٍ يأكل بشماله ـ فقال. يا عبد الله كُلْ بيمينك قال يا عبد الله انّها مشغولة قال فمضٰى ثم مرّ به وهو يأكل بشماله فقال يا عبد الله كل بيمينك قال يا عبد الله انّها مشغولة ـ ثلاث مرّاتٍ. قال وما شغلها؟ قال اصيبت يوم موتة ـ قال فجلس عمر عنده يبكى ـ فجعل يقول من يوضئك؟ من يغسل رأسك وثيابك؟ من تضع كذا وكذا؟ فدعا له بخادم وامرله براحلة وطعام وما يصلحه وما ينبغى له حتىٰ رفع اصحاب محمّد صلى الله عليه وسلّم اصواتهم يدعون الله لعمر ممّا راو رقّته بالرّجل واهتمامه بامر المسلمين.[1]

ترجمہ: عمر بن الخطّابؓ مدینہ میں لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے آپ ہاتھ میں لاٹھی لیے ان کے درمیان گشت کر رہے تھے اسی دوران آپ کا گذر ایک ایسے آدمی کے پاس سے ہوا جو بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا آپ نے اس سے کہا بندہ خدا دائیں ہاتھ سے کھا، اس نے جواب دیا بندہ خدا، وہ مشغول ہے آپ آگے بڑھ گئے۔ دوبارہ وہاں سے گزرے تو پھر دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے۔ آپ نے اس سے پھر کہا بندہ خدا دائیں ہاتھ سے کھا اس نے کہا بندہ خدا وہ مشغول ہے۔ اس نے تین بار یہی

---

[1] امام محمد بن الحسن الشیبانی، کتاب الآثار۔ باب فضائل الصحابہ

جواب دیا۔
آپ نے پوچھا کہ کس کام میں مشغول ہے؟ اس نے جواب دیا (کہ داہنا ہاتھ) مُوتہ کی لڑائی میں کام آگیا۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سُن کر عمر اس کے پاس بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ اس سے پوچھنے لگے کہ تمہیں وضو کون کراتا ہے؟ تمہارا سر کون دھوتا ہے؟ کپڑے کون دھوتا ہے؟ فلاں اور فلاں کام کون کرتا ہے؟ پھر آپ نے اس کے لیے ایک ملازم منگوایا اور اسے ایک سواری دلوائی اور دوسرے سامان ضرورت بھی دلوائے۔ یہاں تک کہ اس آدمی کے ساتھ آپ کا انتہائی مشفقانہ سلوک اور مسلمانوں کی بہبود کے لیے حضرت عمرؓ کا یہ اہتمام دیکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بلند آواز سے عمرؓ کے لیے اللہ سے دُعائیں کرنے لگے۔

غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم کی جن بنیادی ضروریات کی تکمیل کو ہم نے اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دیا ہے اُن کے سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کی وہ کم سے کم مقداریں کیا ہیں جن کی فراہمی اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ضروری سمجھی جائے گی۔ اس کا اصولی جواب یہ ہے کہ غذا، لباس اور مکان کی ضرورتیں کم سے کم اس حد تک پُوری کی جانی چاہئیں کہ بھوک پیاس، سردی یا گرمی کی شدت اور بارش وغیرہ کے نتیجہ میں فرد کی جان جانے کا اندیشہ نہ باقی رہے اور اس کے اندر اتنی طاقت بحال رہے کہ وہ کسبِ معاش کی جدوجہد کر سکے۔ اس اصولی بات سے آگے بڑھ کر اشیاء کی کیفیت یا کمیت کے بارے میں کوئی صراحت کرنا دشوار ہے ان کی تعیین احوال وظروف پر مبنی ہوگی۔ جہاں تک مریض کے علاج کا تعلق ہے ایسا انتظام کیا جانا چاہیے کہ محروم افراد کی ملک کی عام معاشی سطح کے مطابق ضروری طبی خدمات اور دوائیں مفت حاصل کر سکیں تعلیم کم از کم اتنی ہونی چاہیے کہ ہر فرد لکھنا اور پڑھنا سیکھ لے۔ قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت، جاہلیت اور اسلام کے درمیان تمیز کی صلاحیت عبادت کے طریقوں اور عام معاملات زندگی میں اسلامی حدود سے آگاہی ابتدائی اسلامی تعلیم کے لازمی معیار میں شامل ہیں۔

معاشی تعمیر و ترقی

کفالتِ عامہ کی طرح ملک کی معاشی تعمیر و ترقی بھی ایک اجتماعی فریضہ ہے اگر کفالتِ عامہ سے افراد کی ضروریات کی تکمیل اور قیامِ حیات وابستہ ہے تو معاشی تعمیر و ترقی سے پورے اجتماع کا قیام و بقاء اس کی قوت کا استحکام اور اس کے جملہ دُنیاوی مصالح وابستہ ہیں جن کا تحفظ ریاست کو وجود میں لانے کا ایک اہم سبب ہے یہ ذمہ داری اگرچہ افراد پر ان کی انفرادی حیثیتوں میں بھی عائد ہوتی ہے لیکن اجتماع کے نمائندہ صاحبِ اقتدار ادارہ ریاست پر اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔

کسی مُلک کی معاشی تعمیر و ترقی اس ملک کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط ہے۔ آج کل دفاعی قوت براہ راست صنعتی ترقی سے وابستہ ہے محفوظ دفاعی پالیسی کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ مُلک اہم دفاعی سامانوں کے لیے دوسرے ممالک بالخصوص کسی دوسرے تہذیبی بلاک سے تعلق رکھنے والے ممالک کا محتاج نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جدید آلاتِ حرب اور دفاعی سامان کسی مُلک میں اُسی وقت تیار کئے جا سکتے ہیں جب وہ صنعتی ترقی کے ایک اونچے معیار پر پہنچ چکا ہو۔ یہ بات محتاجِ دلیل نہیں کہ قرآن و سُنت میں دارالاسلام کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کے استحکام پر بہت زور دیا گیا ہے اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ [1]

اور اُن (دشمنوں) کے لیے جتنی قوّت تم سے ممکن ہو سکے فراہم کر رکھو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کی مختلف فوجی تیاریوں، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی مشق اور اسلحہ اور گھوڑے فراہم کر رکھنے پر صحابہ کرام کو برابر ابھارتے رہتے تھے۔ آج کی فوجی تیاریاں اور قوت کے ذرائع مختلف ہیں۔ آج اسی حکم اور انہی ارشاداتِ نبوی کا

---

[1] سورۃ انفال: ۶۰

منشا یہ ہے کہ زمانے کے معیار کے مطابق فوجی تیاریاں کی جائیں اور دفاعی قوت پیدا کی جائے چونکہ یہ مقصد صنعتی ترقی اور فولاد، ایٹمی توانائی اور بجلی کی طاقت جیسی بنیادی صنعتوں کے فروغ کے بغیر نہیں حاصل کیا جا سکتا اس لیے ان چیزوں کا اہتمام بھی لازم قرار پائے گا کسی شرعی فریضہ کی ادائیگی اگر کسی دوسرے کام پر موقوف ہو تو وہ کام بھی فرض ہو جاتا ہے جس کی تصریح حسب ذیل ہے۔

اتّفق اصحابنا والمعتزلة علی ان مالا یتمّ الواجب الا بہٖ وھو مقدورٌ للمکلّف فھو واجبٌ[1]

ترجمہ: ہمارے رفقاء اور معتزلہ سب اس اصول پر متفق ہیں کہ جس چیز کے بغیر واجب کی پوری تعمیل ممکن نہ ہو اور وہ چیز مکلّف کے بس میں ہو تو وہ چیز واجب ہے۔

معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام فقر و فاقہ کے انسداد اور کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کو بخوبی ادا کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ قومی پیداوار میں اضافہ کی مؤثر تدابیر نہ اختیار کی جائیں تو صرف موجودہ دولت کی از سرِ نو تقسیم کے ذریعے ملک کے ہر فرد کو ایک معقول معیارِ زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس نکتہ پر غور کرتے وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ آج مسلمان ممالک جن میں اسلامی حکومت کے قیام کا امکان ہے۔ معاشی طور پر پسماندہ اور کم ترقی یافتہ ہیں ان کی قومی پیداوار کی موجودہ سطح ان کی بڑھتی ہوئی آبادیوں کے لیے ناکافی ہے اور وہ صرف یہ طریقہ اختیار کر کے کفالتِ عامہ کی ذمہ داری نہیں ادا کر سکتے کہ مالدار لوگوں سے ان کی دولت کا ایک حصّہ لے کر اہل حاجت کے درمیان تقسیم کر دیں۔

دورِ جدید میں ایک اسلامی حکومت اپنی تہذیبی انفرادیت کو بھی اسی وقت برقرار رکھ سکتی ہے جب وہ صنعتی طور پر غیر مسلم دنیا سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جائے اور کم از کم ضروری سامانِ زندگی کے لیے ان ممالک کی محتاج نہ ہو۔ جو ممالک صنعتی طور پر دوسرے

---

[1] الآمدی: الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۱ ص۱۵۶

ملکوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں وہ تہذیبی طور پر بھی اُن کا اثر قبول کرنے لگتے ہیں۔ آج اسلامی ممالک کی صنعتی پسماندگی اور مغرب کی محتاجی ان پر مغربی تہذیب کے اثر اور مغربی غلبہ واستیلاء کا ایک اہم سبب ہے۔

قرنِ اول کی اسلامی ریاست نے موقع پڑنے پر غیر مسلم دنیا کی تالیفِ قلب کے لیے اس کو مالی اور مادی امداد بھی دی ہے کیونکہ تالیفِ قلب اسلام کے داعیانہ پروگرام کا ایک مستقل جزو ہے اس طرح کے متعدد انفرادی عطیوں کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے اہلِ مکہ کو قحط کے زمانے میں نقد اور ضروری اجناس بھیج کر مدد کی تھی۔ آج جب کہ تہذیبی کشمکش اور نظریاتی جنگ میں بیرونی امداد اور بین الاقوامی معاشی تعاون کو ایک اہم مقام حاصل ہو چکا ہے ایک اسلامی حکومت کے پاس اتنے وسائل ہونے چاہییں کہ وہ اپنی دعوت کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر ان ذرائع کو استعمال کر سکے یہ اُسی وقت ممکن ہے جب دارالاسلام معاشی طور پر ترقی یافتہ ہو۔

ان دلائل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام کرے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضورؐ نے صاحبِ امر کو مسلمانوں کے ساتھ ہر ممکن خیر خواہی کرنے کا حکم دیا ہے اس خیر خواہی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ریاست ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کے لیے مناسب اقدام کرے۔

قرآن مجید کی سورت ہود آیت ۶۱ میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا کی تفسیر میں جلیل القدر حنفی امام علامہ ابوبکر جصاصؒ نے لکھا ہے:

وفیه الدلالة علی وجوب العمارة للزراعة والغراس والابنية[1]

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ زمین کا آباد کرنا، کھیتی، باغبانی اور تعمیر کے ذریعے سے واجب ہے۔

---

[1] جصّاص: احکام القرآن جلد ۳ ص ۱۶۵

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ایک حدیث قدسی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی خوشحالی کا اہتمام اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اثر منقول ہے جس میں وہ اپنے پروردگار عزّوجل کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:

عمّروا بلادی فعاش فیھا عبادی [1]

(انہوں نے) میرے ملکوں کو آباد کیا تو اس میں میرے بندوں نے زندگی بسر کی۔

اسی بنا پر اسلامی مفکرین نے ملک کی خوشحالی کے اہتمام کو اسلامی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ ماوردی نے امام کے فرائض گناتے ہوئے لکھا ہے کہ:

والّذی یلزم سلطان الامّة سبعة اشیاء .... والثالث عمارة البلدان باعتماد مصالحھا وتھذیب سبلھا ومسالکھا [2]

ترجمہ: امت کے حکمران پر سات ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں .... ان میں سے تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ ممالک کے جملہ مصالح کے تحفظ اور اس کی شاہراہوں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کو بہتر بنا کر ان ممالک کو آباد رکھے۔

امام ماوردی نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ملک کو آباد و خوشحال رکھنے کی قدر و قیمت کیا تھی۔

قال ابوھریرة سُبّت العجم بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فنھی عن ذالك وقال لاتسبّوھا فانھا عمّرت بلاد اللہ تعالیٰ فعاش فیھا عباد اللہ تعالیٰ [3]

ابوہریرہ رضؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اہل عجم کو بُرا کہا گیا تو آپ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا ان کو بُرا نہ کہو کیونکہ ان لوگوں

---

[1] سرخسی: المبسوط جلد ۲۳ ص ۱۵

[2] الماوردی: ادب الدین والدنیا ص ۸۲

[3] بخاری: الادب المفرد ص ۷

نے اللہ کے ملکوں کو آباد اور خوشحال بنایا تو ان میں اللہ کے بندوں نے زندگی گذاری۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم رعایا کی خوشحالی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی فرماتے تھے :

عن جابرؓ انّہ سمع النبّی صلی اللہ علیہ وسلّم علی المنبر نظر نحو الیمن فقال اللّھُمّ اقبل بقلوبھم۔ ونظر نحو العراق فقال مثل ذالک ونظر نحو کل افق فقال مثل ذالک وقال اللّھُمّ ارزقنا من تراث الارض وبارک لنا فی مدّنا وصاعنا [1]

ترجمہ : حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سُنا ۔ آپ نے یمن کی طرف نظر اُٹھائی اور فرمایا یا اللہ ان کے دل (اسلام کی طرف) مائل کر دے ۔ آپ نے عراق کی طرف دیکھا اور یہی فرمایا پھر آپ نے ہر چہار طرف دیکھا اور یہی جملہ دہرایا اور فرمایا اے اللہ ہمیں زمین کی وراثت عطا فرما اور ہمارے مُدّ اور صاع میں برکت دے ۔

عن ابی ھریرۃ انّہٗ قال : کان النّاس اذا راؤا اول الثمر جاءوا بہ الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذا اخذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : اللّھمّ بارک لنا فی ثمرنا وبارک لنا فی مدینتنا وبارک لنا فی مُدّنا اللّھمّ ان ابراھیم عبدک وخلیلک ونبیک وانّی عبدک ونبیک وانہٗ دعاک لمکّۃ وانیّ ادعوک للمدینۃ بمثل مادعاک بہ لمکّۃ ومثلہ معہ ثُمّ یدعو اصغر ولیدٍ یراہ فیعطیہ ذالک الثمر [2]

---

[1] بخاری : الادب المفرد ص۸۷۔ مدّ اور صاع غلہ اور کھجور وغیرہ ناپنے کے پیمانے ہیں۔
[2] مؤطا امام مالک : کتاب الجامع ۔ باب الدعاء للمدینۃ واھلھا۔

ترجمہ: ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا لوگ جب درختوں پر پہلے پہل پھل آتے دیکھتے تو ان پھلوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آتے تھے جب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیتے تھے تو یہ فرماتے تھے کہ اے اللہ ہمارے پھلوں میں برکت دے ہمارے شہر (مدینہ) میں برکت دے اور ہمارے صاع میں برکت دے اور ہمارے مُدّ میں برکت دے۔ اے اللہ ابراہیم تیرے بندے اور دوست اور نبی ہیں اور انھوں نے تجھ سے مکہ کے بارے میں دُعا کی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے وہی دعا کرتا ہوں جو انہوں نے تجھ سے مکہ کے لیے کی تھی اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور (مانگتا ہوں) پھر آپ اس سب سے چھوٹے بچے کو بلاتے جس پر آپ کی نگاہ پڑتی اور اسے وہ پھل دے دیتے۔"

اسلامی حکومت دنیاوی اغراض کے لیے جنگ نہیں کرتی لیکن اگر دین کی راہ میں جہاد کرنا پڑے تو اس سے مسلمانوں کو معاشی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ جنگ بدر کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے جو دُعا کی تھی اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کی معاشی فلاح مطلوب تھی اور اس کے لیے آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی فرماتے تھے:

عن عبد الله بن عمرو انّ رسول الله صلی الله علیه وسلم خرج یوم بدرٍ فی ثلاث مائة وخمسة عشر فقال رسول الله صلی الله علیه وسلّم: اللّهمّ انّهم حفاةٌ فاحملهم۔ اللّهمّ انّهم عراةٌ فاکسهم۔ اللّهمّ انّهم جیاعٌ فاشبعهم۔ ففتح الله یوم بدرٍ فانقلبوا حین انقلبوا وما منهم رجلٌ الّا وقد رجع بجملٍ اوجملین واکتسوا وشبعوا۔[1]

---

[1] ابوداؤد: کتاب الجهاد۔ باب فی النفل للسریة تخرج مع العسکر۔

ترجمہ: عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے موقع پر تین سو پندرہ مجاہدین کے ساتھ (جنگ کے لیے) نکلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "اے اللہ یہ لوگ پیدل ہیں انہیں سواریاں عطا کر، اے اللہ یہ لوگ ننگے ہیں ان کو کپڑے پہنا اے اللہ یہ لوگ بھوکے ہیں ان کے پیٹ بھر دے" چنانچہ اللہ نے بدر کی جنگ میں فتح عطا کی اور جب یہ لوگ واپس لوٹے تو ہر آدمی اپنے ساتھ ایک یا دو اونٹ لے کر لوٹا اور ان کو پہننے کے لیے کپڑے مل گئے اور یہ شکم سیر ہو گئے"۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق میں جہاد پر جانے والے مسلمانوں سے یہ فرمایا تھا کہ:

استقبلوا جهاد قومٍ قد حَوَوْا من فنون العيش۔ لعل الله ان يورثكم بقسطكم من ذالك فتعيشوا مع من عاش من النّاس [1]

ترجمہ: "جاؤ ایک ایسی قوم سے جہاد کے لیے جو امورِ معاش پر حاوی اور ترقی یافتہ ہے۔ توقع ہے کہ اللہ تمہیں اس میں سے تمہارا حصہ عطا کرے گا اور تم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ (خوشحال) زندگی گزار سکو گے"۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ملک کو خوشحال رکھنے اور ترقی دینے کا بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ زرعی معیشت میں سب سے زیادہ اہمیت آبپاشی کے لیے نہروں کی تعمیر کو حاصل ہے۔ تجارت کے فروغ کے لیے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور بہتر ذرائع نقل و حمل کی فراہمی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسلامی مملکت کے مختلف صوبوں میں متعدد نہریں کھدوائیں۔ نہروں کی تعمیر کے علاوہ حسبِ ضرورت سیلاب کی روک تھام کے لیے بند بھی تعمیر کرائے۔ ریاست کے زیرِ اہتمام متعدد بڑے بڑے شہر بسائے گئے۔ قرنِ اوّل

---

[1] طبری: صفحہ ۲۱۸۸ (حوادث ۱۳ھ)

کی معیشت زراعت اور تجارت پر مبنی تھی ایک زرعی اور تجارتی معیشت کے لیے نہروں کی تعمیر، سیلاب کی روک تھام، سڑکوں کی تعمیر اور منصوبہ بندی کے ساتھ مرکزی شہروں کی آبادکاری معاشی تعمیر و ترقی کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

حضرت عمرؓ مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضا سمجھتے تھے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مال دیا جائے اور انہیں مشورہ دیتے تھے کہ جو مال فوری ضروریات سے فاضل ہو اسے نفع آور کاروبار میں لگائیں تاکہ وہ آئندہ مستقل آمدنی کا ذریعہ بنے۔ صاحبِ فتوح البلدان نے آپؓ کے طرزِ عمل کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

انّما ھو حقّھم وانا اسعد بادائہ الیھم۔ لوکان من مال الخطاب ما اعطیتموہ ولکن قد علمتُ انّ فیہ فضلاً۔ فلو انہ اذا اخرج عطاء احدِ ھٰؤلاء ابتاع منہ غنمًا فجعلھا بسوادھم فاذا خرج عطاء ثانیۃٍ ابتاع الرّاس والرأسین فجعلہ فیھا فان بقی احدٌ من ولدہ کان لھم شیءٌ قد اعتقدوہ فانّی لا ادری ما یکون بعدی۔ وانیّ لاعُمّ بنصیحتی من طوّقنی اللّٰہ بامرہٖ فان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: من مات غاشًّا لرعیتہٖ لم یجد رائحۃ الجنّۃ[1]

ترجمہ: یہ ان کا حق ہے میں اسے انہیں دے کر اپنا بھلا کر رہا ہوں اگر یہ (میرے باپ) خطاب کا مال ہوتا تو تمہیں نہ دیا جاتا۔ البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ یہ مال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر لوگ ایسا کرتے کہ جب کسی کو وظیفہ ملے تو اس میں سے کچھ بھیڑ بکریاں خرید کر اپنے علاقے میں چھوڑ دیں پھر جب دوسرے سال کا وظیفہ ملے تو ایک یا دو غلام خرید کر ان کو بھی اسی (علاقہ) میں (کام پر) لگا دے اگر ان کی اولاد میں سے کوئی باقی رہا تو اطرح

---

[1] بلاذری: فتوح البلدان ص ۴۳۹

اس کے لیے ایک قابل اعتماد سہارا فراہم ہو جائے گا۔ کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوگا میں تو ان لوگوں کے ساتھ پوری خیر خواہی برتتا ہوں جن کے امور کا اللہ نے مجھے نگران بنا دیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اپنی رعیت کے ساتھ بدخواہی اور خیانت کرتا ہوا مرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

دوسرے خلیفہ راشد کے ان آثار سے یہ بات واضح ہے کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر معاشی ترقی کے لیے اقدام مفید اور مطلوب ہے اسلامی ریاست کو ایسے اقدامات کی نہ صرف ہمت افزائی کرنی چاہیے بلکہ ان پر ابھارنا چاہیے مزید یہ کہ حضورؐ نے مسلمان حکمرانوں کو عامۃ المسلمین کے ساتھ جس خیر خواہی کی تاکید کی ہے اس کا تصوّر کتنا وسیع ہے اگر صاحب امر رعایا کی مادی فلاح و بہبود کے اہتمام میں کوئی کسر اٹھا رکھے تو عمر فاروقؓ کے نزدیک یہ بھی خیانت ہوگی اور ایسا کرنے والا حکمران آخرت میں جنت سے محرومی کا خطرہ مول لے گا۔

خلفاء راشدین مختلف علاقوں کے نرخ معلوم کرتے رہتے تھے اور جب انھیں یہ خبر ملتی تھی کہ نرخ ارزاں ہیں تو اطمینان کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کو بھی رعایا کی خوشحالی سے بڑی دلچسپی تھی۔ دُور دراز سے ڈاک لے کر آنے والوں سے دریافت فرماتے تھے کہ کیا تم نے لوگوں کو شادی کی محفلیں اور دعوتیں منعقد کرتے دیکھا ہے جس سے آپ کا مطلب ان کی خوشحالی کا اندازہ کرنا ہوتا ہے۔

دورِ جدید کے حالات میں اس رجحان کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کو ملک کے قدرتی وسائل سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی کی تمام ممکن تدابیر اختیار کرنی چاہیں۔ افراد کو ترقیاتی کاموں کی ترغیب دینے اور اس سلسلہ میں نجی کاروبار کرنے والوں کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کے علاوہ ریاست کو اس کام میں براہِ راست بھی حصّہ لینا چاہیے۔ ذرائع نقل وحمل کی توسیع زراعت کی ترقی کے لیے موزوں اقدامات، معدنی وسائل کو ترقی دے کر کام میں لانا، دریاؤں کے پانی سے بجلی کی طاقت حاصل کرنا اور آبپاشی کے لیے نہریں تعمیر کرنا اور صنعتی ترقی کے لیے مثبت قدم اٹھانا دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست کے پروگرام

میں اسی طرح شامل ہونا چاہیے جس طرح ابتدائی اسلامی ریاستوں کے پروگرام میں زرعی ترقی کا اہتمام شامل تھا۔

تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانیوالے تفاوت کو کم کرنا

قرآن و حدیث اور خلافت راشدہ کے نظائر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں تقسیم دولت کے اندر جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ کم ہو اور دولت کسی ایک طبقہ کے اندر جمع ہو کر نہ رہ جائے۔ اسی لیے اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کر دی گئی تھی کہ دولت مند افراد کے مال میں محروم اور ضرورت سے مجبور ہو کر سوال کرنے والوں کا بھی حصّہ ہے۔ قرآن مجید کا پیغام یہ ہے:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ [1]

اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا بھی حق ہے۔

پھر مدنی دور میں جب یہودی قبیلہ بنو نضیر کو ان کی بدعہدی اور اسلام دشمنی کی بنا پر جلاوطن کیا گیا اور ان سے حاصل ہونے والے اموال کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ حکم دیا کہ یہ اموال ضرورت مندوں کے لیے ہیں اس کی مصلحت یہ تھی کہ سماج کے اندر مال و دولت اہل ثروت کے درمیان مرکوز نہ ہو۔

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ [2]

ترجمہ: ان آبادیوں کے جن اموال کو اللہ نے اپنے رسول کو عطا کیا ہے وہ اللہ، اس کے رسول، اور رسول کے قرابت داروں نیز یتامیٰ، مساکین اور مسافروں

---

[1] سورۃ الذٰریٰت - ۱۹

[2] سورۃ الحشر - ۷

کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت تمہارے صاحبِ ثروت لوگوں ہی کے درمیان چکر کھاتی رہ جائے "۔

یہ آیت مبارکہ قطعی طور پر ثابت کرتی ہے کہ مال و دولت کو دولت مندوں کے درمیان گردش کرتے رہ جانے سے روکنا اسلامی پالیسی کا اہم مقصد ہے۔ حضورؐ کے دورِ مبارکہ میں تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا مقصد اسلامی ریاست نے تین طریقوں سے حاصل کیا۔ زکوٰۃ و عُشر کے ذریعے دولت مندوں کے مال کا ایک حصّہ غریبوں کی طرف منتقل کیا جاتا رہا۔ فئے کے مال کو غریبوں کے درمیان بانٹا گیا اور صاحبِ ثروت لوگوں کو ترغیب و تلقین کے ذریعے اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اہلِ حاجت افراد کی مالی اعانت کریں۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے اور فئے کا مال آیا تو آپ نے اسے عوام کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا اور چھوٹے بڑے، آزاد غلام، مرد اور عورت سب کو برابر حصّہ دیا۔ جب کہ بعض لوگوں نے آپؓ سے یہ کہا کہ خدمتِ اسلام اور اسلام لانے میں سبقت کی بنا پر بعض افراد کو بعض سے زیادہ حصّہ دینا چاہیے تو آپ نے یہ جواب دیا۔

اما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل فما اعرفنی بذلك وانّما ذالك شیءٌ ثوابه علی الله جلّ ثنائهٗ وهذا معاشٌ فالاسوة فیه خیرٌ من الأُثرة [1]

ترجمہ: تم نے جو سابقیت، اوّلیّت اور فضیلت کا ذکر کیا ہے تو میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں لیکن یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا ثواب اللہ جل ثناء کے ذمہ ہے مگر یہ معاملہ معاش کا ہے اس میں مساوات کا برتاؤ ترجیحی سلوک سے بہتر ہے۔

ایک دوسری روایت میں یوں ہے:

---

[1] ابویوسف: کتاب الخراج ص۵

انّ ابا بکرٍ کُلّم فی ان یُفضِّل بین النّاس فی القسم فقال فضائلھم عند اللہ فامّا ھذا المعاش فالتسویۃ فیہ خیرٌ لہ

ترجمہ: ابوبکرؓ سے کہا گیا کہ وہ (فیٔ) کی تقسیم میں بعض لوگوں کو بعض پر ترجیح دیں تو آپ نے فرمایا۔ ان کے فضائل کا اعتبار اللہ کے یہاں ہوگا جہاں تک اس معاشی زندگی کا سوال ہے اس میں برابر سلوک کرنا بہتر ہے۔

خلیفہ اول کا یہ ارشاد اگرچہ فیٔ کی تقسیم سے متعلق ہے لیکن آخری جملہ میں آپ نے ایک اصولی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے جس سے اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا رجحان اخذ کیا جا سکتا ہے یعنی وسائل معاش کی تقسیم میں تفاوت کے بجائے مساوات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کے باقی دو طریقے جو عہد نبوی میں اختیار کیے گئے تھے عہد صدیقی میں بھی نافذ رہے۔ جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو ریاست نے ان کے خلاف فوجی کارروائی کرکے ان کو اس حق کی ادائیگی پر مجبور کیا۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اس اصول کے مطابق عمل کی اہم ترین وہ پالیسی ہے جو عراق وشام کی مفتوحہ زمینوں کو فوجیوں کے درمیان تقسیم نہ کرنے کے فیصلہ کا باعث بنی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ بعض صحابہ کے اس مشورہ کی طرف مائل ہو گئے تھے کہ یہ زمینیں فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دی جائیں لیکن بعد میں جب آپ کی توجہ اس طریقے کے بُرے نتائج کی طرف مبذول کرائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو آیات فیٔ (سورۃ حشر ۶ تا ۱۰) کا ایسا فہم عطا کیا کہ آپ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور زمینوں کو سارے مسلمانوں کی ملکیت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

قدم عمر الجابیۃ فاراد قسم الارض بین المسلمین فقال معاذ واللہ اذن لیکوننّ ماتکرہ۔ انکَ ان قسّمتھا صار الریع العظیم فی ایدی القوم، ثمّ یبیدون فیصیر ذالک الی الرّجل الواحد او المرأۃ۔ ثم یأتی من بعدھم قوم یسدّون

من الاسلام سدًّا وهم لا یجدون شیئًا ۔ فانظرا مرًّا یسع اوّلهم و اٰخرهم ۔

قال هشّام وحدّثنی الولید بن مسلم عن تمیم بن عطیة عن عبد اللّٰه بن ابی قیس او ابن قیس، انه سمع عمر یکلّم الناس فی قسم الارض ۔ ثمّ ذکر قول معاذ ایاه ۔ قال فصار عمر الی قول معاذ[1]

ترجمہ : عمرؓ جابیہ آئے تو انہوں نے زمین کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا ارادہ فرمایا ۔ معاذؓ نے آپ سے کہا خدا کی قسم پھر تو وہی ہوگا جو آپ کو ناپسند ہے اگر آپ نے ان زمینوں کو تقسیم کر دیا تو بڑے بڑے علاقے ان لوگوں کو مل جائیں گے پھر یہ مر جائیں گے تو یہ زمینیں (وراثت کے ذریعے) کسی ایک آدمی یا عورت کے ہاتھ میں آجائیں گی ۔ پھر ان کے بعد دوسرے لوگ آئیں گے جو اسلام کا دفاع کریں گے مگر ان کو کچھ نہ مل سکے گا ۔ آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیے جو آج کے مسلمانوں کے لیے بھی موزوں ہو اور بعد میں آنے والوں کے لیے بھی مفید ہو ۔

(حدیث کے راوی) ہشام نے کہا مجھ سے ولید بن مسلم نے بروایت تمیم بن عطیہ بروایت عبد اللہ بن ابی قیس یا ابن قیس حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے عمرؓ کو زمین کی تقسیم کے بارے میں لوگوں سے گفتگو کرتے سنا ۔ پھر راوی نے اس بات کا ذکر کیا جو معاذ نے عمرؓ سے کہی ۔ راوی کہتا ہے کہ پھر عمرؓ نے معاذ کی بات مان لی ۔"

قاضی ابو یوسفؒ اس واقعہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ایک قانونی کلیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

---

[1] ابو یوسف : کتاب الخراج ص۲۷

والذی رای عمر رضی اللہ عنہ من الامتناع من قسمة الارضین بین من افتتحها عند ما عرفه الله ما کان فی کتابه من بیان ذالك توفیقاً من الله کان له فیما صنع وفیه کانت الخیرة لجمیع المسلمین وفیما راٰه من جمع خراج وقسمة بین المسلمین عموم النفع لجماعتهم لان هذا لو لم یکن موقوفا علی الناس فی الاعطیات والارزاق لم تشحن الثغور ولم تقوا الجیوش علی السیر فی الجهاد ولما امن رجوع اهل الکفر الی مدنهم اذا خلت من المقاتلة والمرتزقة لہ

ترجمہ: حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ آپ نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان زمین تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی تائید میں قرآن حکیم سے دلائل پیش کئے یہ سب کچھ محض اللہ کی توفیق کا نتیجہ تھا اور اللہ کی کتاب پر بصیرت حاصل ہونے کی بنا پر تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس حقیقت کو حضرت عمرؓ کی نگاہ نے پالیا تھا دراصل اسی میں جماعتی لحاظ سے تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ لگان کی آمدنی کو ایک جگہ کر کے عام ضروریات پر خرچ کرنا یہ اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ زمین کو چند لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور وہی اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر لگان کی آمدنی عام لوگوں کی تنخواہوں اور وظیفوں کے لیے وقف نہ ہوتی تو سرحدوں کی حفاظت اور فوجیوں کی کفالت کس مال سے کی جاتی اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی ملک اس قسم کے انتظامات کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔"

فیٔ کے مال کی تقسیم کے بارے میں ابتداً عمرؓ نے بھی مساوی تقسیم کی اسی پالیسی پر عمل

لہ ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۲۷

کیا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اختیار کی تھی لیکن جب عراق و شام کی فتح سے بہت سا مال خمس اور فیٔ کے طور پر حاصل ہوا تو آپ نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی۔ آپ نے اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں اور اسلام کی نمایاں خدمت انجام دینے والوں کو عام افراد سے زیادہ حصے دیے۔ جن افراد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں طرح طرح کے مصائب برداشت کئے تھے۔ اسلام کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی تھی اور مدینہ کے ابتدائی دور میں آپؐ کے ساتھ مل کر کفار کے ساتھ جنگیں کی تھیں ان کو آپ نے بعد میں ایمان لانے والوں سے زیادہ حصہ کا مستحق قرار دیا۔ تقسیم فیٔ میں مساوی سلوک کی جگہ ترجیحی سلوک کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ جن لوگوں نے اسلام میں داخل ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگیں لڑی تھیں۔ ان کو ان لوگوں کے برابر حصے دیے جائیں جنہوں نے ابتدا ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ کفار سے جنگ کی تھی۔

قال : لا اجعل من قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمن قاتل معہ [۱]

ترجمہ "فرمایا۔ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تھی ان کو میں (تقسیم فیٔ میں) ان کے برابر نہیں کر سکتا جنہوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگ کی تھی"۔

اس نئے طریقِ کار کے حق میں جو سیاسی، معاشرتی اور دینی دلائل دیے جا سکتے ہیں وہ واضح ہیں لیکن معاشی طور پر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سماج کے اندر تقسیمِ دولت میں مزید ناہمواری پیدا ہو۔ چنانچہ آٹھ سال تک اس پالیسی پر عمل کے بعد اپنے دورِ خلافت کے آخری سال میں حضرت عمرؓ نے اپنی رائے پھر تبدیل کی اور آئندہ تقسیم فیٔ میں مساوات برتنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

حدّثنا عبد الرحمٰن بن مھدی عن ھشّام بن سعد عن زید بن اسلم عن ابیہ قال : سمعت عمرؓ یقول لئن عشتُ

---

[۱] ابو یوسف : کتاب الخراج ص ۵۰

الیٰ ھذا العام المقبل لَاُلْحِقَنَّ اٰخر النّاس باوّلھم حتی یکونو ابباناً واحداً (قال عبد الرحمٰن بَبّاناً واحداً شیئاً واحداً) [1]

ترجمہ: ہم سے عبد الرحمٰن بن مہدی نے انہوں نے ہشام بن سعد سے انھوں نے زید بن اسلم سے اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے عمرؓ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اگر میں آئندہ سال اس موقع تک زندہ رہا تو (تقسیم فے میں) آخر کے لوگوں کو سرِ فہرست لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سب مساوی ہو جائیں (عبد الرحمٰن نے کہا ہے: ببّاناً واحداً کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی جیسے ہو جائیں۔

اسی مفہوم کو ابنِ سعد نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

سمعت عمر بن الخطّاب یقول: واللّٰہ لئن بقیت الی ھٰذا العام المقبل لاُلحقنّ اٰخر النّاس باوّلھم ولاجعلنھم رجلاً واحداً [2]

ترجمہ: "میں نے عمر بن الخطّاب کو یہ کہتے سُنا ہے کہ خدا کی قسم اگر میں اگلے سال اس موقع پر زندہ رہا تو (فے کے رجسٹر میں درج) آخر کے لوگوں کو پہلے لوگوں سے ملا دوں گا اور ان سب کو ایک آدمی جیسا کر دوں گا۔"

عن زید بن اسلم عن ابیہ انّہ سمع عمر بن الخطّاب یقول: لئن بقیت الی الحول لالحقنّ اسفل النّاس باعلاھم [3]

ترجمہ: زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عمر بن

---

[1] ابوعبید: کتاب الاموال ص ۲۶۳-۲۶۴

[2] محمد ابنِ سعد: الطبقات الکبریٰ جلد ۳ ص ۳۰۱

[3] ایضاً

الخطاب کو یہ کہتے سُنا ہے کہ : اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو (فئ میں حصے کے اعتبار سے) سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے اوپر کے لوگوں کے مساوی کر دوں گا۔"

کتاب الخراج کی روایت سب سے زیادہ واضح ہے:

ولما رأى المال قد كثر قال لئن عشت الى هٰذه الليلة من قابلٍ لألحقنّ اٰخر النّاس باولاهم حتّٰى يكونوا فى العطاء سواءً - قال فتوفّى رحمه الله قبل ذالك[1]

ترجمہ : (راوی کہتا ہے کہ) جب آپ نے یہ دیکھا کہ (فئ کا) مال بہت زیادہ آنے لگا ہے تو فرمایا۔ اگر میں آئندہ سال اس شب تک زندہ رہا تو (فئ کے رجسٹر میں درج) آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سب کو برابر وظیفے ملنے لگیں۔ (راوی نے کہا کہ) آپ اس سے پہلے ہی انتقال فرما گئے اللہ آپ پر رحم فرمائے۔"

ان نظائر سے یہ بات بالکل ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے تقسیم فئ میں عدم مساوات برتنے کی پالیسی سے رجوع کر کے مساوات برتنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہ واضح نہ ہو سکا کہ آپ نے یہ فیصلہ کس وجہ سے کیا تھا کتاب الخراج کی مذکورہ بالا روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مال فئ کی کثرت اس فیصلہ کا سبب بنی تھی لیکن یہ توجیہ کافی نظر نہیں آتی۔ سابقین اولین اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کا امتیاز برقرار رکھنے کا جو مقصد حضرت عمرؓ کے پیشِ نظر تھا وہ اسی وقت پورا ہو سکتا تھا جب مال فئ کی کثرت کے باوجود ان افراد کے حصے دوسرے افراد سے زیادہ ہوتے۔ صرف مال فئ کی کثرت اس بات کے لیے کافی وجہ نہیں بن سکتی کہ ان کے امتیازی مقام کو نظر انداز کر دیا جائے یہ بھی ممکن تھا کہ سب کے حصوں میں اضافہ کر دیا جاتا اور ممتاز لوگوں کو پھر بھی عام افراد سے زیادہ حصّے ملتے۔

---

[1] ابویوسف : کتاب الخراج ص ۵۵

ــــ مساوی تقسیم کے اس نئے فیصلہ کے لیے ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ایسی مصلحت آ گئی ہو جس کو وہ ان مصالح پر ترجیح دینے لگے ہوں جو امتیازی سلوک اور غیر مساوی تقسیم کے وقت ان کے سامنے تھے۔

ہمارے نزدیک یہ نئی مصلحت ان مفاسد کے ازالہ کی ضرورت تھی جو سماج کے اندر تقسیم دولت میں بڑھتے ہوئے تفاوت سے پیدا ہو رہے تھے یا مستقبل میں پیدا ہو سکتے تھے۔ امتیازی حصے کچھ لوگوں کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مال دار بنا رہے تھے: زیادہ مالدار لوگوں کے اندر معیارِ زندگی کو حدِ اعتدال سے زیادہ بلند کرنے، جائدادیں خریدنے اور جہاد فی سبیل اللہ میں کچھ سستی کے رجحانات پیدا ہوتے دیکھ کر آپ کی بصیرت نے یہ پہچان لیا ہو گا کہ ان رجحانات کو غیر مساوی تقسیم سے مزید تقویت حاصل ہو گی۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ آٹھ سال تک امتیازی سلوک کرنے کے بعد اب آپ کے نزدیک اس طریقہ کو باقی رکھنا اتنا ضروری نہ رہ گیا ہو کیونکہ جن افراد کو آپ ممتاز کرنا چاہتے تھے ان کو اس طویل عرصہ میں خاصا موقع مل چکا تھا۔

نئے فیصلہ کے مطابق جن لوگوں کو پہلے زیادہ حصہ مل رہا تھا ان کے حصہ میں کمی نہیں ہوتی بلکہ جو لوگ پہلے کم حصہ پاتے تھے ان کے حصہ میں اتنا اضافہ پیشِ نظر تھا کہ سب کے حصے برابر ہو جائیں۔ ایسا کرنا اسی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا کہ فئے کا مال اب پہلے سے زیادہ تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا توجیہہ ہمارے نزدیک فیصلہ کے صرف اس پہلو پر منطبق ہوتی ہے۔

ایک دوسری روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ مالدار لوگوں کی فاضل دولت لے کر غریبوں کے درمیان تقسیم کر دی جائے:

عن ابی وائل قال قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقراء المهاجرین[1]

---

[1] تاریخ طبری صـ ۲۷۷۴ (حوادث ۲۳ھ) تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو المحلّیٰ لابن حزم جلد ۶ صـ ۱۵۸

ترجمہ: "ابو وائل سے مروی ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو اُمور میں پہلے طے کر چکا اگر انہیں مجھے آئندہ بھی طے کرنے کا موقع ملتا تو میں مالداروں سے ان کی فاضل دولت لے کر اُسے فقراء مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیتا"

اپنے دورِ خلافت کے آخری سال میں عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ آپ سماج میں دولت کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری سے پریشان رہنے لگے تھے اس صورت حال کی روشنی میں اپنے بعض گذشتہ فیصلوں پر نظرثانی کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور ایک راست اقدام کے ذریعے تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ روایت ہماری اس رائے کی بھی تائید کرتی ہے کہ تقسیم فئے کے بارے میں آپ کے نئے فیصلہ کی اصل گذشتہ پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ناہمواری اور بڑھتی ہوئی عدم مساوات تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عثمانؓ نے اموال فئے کی تقسیم میں مساوات کی پالیسی پر عمل نہیں کیا مزید برآں آپ نے عراق و شام کی زمینوں کو جن کا مالیہ آپ تک براہِ راست کاشتکاروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ متعینہ خراج پر درمیانی افراد کو دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ ابتدًا یہ طریقہ اسلئے اختیار کیا گیا تھا کہ ریاست کو مالیہ وصول کرنے میں سہولت ہو۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے ریاست کی آمدنی بھی بڑھ گئی تھی[1]

ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ بھی صدیق اکبرؓ کی رائے کے مؤید تھے۔

وکذالك يروى عن علي التسوية ايضاً[2]

اور اسی طرح حضرت علیؓ سے بھی مساوات ہی منقول ہے۔

لیکن حضرت علیؓ کا دورِ خلافت اضطراب کے عالم میں گذرا اور اس کے بعد اموی حکمرانوں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے۔ کتاب المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار للمقریزی جلد ۲ ص ۵۱-۵۲

[2] کتاب الاموال ص ۲۶۴

نے نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں دولت اور آمدنی کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی مالی پالیسی کے نتیجہ میں یہ تفاوت بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں کو اسلام کی اصل تعلیمات کے مطابق از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی تو معاشی نظام میں بھی متعدد اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔

ہمیں اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کا صحیح مفہوم وہ ہے جو خلافت راشدہ کے عمل سے ہمارے سامنے آتا ہے اسلام کسی فرد پر کسب دولت کے سلسلے میں کوئی اصولی اور دائمی پابندی نہیں عائد کرتا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں ہے کہ دولت سماج کے ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔ قرآن، سنت نبوی اور خلافت راشدہ کے نظائر کی روشنی میں ہم اطمینان کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم کے اندر تفاوت کو کم کرنا اسلامی حکومت کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔

اس رائے کی مزید تائید قرآنی آیت "اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ" سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام کو معاشرہ میں عیش پرستوں اور مترفین کے طبقہ کا ظہور سخت ناپسند ہے کیونکہ معاشرہ میں عیش کوشی اور عیش پرستی کرنے والے طبقہ کا ظہور اور غلبہ اس معاشرہ کی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

معاشی پالیسی کے اس رہنما اصول کی روشنی میں دورِ جدید کی ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ظاہر ہے اس حکومت کو اس بات کی بھی فکر کرنی ہوگی کہ صدیوں کے غیر اسلامی نظام معیشت کی وجہ سے جو خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہیں ان کا بتدریج ازالہ کیا جائے۔ اصلاح حال کے لیے پہلا قدم یہ ہوگا کہ عشر و زکوٰۃ کے شرعی محاصل کو وصول کرنے اور متعینہ مدات میں صرف کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اخلاقی تربیت کے ذریعے ایک ایسی فضا پیدا کرنی ہوگی کہ اصحابِ دولت زکوٰۃ کے علاوہ بھی اپنے مال میں اہل حاجت کا حق تسلیم کریں۔ اسلام کے قانونِ وراثت کا پوری طرح نفاذ بھی اس اصول کے بعض تقاضوں کو پورا کرے گا۔ پھر سُود کی حرمت بے جا استحصال کے ایک بڑے دروازہ کو بند کر دے گی۔ ان

اقدامات کے ساتھ اس طرف بھی توجہ کی جانی چاہیے کہ غیر اسلامی زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے زمین کی ملکیت کا ایک طبقہ میں جو تمرکز وجود میں آگیا ہے۔ اس کو ختم کیا جائے پھر اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے کہ ریاست کے تعمیری اور ترقیاتی کاموں یا رفاہِ عامہ سے متعلق اُمور اور تعلیم، صحت و صفائی اور حمل و نقل کی سہولتوں کا جو انتظام ریاست کی جانب سے کیا جائے اس کے بیشتر فوائد بڑے کاروباریوں یا مال دار لوگوں ہی تک محدود نہ ہو جائیں۔ موجودہ عدم توازن کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان خدمات سے زیادہ تر فائدہ غریبوں اور کم آمدنی والے طبقوں کو پہنچے۔

موضوع زیرِ بحث میں ہم نے اسلامی حکومت کی صرف ان معاشی ذمہ داریوں کا جائزہ لیا ہے جن کی انجام وہی شریعت کی روشنی میں اس پر لازم ہے اپنے شہریوں کی فلاح وبہبود کے اہتمام کی جو جامع ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے اس کے تقاضے کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب اسلامی ریاست کے کارکن ہمیشہ اس فکر میں لگے رہیں کہ مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے کیا کام ہو سکتے ہیں اور انھیں کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے۔ دورِ جدید کی اسلامی ریاست میں اس کی ایک عملی شکل یہ ہو گی کہ منتخب نمائندوں پر مشتمل مجالس میں اس بات پر غور کیا جاتا رہے گا کہ ملک کی بھلائی کے کون سے کام حکومت کے سپرد کیے جائیں عوام کی بھلائی سے متعلق جو کام بھی باہمی مشورہ سے عمّال حکومت کے سپرد کیے جائیں وہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری میں شامل سمجھے جائیں گے۔ بنیادی ضروریات کی تکمیل، معاشی تعمیر و ترقی اور تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کی حیثیت ان شرعی وظائف کی ہے جو اسلامی ریاست پر اصولی طور پر عائد کی گئیں ہیں اور جن کو مذکورہ بالا مجالس کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر ایسے قوانین اور ضوابط کی شکل دینا ہو گا جن کا نفاذ ان ذمہ داریوں کی بتمام وکمال ادائیگی کا ضامن ہو سکے۔

بیروزگاری کے مسئلے کا اسلامی حل

پروفیسر حافظ سیّد خالد محمود ترمذی
صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ ڈگری کالج نمبر۲ ڈیرہ اسماعیل خان

بِسۡمِ اللہ ولہ الحمد وصلّی اللہ علی علیٰ خیر خلقہٖ محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم

آج کل بیروزگاری کا مسئلہ ہر ملک وملت کے لیے ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے خواہ وہ ترقی یافتہ ہے یا ترقی پذیر۔ اس کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسی کی بدولت نازی جرمنوں اور اٹلی میں فاشسٹوں نے جنم لیا جنہوں نے دنیا کو جنگِ عظیم دوم میں الجھا دیا۔ امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک اس کی زد میں ہیں جنہوں نے بیروزگاری یا گذارہ الاؤنس کے ذریعے اس کی سنگینی کو وقتی طور پر کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ مسئلے کا کوئی مستقل حل نہیں ہے۔

مختصر تاریخ

مسئلے کی قدامت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ اسلام کو بھی اپنے اوائل میں ہی اس کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ابتدا میں مکّی معاشرے کے مالی طور پر کمزور، غریب افراد اور غلاموں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا جیسا کہ سورہ عَبَس کے الفاظ شاہد ہیں اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ آپ ستم رسیدہ غلاموں کو ان کے ظالم مالکوں سے خرید کر آزاد کیا کرتے تھے۔

اسی لیے اسلام نے اپنے آغازِ کار میں ہی بیروزگاری کے سنگین مسئلے کے حل اور امداد باہمی کا بے مثال نظام قائم کرنے کی طرف روزِ اول سے بھرپور توجہ دی اور ترغیب وترہیب کے ذریعے مسلمانوں کو فقراء، یتامیٰ، مساکین اور محرومِ معاش افراد کی اعانت وامداد کے لیے آمادہ وتیار کیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسے اہلِ ثروت اور مالدار مسلمانوں کے لیے ایک لازمی فرض اور ان کے اموال پر عائد ایک واجب

الاداحق کے طور پر پیش کیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ممکن ہے اسلام کی دعوت کو اپنی ابتدا ہی میں ہی ایسا دھچکا لگتا جسے جرمن اور رومن جیسی طاقتور قومیں نہیں سہ سکیں۔ لیکن اسلام نے اس کا مستقل پائیدار اور پرامن حل نہ صرف تجویز کیا بلکہ اس پر عمل کر کے اسے رہتی دنیا تک کے لیے لازوال مثال بنا دیا اور مؤاخاۃ کی صورت میں ایسا بے نظیر نظام تشکیل دیا جو آئندہ نسلوں تک کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

یتامٰی کی قدر و منزلت

یتامٰی کی یہ عزت افزائی کیا کم ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دُرِّ یتیم کے طور پر پیدا فرمایا جیسا کہ سورۃ والضحیٰ کے الفاظ سے ظاہر ہے جو بعثت کے بعد بالکل ابتدائی ایام کی سورت ہے[۲] فرمایا:۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ. وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ. وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ. فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ. وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ. وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ.

ترجمہ:۔ کیا اسی نے آپ کو یتیم پاکر ٹھکانا نہیں دیا اور آپ کو ناواقف راہ پاکر ہدایت نہیں دی اور آپ کو تنگدست پاکر تونگر نہیں بنا دیا پس آپ یتیم پر سختی نہ کریں اور سائل کو نہ جھڑکیں اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کریں[۳] (ابن کثیر حمزۃ، عمۃ، صف ۷۱)

مسکین کو کھانا نہ کھلانے کی وعید

اسی طرح سورۃ المدثر (یہ بھی بعثت کے بعد کی اولین سورتوں میں سے ہے[۴]) کا مضمون ہے کہ اہل جنت جب مجرمین سے پوچھیں گے:

ما سلککم فی سقر۔ قالوا لم نک من المصلین ولم نک نطعم المسکین

ترجمہ:۔ تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی تو وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہ کھلاتے تھے۔[۵]

اسی دور کی ایک اور سورۃ الحاقۃ میں مجرم کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:۔

خُذُوهُ فَغُلُّوهُ. ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ. ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ. إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ. وَلَا

يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔

ترجمہ:۔ اسے پکڑلو پھر اسے طوق پہنا دو پھر اسے دوزخ میں ڈال دو پھر اسے اس زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز کی ہے جکڑ دو بے شک یہ خدائے بزرگ و برتر پر ایمان نہ رکھتا تھا اور مسکین کے کھلانے پر رغبت نہ دیتا تھا[۶]

غالباً اسی سورت کو سن کر حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنی بیوی سے وہ الفاظ کہے جنہیں ابوعبید نے اپنی کتاب الاموال میں نقل کیا ہے۔ اے ام درداء! اللہ کے ہاں ایک زنجیر ہے جسے مسلسل جہنم کی آگ میں تپایا جارہا ہے حتیٰ کہ اسے لوگوں کی گردنوں میں دیا جائے گا اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو ایمان کی توفیق دے کر اس کے نصف عذاب سے تو بچا لیا ہے باقی نصف سے بچنے کے لیے تمہیں چاہیئے کہ تم مجھے مسکین کو کھلانے کی ترغیب دیا کرو۔

سائل و محروم کا مقررہ حق

سورۃ الذاریات (جس کا زمانۂ نزول ہجرت حبشہ سے متصل ہے[۸]) میں بتایا گیا ہے کہ نیک لوگ جنت کے مستحق اس لیے ہوئے ہیں:۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔

ترجمہ:۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی میں راتوں کو کم سوتے تھے اور رات کے پچھلے پہروں میں (اللہ) سے معافی مانگتے تھے اور ان کے اموال میں سائل و محروم کا حق تھا۔[۹]

اسی طرح سورۃ المعارج (یہ بھی ہجرت حبشہ سے متصل زمانہ کی سورت ہے[۱۰]) میں جہاں آخرت کے عذاب کی شدت کو بیان کرتے ہوئے یہ ذکر ہے کہ اس دن مجرم یہ خواہش کرے گا کہ وہ عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد، بیوی، عزیز واقارب، بھائی پناہ دینے والے اور روئے زمین کے تمام لوگوں کو فدیہ میں دے دے لیکن وہ اس عذاب سے نہیں بچ سکے گا۔ وہ تو گوشت پوست کو چاٹ جانے والی بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی جو ہر اس شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری۔ مال جمع کیا اور سنبھال کر رکھا۔ اس کے بعد انسان کی فطری کمزوری کا ذکر ہے کہ انسان چھوٹے دل کا پیدا کیا گیا ہے جب اس پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو چیخ اٹھتا ہے اور جب خوشحال ہوتا ہے تو بخیل بن جاتا ہے

اس عیب سے صرف وہی لوگ بچے ہوئے ہیں ،

اَلَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۔ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ

لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۔

ترجمہ :۔ جو نمازوں کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا مقررہ حق ہے ۔[11]

سائل و محروم فقیر اور مسکین کی تعریف

یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا بیروزگار سائل و محروم فقیر اور مسکین کے ذیل میں آتے ہیں کیونکہ ہمارے مروجہ نظریات سائل و محروم اور فقراء مساکین کے بارے میں کافی مختلف ہیں ہم تو ان کو فقیر سمجھتے ہیں جو گلیوں بازاروں اور محلوں میں مانگتے کھاتے پھرتے ہیں جبکہ اکثر بیروزگار ایسا نہیں کرتے تو اس کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ لغات اور کتب تفاسیر و احادیث میں ان الفاظ کی تعریف دیکھ لیں ۔

فقر کے اصل معنی حاجت کے ہیں اور فقیر ہر وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت سے کم معاش پانے کے باعث مدد کا محتاج ہو ۔[12]

ابو داؤد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں سائل کا حق ہے گو وہ گھوڑے پر سوار آئے ۔ محروم وہ ہے جس کا کوئی حصہ بیت المال میں نہ ہو خود اس کے پاس کوئی کام کاج نہ ہو صنعت و حرفت جانتا نہ ہو جس سے روزی کما سکے ۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رض فرماتی ہیں اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ کچھ سلسلہ کمانے کا کر رکھا ہو لیکن اتنا نہیں پاتے کہ کافی ہو جائے ۔ حضرت ضحاک رض فرماتے ہیں وہ شخص جو مالدار تھا لیکن اس کا مال تباہ ہو گیا چنانچہ یمامہ میں جب سیلاب کی طغیانی آئی اور ایک شخص کا تمام مال و اسباب بہالے گئی تو ایک صحابی نے فرمایا یہ محروم ہے اور بزرگ مفسرین فرماتے ہیں محروم وہ شخص ہے جو باوجود حاجت کے سوال نہیں کرتا ۔[13] صحیحین کی ایک حدیث میں خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکین کی یہ تعریف کی ہے ۔

الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن فیتصدق علیہ ولا یقوم

فیسال الناس ۔

یعنی جسے ایسے وسائل میسر نہیں کہ تونگر کر دیں جس کا فقر ظاہر نہیں کہ لوگ خیرات دیں جو خود سوال

کے لیے کھڑا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے پھر اس حدیث میں ان کی کیفیت سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بیان کی ہے :۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ. تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ. لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا.

ان کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ ناواقف حال سمجھے کہ یہ تو خوشحال ہیں تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان سکتے ہو مگر وہ لوگوں سے لپٹ کر کبھی سوال نہیں کرتے ہیں[۱۴]

ان سے مراد وہ علماء بھی ہیں جنکو درس و تدریس میں مصروفیت کی وجہ سے کمانے کی فرصت ہی نہ ملتی ہو۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ مسکین وہ شخص ہے جو کما نہ سکتا ہو یا کمانے کا موقع نہ پاتا ہو۔[۱۵] اس تعریف کی رو سے تمام وہ غریب بچے جو ابھی کمانے کے قابل نہ ہوئے ہوں اور اپاہج اور بوڑھے جو کمانے کے قابل نہ رہے ہوں اور بے روزگار یا بیمار جو عارضی طور پر کمانے سے معذور ہو گئے ہوں مسکین ہیں[۱۶]

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تصنیف ترجمان القرآن میں رقمطراز ہیں۔ قوم کے تمام ایسے افراد جن پر وسائل معشیت کی تنگی کی وجہ سے معشیت کے دروازے بند ہو رہے ہوں اور اگرچہ وہ خود پوری طرح ساعی ہوں لیکن نہ تو نوکری (روزگار) ہی ملتی ہو نہ کوئی اور راہ معشیت نکلتی ہو یقیناً "مساکین" میں داخل ہیں۔

ایسے افراد جو خوشحال تھے لیکن کاروبار کی خرابی کی وجہ سے یا کسی اور ناگہانی مصیبت کی وجہ سے مفلس ہو گئے ہوں اگرچہ اپنی پچھلی حیثیت کی بناء پر معزز سمجھے جاتے ہوں حکماً "مساکین" میں داخل ہیں[۱۷]

بیروزگاری کے اسباب

بیروزگاری کی تاریخ اور اس کی قدامت متعین کرنے کے بعد آیئے اب ہم اس کے اسباب اور وجوہات کا کھوج لگاتے ہیں تاکہ ان اسباب اور وجوہات کو دور کر کے اس کا حل تلاش کیا جا سکے۔ جیسا ثابت ہوا کہ یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے یا آج کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا بنی نوع انسان کی تاریخ

کیونکہ انسان کا بنیادی مسئلہ ازل سے معاش رہا ہے اس لیے اس کی چند وجوہات تو وہی پرانی ہیں یعنی جنگ وجدل، لوٹ مار اور قتل وغارتگری ہجرت یا ترکِ وطن پر مجبور کر دیا جانا جیسے اوائل اسلام میں مسلمانوں کو ہجرت حبشہ اور پھر ہجرت مدینہ پر مجبور کیا گیا اور سودی معیشت پر مبنی ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام۔ انتہائی تعجب خیز اور حیران کن امر یہ ہے کہ جس طرح اوائل اسلام میں یثرب (مدینہ) کے یہودیوں نے جزیرہ نما عرب کے مفلس اور بے مایہ عربوں کو اپنے سودی معیشت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا آج انہی کے جانشینوں نے نہ صرف امریکہ، یورپ بلکہ تمام دنیا اور تمام عالمِ اسلام کو بھی اپنے خونی نظام کے شکنجوں میں کسا ہوا ہے اور اسی کے بل بوتے پر اسرائیل کی صورت میں عربوں کے سینے پر مونگ دل رہے ہیں۔

۱۔ سرمایہ داری

اسلامی معیشت کے ماہر سید قطب شہید اپنی کتاب "شبہات حول الاسلام" میں لکھتے ہیں :۔

سرمایہ داری نظام یورپ کی پیداوار یہ مشین کی ایجاد کا نتیجہ تھا جو اتفاق سے یورپ میں ایجاد ہوئی اور وہیں سے دنیا کے باقی حصوں میں پھیلی ....اس کے فطری ارتقاء کے نتیجے میں دولت بتدریج سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آگئی اور غریب اور مزدور اپنی جائیداد اور دولت غرض سب کچھ سے محروم ہو گئے۔ اس سے سرمایہ داروں کو سستے مزدور حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی (جن کی محنت ومشقت کے طفیل ان کی دولت اور تجارت میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود انھوں نے مزدوروں کی اجرتوں میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ مزدوروں کے ان قلیل معاوضوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ دار ممالک کے باشندوں کی قوتِ خرید گھٹ گئی اور ان کا تیار کردہ سامان یونہی پڑا رہے گا چنانچہ سرمایہ داروں کو اپنا مال فروخت کرنے کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش ہوئی جس نے نوآبادیاتی نظام نیز منڈیوں اور خام مال کے بارے میں بین الاقوامی رقابتوں کو جنم دیا اور بالآخر معاملہ اپنے ناگزیر منطقی نتیجے میں تباہ کن جنگوں تک جا پہنچا۔[۱۶۱]

جبکہ جدید ماہرین معاشیات (خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) کا خیال اس کے برعکس ہے وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ کو مزدوروں میں بانٹ دینے ان کی تنخواہیں اور معاوضے بڑھانے سے خرچ بڑھ جائے

گا۔ سرمایہ کم ہو جائے گا اور نتیجتاً سرمایہ کاری بھی گھٹ جائے گی۔ عموماً سرمایہ دار اپنی جمع پونجی کا تھوڑا سا حصہ خرچ کرتے ہیں اور زیادہ حصہ دوبارہ سرمایہ کاری میں لگا دیتے ہیں جس سے پیداوار بڑھتی ہے اور وسائل پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں ہماری فی کس آمدنی میں کمی کی بنیادی وجہ سرمایہ کی کمی ہے (جس کا باعث مزدوروں کے معاوضوں میں زیادتی (اضافہ) ہے) جس کا نتیجہ بے روزگاری اور قوتِ خرید میں کمی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے [۱۹]۔

جبکہ اسلامی معیشت کے ایک اور ماہر مولانا مودودی کا قول اس کے بالکل برعکس ہے وہ اپنی کتاب "اسلام اور جدید معاشی نظریات" میں جدید نظام سرمایہ داری میں اصلاح کی غرض سے جو تغیرات، ترمیمات اور اصلاحات کی گئی ہیں ان کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"لیکن ان تمام تغیرات، ترمیمات اور اصلاحات کے باوجود ابھی تک نظام سرمایہ داری کے بنیادی عیوب جوں کے توں باقی ہیں۔ ابھی تک بیروزگاری کا استیصال نہیں ہوسکا ہے بلکہ زمانۂ جنگ کے سوا دوسرے تمام حالات میں یہ ایک مستقل مرض ہے جو نظام سرمایہ داری کے تحت سوسائٹی کو لگا رہتا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں جس کی صنعت و حرفت اور پیداوارِ دولت آسمانِ عروج کو پہنچی ہوئی ہے جنگی مشاغل کم ہوتے ہی ۳۲ لاکھ سے زیادہ آدمی بیکار ہو گئے، اپریل و مئی ۱۹۴۹ء کے درمیان ان کی تعداد ۳۵ لاکھ سے اوپر ہو گئی اور جون میں ۴۰ لاکھ تک جا پہنچی۔ تجارت و صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ ہو یا سرد بازاری کا، بے روزگاری کم و بیش ہر حال میں نظام سرمایہ داری کی جز ولا ینفک بنی رہتی ہے۔"

ابھی تک وہ عجیب و غریب معمہ جوں کا توں بے حل ہے کہ ایک طرف تو کروڑہا انسان ضروریاتِ زندگی کے حاجت مند موجود ہیں بے حد و حساب قدرتی وسائل موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے مزید اشیاء تیار کی جا سکتی ہیں اور لکھو کھا آدمی ایسے موجود ہیں جنہیں کام پر لگایا جا سکتا ہے لیکن دوسری طرف نظام سرمایہ داری دنیا کی ضرورت اور امکانی کھپت سے بہت کم مال جو تیار کرتا ہے وہ بھی بازار میں پڑا رہتا ہے کیونکہ لوگوں کی قوتِ خرید کم ہے اور جب تھوڑا مال ہی نہیں نکلتا تو مزید آدمیوں کو کام پر لگانے اور قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی ہمت نہیں کی جا سکتی اور جب آدمی کام پر ہی نہیں لگائے جاتے تو ان میں

قوت خرید پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

ابھی تک نظامِ سرمایہ داری کا یہ عیب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ ریاست، سوسائیٹی، مال دار طبقہ غرض کوئی بھی اپنے آپ کو ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی کفالت اور دست گیری کا ذمہ دار نہیں سمجھتا جو قابلِ کار ہونے کے باوجود بے کار ہوں یا ابھی قابلِ کار نہ ہوئے ہوں یا مستقل یا عارضی طور پر ناکارہ ہوگئے ہوں ابھی تک نظامِ سرمایہ داری کو وہ بیماری لگی ہوئی ہے جسے کاروبار کا چکر Trade Cycle کہتے ہیں جس میں ہر چند سال کی گرم بازاری کے بعد دنیا کی معیشت پر کساد بازاری کے دورے پڑتے رہتے ہیں کاروبار پوری تیز رفتاری کے ساتھ مزے سے چل رہا ہوتا ہے کہ یکایک تجار محسوس کرتے ہیں کہ جو مال ان کے گوداموں میں آرہا ہے وہ مناسب رفتار سے نکل نہیں رہا وہ زرا فرمائشیں روکتے ہیں۔ صناع یہ حال دیکھ کر مال کی تیاری سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ سرمایہ دار قرض سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور پہلے کا دیا ہوا بھی واپس مانگنے لگتا ہے۔ کارخانے بند ہونے شروع ہوتے ہیں بے روزگاری بڑھتی ہے قیمتیں گرنی شروع ہوتی ہیں تاجر اور گاہک مزید قیمتیں گرنے کی امید پر فرمائش اور خریداری سے ہاتھ روکتے ہیں۔ چلتے ہوئے کارخانے بھی پیداوار کم کر دیتے ہیں بے روزگاری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کساد بازاری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے پھر یکایک رخ بدلتا ہے۔ آہستہ آہستہ چڑھاؤ شروع ہو جاتا ہے اور پھر گرم بازاری کا دور آجاتا ہے۔ یہ چکر (Trade Cycle) نظامِ سرمایہ داری کے لیے ایک مستقل مرض بن چکا ہے۔ جس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا[1] اور اسے معاشی اصطلاح میں (Cyclical Unemployment) کہا جاتا ہے۔

۲/ سودی معیشت جو سرمایہ داری کی پہلی بنیاد ہے

سودی بینک اور سودی قرضے۔ جدید ماہرینِ معاشیات کا کہنا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام جب سے اپنے ابتدائی "دورِ خیر" (جب معاشرے نے مشین کی ایجاد کی وجہ سے کافی ترقی کی) اسے نکل کر موجودہ "دورِ شر" میں داخل ہوا ہے قومی قرضوں پر اس کا انحصار بہت بڑھ گیا ہے چنانچہ بینک قائم ہوئے اور انہوں نے مالی کاروبار اس طرح استوار کیا کہ وہ بھاری سود پر حکومتوں کو قرضے دینے لگے۔ حکومتیں ترقیاتی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے اور دوسری سماجی خدمات انجام دینے کے لیے ان بینکوں سے جو قرضے لیتی ہیں ان کے سود بھی ان حکومتوں کے شہری ادا کرتے ہیں حکومتیں مجبور ہیں کہ مختلف محاصل میں اضافہ کرکے ان قرضوں کو مع سود ادا کریں اس طرح ہر فرد سود خوروں کو یہ

"جزیہ" ادا کرنے میں شریک ہے۔

اسلامی معیشت کے ماہر سید قطب شہید اپنی کتاب "فی ظلال القرآن" میں سود کی مضرت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"سود کی مضرت یہاں تک بڑھ چکی ہے کہ اس کے ایک مغربی نقاد جرمنی کے مشہور ماہر معاشیات ڈاکٹر شاخت ہیں جو جرمنی کے رائش بینک (Reich Bank) کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ دمشق میں ۱۹۵۳ء میں اپنے ایک لیکچر میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ الجبرا کے ایک (لامتناہی) سلسلہ حساب کے ذریعے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا کی ساری دولت معدودے چند سود خواروں کے ہاتھوں میں کھنچ آنے والی ہے اس لیے کہ سود پر قرض دینے والا ہمیشہ فائدہ حاصل کرتا ہے جبکہ قرض لینے والے کو کبھی فائدہ ہوتا ہے کبھی نقصان ظاہر ہے کہ ساری دولت بالآخر اس کے ہاتھوں میں آجائے گی جس کو ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا آج عملاً ایسا ہو رہا ہے کیونکہ آج دنیا کی بیشتر دولت کے اصل مالک چند ہزار افراد ہیں باقی سارے اصحاب ملکیت اور کارخانہ دار جو بینکوں سے قرض لے کر کاروبار کرتے ہیں اور ان کے مزدور وغیرہ سب انہی سرمایہ داروں کے تنخواہ دار ملازمین کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی محنت کے ثمرات ان چند ہزار افراد کو ملتے ہیں[۱۲] اور وہ بھی بغیر کسی محنت و مشقت کے۔

سودی بینکوں کے ذریعے سودی معیشت چونکہ سرمایہ داری نظام کی خشت اول ہے اور مندرجہ بالا سطور میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سرمایہ داری نظام بیروزگاری کا سبب ہے لہٰذا سودی معیشت بھی بالواسطہ طور پر ایک اور سبب اور وجہ ہوئی۔

۳/ اجارہ داری۔ سرمایہ داری کی دوسری بنیاد

سرمایہ دارانہ نظام کی دوسری بنیاد شدید کاروباری مسابقت و منافست ہے جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے کاروباری ادارے ختم ہو جاتے ہیں یا پھر سب مل کر بڑے بڑے کاروباری ادارے قائم کر لیتے ہیں تاکہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کر سکیں اس سے اجارہ داری Monopoly جنم لیتی ہے اور اجارہ دار (Monopolist) کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا بھی بازار میں اسی جیسا مال لائے یا اسی جیسی مصنوعات تیار کرے۔ وہ تو بازار پر اپنا پورا کنٹرول چاہتا ہے تاکہ لوگوں سے

من مانی قیمتیں وصول کر سکے اور نتیجتاً لوگوں کو ہر طرح کی شدت اور تنگی کا شکار کر کے ان کا جینا دو بھر کر دے۔ وہ دوسروں کے لیے اس بات کے مواقع ختم کر دیتا ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح روزی کما سکیں[۲۲]

۴۔ جنگ وجدل جیسا کہ سرمایہ داری کے ذیل میں یہ بیان ہوا ہے کہ جنگ عظیم دوئم کے نتیجے میں صرف امریکہ میں ۴۴ لاکھ افراد بے روزگار ہو گئے تھے جہادِ افغانستان کے نتیجے میں کتنے افراد بے روزگار ہوئے ہیں اس کے اعداد وشمار ابھی اکٹھے نہیں کیئے گئے لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق اس جہاد میں ۳۵ لاکھ سے زیادہ افغان مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا انکے بچے یتیم اور بیویاں بیوہ ہو گئیں تو اندازاً اسی قدر افراد بے روزگار ہوئے ہوں گے۔ حال ہی میں خلیج کی جنگ میں ہزاروں عراقی کام آئے نتیجتاً بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔

۵۔ ہجرت اور ترکِ وطن اسلام میں سب سے پہلی ہجرت، ہجرت حبشہ اول تھی پھر ہجرت حبشہ ثانی اور ہجرت مدینہ کے نتیجے کے طور پر مہاجرین اپنے تمام مال ومتاع، مکان، دکانیں اور زمینیں وغیرہ مکہ میں چھوڑ کر حبشہ اور مدینہ میں بے سروسامانی کی حالت میں وارد ہوئے یہ تو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سیاسی فراست کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مؤاخاۃ کے ذریعے بے روزگاری کے اس گھمبیر مسئلے پر قابو پالیا۔ یہ امدادِ باہمی کی بھی ایسی مثال ہے کہ دنیا کا کوئی مہذب اور جدید سے جدید معاشرہ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

اسی طرح حال ہی میں جہادِ افغانستان کے نتیجے میں ۳۰ لاکھ سے زائد افغانی بوڑھے، بچے اور عورتیں جو لڑنے کے قابل نہیں تھے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور کچھ نے ایران میں پناہ لی۔ عراق کی جنگ میں بے شمار عراقی دوسرے عرب ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ جس سے ظاہر ہے بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔ قیام پاکستان کے وقت بھی یہی مسئلہ درپیش ہوا تھا۔ کروڑوں مہاجرین کی آبادکاری اور انکو مناسب روزگار فراہم کرنا پڑا نومولود پاکستانی ریاست کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔

۶۔ سحت واستحصال فرمان الٰہی ہے: وَتَرٰى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (المائدہ ۶۲)

ترجمہ: ان اہل کتاب میں تم بہت سے لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ اور ظلم وزیادتی کے کاموں اور سحت (Exploitation) کھانے کی طرف لپکتے ہیں۔ ان کے کرتوت بہت برے ہیں[۲۳]

مسئلے کا اسلامی حل

اسباب و وجوہات معلوم کرنے کے بعد اب آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ مسئلے کا حل اسلام کیا بتاتا ہے۔

زکوٰۃ و عشر اور خمس اور صدقۂ فطر

مغربی ماہرین معاشیات نے بے روزگاری کا حل زیادہ بچت کو قرار دیا ہے تاکہ اس سے مزید سرمایہ کاری کی جا سکے جبکہ اسلام نے اس کا حل انفاق کو تجویز کیا ہے جس کی ایک منظم صورت زکوٰۃ عشر اور خمس وغیرہ ہیں۔

اوائل اسلام میں چونکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کا واسطہ مشرکین مکہ سے تھا جن کی سخاوت اور فیاضی اگرچہ ضرب المثل تھی عام دعوتیں کرنا اور ان پر دل کھول کر خرچ کرنا ان کی قدیم روایت تھی عرب اسی پر فخر کرتے تھے کہ ان کے چولہوں کی آگ کبھی بجھتی نہ تھی لیکن یتامیٰ و مساکین اور سائل و محروم کی مدد کرنا بلکہ اسے ان کا حق سمجھنا ان کے لیے ایک نئی بات تھی یہاں آکر ان کے داد و دہش کرنے والے ہاتھ رک جاتے تھے کہ جس کی وجہ سے قرآن ان کو بخیل قرار دیتا ہے۔ اور مکی سورتوں میں جا بجا ان کے اس بخل کی مذمت کرتا ہے۔ جیسا کہ اس دور کی ایک سورۃ حٰم السجدہ (جو آپ کے چچا حضرت حمزہ رضؓ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمر رضؓ کے ایمان لانے سے پہلے نازل ہوئی [۲۴]) میں ان الفاظ میں ان کی مذمت کی گئی ہے۔

ویلٌ للمشرکین الذین لا یؤتون الزکوٰۃ وھم بالآخرۃ ھم کافرون

ترجمہ: تباہی ہے ان مشرکین کے لیے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں [۲۵]

اس آیت میں زکوٰۃ کے لفظ کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہجرت حبشہ سے قبل مکہ کے مسلمانوں میں زکوٰۃ کے حکم پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس کی تائید ہجرت حبشہ کے بعد شاہ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضؓ (مہاجرین کے قائد) کی تقریر سے بھی ہوتی ہے جس میں سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کی تعلیمات کے ذیل میں ادائیگی زکوٰۃ کے حکم کا بھی ذکر ہے [۲۶]

چونکہ اس آیت میں مشرکین مکہ پر تنقید ہے کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے اس لیے بعض علمائے نے زکوٰۃ نہ دینے سے مراد یہ لیا ہے کہ وہ توحید کا اقرار نہیں کرتے لیکن اکثر مفسرین نے اس سے زکوٰۃ المال ہی مراد لیے [۲۷] امام ابن جریر رحؒ بھی اسی کو مختار کہتے ہیں۔ اگرچہ صدقے اور زکوٰۃ کی اصل کا حکم تو نبوت کی ابتداء میں ہی تھا

جیسے فرمان الٰہی ہے:۔ وأتوا حقہٗ یوم حصادہٖ جس دن کھیت کاٹو اسکا حق دیدیا کرو۔
ہاں زکوٰۃ جس کا نصاب اور جس کی مقدار من جانب اللہ مقرر ہے وہ مدینے میں ۲ ہجری میں مقرر ہوئی بلکہ لیکن ابن ماجہ میں قیس بن سعد بن عبادہ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ "۲" ہجری میں زکوٰۃ الفطر کا حکم نافذ ہوا۔
اس لیے کہ اس دور میں ایمان لانے والوں کی ایک معتد بہ تعداد پہلے سے ہی مفلس اور تنگدست تھی جبکہ مقابلہ میں مکہ کے بڑے بڑے مال دار وساہوکار مسلمانوں کے مخالف تھے جو مسلمانوں کو ایمان لانے کی پاداش میں سخت اذیتیں دیتے تھے ان کا سماجی اور معاشی قطع تعلق کرتے (جیسا کہ شعب ابی طالب میں کیا) اسکا واحد حل یہی کہ ان مسلمانوں کو جو کچھ کھاتے پیتے تھے یا اہل ثروت تھے انفاق پر ابھارا جائے اس کے لیے اسلام نے اسی دور میں اطعام المسکین۔ الحض علی الاطعام۔ انفاق۔ انفاق فی سبیل اللہ۔ زکوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے پرزور الفاظ کے ذریعے ان میں انفاق کا جذبہ پیدا کیا۔ اسی طرح کے انفاق نہیں نکالے جانے والے مال کے مصارف کی نشاندہی بھی مکی آیات میں ہی کردی گئی تھی :۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِينَ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ الْقُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ط فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ۔ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔

ترجمہ :۔ صدقات تو دراصل فقراء اور مساکین کے لیے ہیں اور ان کارکنوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل پر مقرر ہوں اور ان لوگوں کے لیے جن کی تالیف قلوب مطلوب ہو اور لوگوں کی گردنیں بند اسیری سے چھڑانے کے لیے اور قرضداروں کے لیے اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کیلئے اور مسافروں کے لیے۔

بالآخر "۹" ہجری میں سورۃ توبہ کی آیت صدقات میں پہلے ذکر کردہ مدات میں چند مزید مدات کے اضافہ کے ساتھ مجموعی طور پر یکجا ذکر کر کے فریضۃ من اللہ کے الفاظ کے ساتھ آٹھ مصارف زکوٰۃ کی حتمی طور پر تحدید کردی گئی۔ [۲۸]

ہجرت کے بعد مدینہ میں جب مسلمانوں کا اول روز سے ہی ایک آزاد اور خود مختار معاشرہ قائم ہوگیا تو انفاق اور زکوٰۃ کے ان احکام پر جو مکی آیات میں محض اجمالی طور پر بیان ہوئے تھے نہ صرف زیادہ تفصیل اور وضاحت سے بیان کیے گئے تھے بلکہ ان پر عمل درآمد کے لیے باقاعدہ تنظیم بھی قائم کی گئی

چنانچہ مدینہ میں خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پہلی تقریر میں ہی زکوٰۃ وانفاق کے سلسلہ میں ہر مطالبہ کیا کہ ہر وہ شخص جو تھوڑی بہت استطاعت رکھتا ہے اللہ کی راہ میں کچھ نہ کچھ ضرور دے[۲۹]

اسلامی معیشت کے ماہر مولانا مودودی زکوٰۃ کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :۔

" یہ مسلمانوں کی کواپریٹو سوسائیٹی ہے یہ ان کی انشورنش کمپنی ہے یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے یہ ان کے لیے بے کاروں کا سرمایہ اعانت ہے۔ یہ ان کے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعۂ معاش ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکر فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادا اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی مدد کرو کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا بنے گا؟ مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہو گا۔ کوئی آفت ناگہانی آپڑی بیمار ہو گئے گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آگیا، دیوالیہ نکل گیا تو ان مصیبتوں سے مخلصی کی کیا سبیل ہو گی سفر میں پیسہ نہ رہا تو کیونکر گذر بسر ہو گی؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لیے بے فکر کر دیتی ہے"۔[۳۰]

حکومت نے زکوٰۃ کی وصولی اور مستحقین میں اس کی تقسیم کا نظام تو ضیاء الحق (مرحوم) کے زمانے سے قائم کر دیا ہے یہ ایک مستحسن اقدام ہے لیکن یہ صرف بنکوں میں جمع لوگوں کی پونجی پر کٹتی ہے جو بعض ہوشیار حضرات رمضان سے پہلے نکال لیتے ہیں دوسرے بڑے بڑے تاجروں اور صنعتکاروں سے ان کے مال تجارت اور صنعت پر زکوٰۃ کی وصولی کا کوئی انتظام نہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں سے عشر کی وصولی کا بھی کوئی انتظام تا حال نہیں ہے۔ بعض حضرات کے بڑے بڑے مویشی فارم ہیں ان سے بھی زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی۔ معدنیات کا جو کاروبار کر رہے ہیں ان سے بھی زکوٰۃ الرکاز (خمس) نہیں لی جا رہی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مرکزی اور صوبائی زکوٰۃ کونسلوں میں علماء کے ساتھ اسلامی معیشت کے ماہرین یا کم از کم جدید معاشیات کے ماہرین شامل نہیں ہیں۔

صدقہ فطر یا زکوٰۃ الفطر (فقہ کی تمام کتابوں میں زکوٰۃ کے آخر میں یعنی زکوٰۃ کے ساتھ ہی صدقہ فطر کے احکام کا ذکر ہے) کا حکم "۲" ہجری میں رمضان کے روزوں کے ساتھ ہی دیدیا گیا تھا اس کے مطابق ہر خوشحال آدمی کے لیے ضروری ہے کہ عید کے موقع پر خوشی مناتے ہوئے اپنے اور اپنے زیر کفالت

افراد میں سے ہر ایک کی جانب سے ایک غریب بھائی کے لیے اس کی ایک دن کی خوراک کے بقدر صدقہ کرے اس کی مقدار ایک صاع مقرر ہے۔ پاکستان میں صدقہ فطر ہی ایسا صدقہ ہے جسے تقریباً ہر شخص باقاعدگی سے ادا کرتا ہے اسی طرح اگر زکوٰۃ و عشر کو بھی پورے جذبے (Spirit) کے ساتھ وصول اور تقسیم کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں کوئی فقیر ٹرینوں میں بسوں کے اڈوں پر گلیوں محلوں میں مانگتا ہوا نظر آئے یعنی ابھی ہم اس گداگری کی لعنت سے ہی اپنے پیارے پاکستان کو پاک نہیں کر سکتے ہیں جو بے روزگاری کی بد ترین بلکہ مکروہ ترین صورت ہے۔

اگر مرکزی زکوٰۃ کونسل (جو مستند علماء کے علاوہ اسلامی معیشت کے ماہرین اور جدید ماہرین معاشیات پر مشتمل ہو) اس بات کو مناسب سمجھے کہ ہر سال کی کل موصولہ زکوٰۃ میں سے جس قدر حصہ فقراء اور مساکین کی مد میں صرف کرنا طے ہو جائے باہم مشورے سے تو اس رقم کو کسی منفعت بخش کاروبار میں لگا دیا جائے یا کوئی صنعت قائم کر دی جس کے حصص ان بے روزگاروں اور حاجت مندوں کے نام کر دیئے جائیں جو اس سال کی زکوٰۃ کے مستحقین قرار دیئے جائیں تاکہ ان کی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بن جائے۔ جب انہیں مناسب روزگار مل جائے یا وہ حاجت مند نہ رہیں تو یہی حصص دوسرے بے روزگاروں یا حاجت مندوں کے نام منتقل کر دیئے جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کاروبار یا صنعت میں ان بے روزگاروں کو مناسب تربیت دے کر کھپا دیا جائے۔ یا یہ خیال رکھا جائے کہ جس علاقے کی زکوٰۃ ہو اس سے اسی علاقے میں وہ صنعت لگائی جائے تاکہ اس زکوٰۃ سے اسی علاقے کے بے روزگار فائدہ حاصل کریں۔

۲: وراثت کی تقسیم

تقسیم وراثت کا قانون جیسا اسلام میں ہے کسی اور معاشی نظام میں نہیں ہے۔ دوسرے معاشی نظاموں کا میلان اسی طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے سمیٹ کر جمع کی ہے وہ اس کے بعد بھی ایک یا چند اشخاص کے پاس سمٹی رہے مثلاً برطانیہ میں اولاد اکبر کی جانشینی کا قانون (Law of Primogeniture) اور مشترک خاندان کا طریقہ (Joint Family System)۔ لیکن اسلام دولت کے سمٹنے کو پسند نہیں کرتا وہ اس کو پھیلانا چاہتا ہے تاکہ دولت گردش میں رہے اور معاشرے کے تمام افراد اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر پاکستان میں عملاً اول تو وراثت کی تقسیم نہیں ہوتی وہی برطانیہ والے قانون پر لوگ عمل پیرا ہیں۔ اگر کسی وراثت کی تقسیم بھی ہوتی ہے تو بہنیں تو محروم ہی رہتی ہیں انکو کوئی بھائی حصہ نہیں

دیتا۔شریعت کے اصول للذکر مثل حظ الانثیین نے بہنوں کا جو آدھا حصّہ مقرر کیا ہے ان کو وہ بھی نہیں ملتا۔ وراثت کی صحیح صحیح تقسیم ہونی چاہیئے تاکہ کوئی شخص بھی اپنے مقرر حصّے سے محروم نہ رہے۔[1]

۳، سودی معیشت کا قلع قمع

اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو جدید دور کے تمام پیچیدہ اور لاینحل مسائل کی بنیادی اور سب سے بڑی وجہ سودی معیشت ہے جس نے بے لگام اور بے رحم سرمایہ داری کو جنم دیا ہے۔ معاشرے میں خود غرضی، بے حسی اور بے رحمی، حرص، طمع اور لالچ کو رواج دیا ہے جائز اور ناجائز حلال و حرام کی تمیز ختم کردی ہے۔ چور بازاری، سمگلنگ، احتکار (ذخیرہ اندوزی) کرکے مصنوعی قلت پیدا کرنا اور پھر اشیاء کی قیمتیں بڑھانا یعنی مہنگائی کرنا اسراف و فضول خرچی اور بخل اسی کی ناجائز اولاد ہے۔

اسی کی بدولت اس ملک میں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اسلامی معیشت (جو آج کے جملہ معاشی مسائل کا واحد حل ہے) کا قیام ناممکن ہو رہا ہے۔ سیور ریفل پرائز بانڈز (جو جوئے کی ایک شکل ہے) کو اپرٹیو فنانس کارپوریشن (جنہوں نے غریبوں کا بچا کھچا سرمایہ بھی لوٹ لیا یہ سب انہی ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی جنگ زرگری اور ہوس زر کی غماز ہیں۔ یہاں تک کہ ان ساہوکاروں کی یہی ہوس زر رفتہ رفتہ سیدھے سادے اور مخلص و ہمدم عوام میں بھی سرایت کرگئی ہے اور اب دکھی انسانیت کی امداد و اعانت کے لیے فاطمید ریفل اور ٹی بی ریفل کا اجراء کرنا پڑا جو کہ سراسر جوا ہے اس میں کوئی نیکی نہیں ہے یعنی ابلاغ عامہ کے ذرائع پر تشہیر اور پروپیگنڈے کے ذریعے ہمارا مزاج یہ بنا دیا گیا ہے کہ اب ہم بھی فرنگیوں کی طرح للہ فی اللہ یعنی خدا واسطے یا اپنی آخرت سنوارنے کے لیے کوئی نیکی یا ہمدردی کرنے کو تیار و آمادہ ہی نہیں ہوتے جب تک اسی دنیا میں انعام بلکہ ۲۰ - ۲۵ لاکھ تک کے بڑے انعام کا لالچ نہ دیا جائے یعنی یہ صدٌ عن سبیل الله (اللہ کے راستے کی ایک رکاوٹ) بن کے رہ گئی ہے اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو اپنی منزل یعنی اسلامی معیشت کے قیام کو پانے کے لیے راستے کی اس دیوار کو گرانا ہوگا اس کا مکمل قلع قمع کرنا ہوگا تبھی ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے ورنہ جب تک یہ شجر خبیث موجود ہے اصلاح احوال کی کوئی صورت کارگر نہیں ہو گی بلکہ صورت حال اور بگڑے گی اور بے روزگاری کا مسئلہ اور زیادہ گھمبیر ہوتا جائے گا کیونکہ مسئلے کی جڑ بنیاد یہی ناسور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اوائل اسلام میں زکوٰۃ کو انفاق کا ایک عام قانون بنانے کے ساتھ ساتھ سود کو حرام کر کے سودی معیشت اور اس پر مبنی سرمایہ داری پر ایک کاری ضرب لگائی گئی جیسا کہ مکی دور کی ایک سورۃ الروم کی اس آیت سے ظاہر ہے جس میں زکوٰۃ کی تعریف کے ساتھ ساتھ سود کی مذمت کی گئی ہے فرمان الٰہی ہے

وَمَآ اٰتیتُم من ربًا لّیربُوا فی اَموال الناس فلا یربُوا عند اللہ وَمَا اُتیتُم مِن زکٰوۃٍ تُرِیدُونَ وجہ اللہ فاولٰئِک ھُمُ المُضعِفُون۔

ترجمہ:۔ اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک وہ ہرگز نہیں بڑھتا۔ بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کی رضا کے لیے زکوٰۃ میں دیتے ہو[۳۲]

پھر اللہ کے یہ فرامین:۔ یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے[۳۳]

یا ایّھا الذین اٰمنوا اِتقوا اللہ وذروا ما بقی من الرّبوا إن کنتم مؤمنین٥ فإن لم تفعلوا فأذنوا بحربٍ من اللہ و رسولہٖ ج وَإن تُبتُم فلکم رءُوس اُموالکم لا تظلمون ولا تظلمون٥ وإن کان ذو عُسرۃٍ فنظرۃٌ إلیٰ میسرۃٍ ط وأن تصدّقوا خیرٌ لکم ان کنتم تعلمون٥

ترجمہ:۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اور اگر نہیں کرتے (نہیں چھوڑتے) تو اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کیلئے ہوشیار ہو جاؤ۔ ہاں اگر توبہ کر لو تو تمہارا اپنا اصل مال (اصل زر) تمہارا ہی ہے نہ تم ظلم کرو تم پر ظلم کیا جائے۔ اور اگر کوئی تنگدست ہو تو اسے آسانی تک کی مہلت دینی چاہیے اور معاف کر دینا تو بہت ہی بہتر ہے اگر تم میں علم ہو[۳۴]

تشریح روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک ایسے معاملے کی نسبت جس میں سود تھا حضرت زید بن ارقمؓ کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان کا جہاد بھی برباد ہو گیا کہ جہاد خدا تعالیٰ کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا نام ہے اور سود خور ہی خود خدا تعالیٰ سے مقابلہ کرتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں سود خور سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اپنے ہتھیار لے لے اور

خدا سے لڑنے کے لیے تیار ہوجا۔ آپ فرماتے ہیں امام وقت پر فرض ہے کہ سود خور سے اگر وہ سود نہ چھوڑیں تو ان سے توبہ کرائے اگر نہ کریں تو ان کی گردن مار دے۔ ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے،

الرّبا سبعون جزأ ایسرھا ان ینکح الرّجل امّہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ " سود کے ۷۰ گناہ ہیں جن میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ انسان اپنی ماں سے زنا کرے " یعنی سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اگر اس کو ۷۰ اجزا میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ہلکے سے ہلکا جز اس گناہ کے برابر ہے کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا سنو! قرآن میں سب سے آخر سود کی حرمت کی آیت اتری اور آپؐ کا انتقال ہوگیا (ابن ماجہ) مروی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم ۹ راتوں تک زندہ رہے[۳۵]

یعنی اسلام کی اول و آخر تعلیم یہی رہی ہے کہ سود کی لعنت کو ختم کیا جائے لیکن عملاً یہ ہو رہا ہے کہ تمام عالم اسلام کے مسلمان اس کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ اسے شیر مادر سمجھ کر کھا رہے ہیں گلی گلی محلے محلے میں مختلف ناموں سے نئے نئے بینک (سود گھر) کھل رہے ہیں اور ہم خوش ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔

۴۔ قرضِ حسنہ انسان کا بنیادی مسئلہ کسبِ معاش کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود انسان اور ذرائع بھی وہی پرانے ہیں صنعت و حرفت اور زراعت یا ملازمت۔ لیکن صنعت و حرفت اور زراعت کے میدان میں مشین کی ایجاد نے کافی انقلاب برپا کردیا ہے اور روزگار کے انداز بھی بدل دیئے تو اس کے لیے پرانے حل کے ساتھ ساتھ جدید حل بھی سوچنا ضروری ہے۔ حکومت پہلے آسان شرائط سود پر بے روزگار افراد کو قرضے دیتی ہے پھر جب وہ اپنے پاؤں جما لیتے ہیں تو آسان اقساط میں وہ قرضے لٹاتے ہیں تاکہ دیگر بے روزگار افراد کو دیئے جاسکیں یہ ایک اچھی سکیم ہے لیکن اگر اسے بغیر سود کے قرض حسنہ کے طور پر دیا جائے تو اس کے فوائد زیادہ ہوں گے۔

دوسرے دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ افراد میں بے روزگاری زیادہ ہے اس لئے کہ آج کل کے دور میں علم سے زیادہ ہنر کی مانگ ہے لہٰذا میری یہ تجویز ہے کہ ہمارے سکولوں، کالجوں اور

یونیورسٹیوں میں علم وادب یا نظری علوم پڑھانے کی بجائے فنون اور ہنر سکھانے پر زیادہ توجہ دی جائے یا پھر تمام طلبہ کو علوم کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی ہنر اور فن سکھانے کا ضرور بندوبست کیا جائے کہ بقول اقبالؒ :- ع قوتِ افرنگ از علم و فن است

کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس پیسہ تو بہت ہے لیکن ٹیکنالوجی (Technology) نہیں ہے اس لیے ہمیں ٹیکنالوجی حاصل کرنا چاہیئے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں خصوصاً سکولوں میں بھی طلبہ کی راہنمائی (گائیڈینس) کا انتظام کیا جائے تاکہ انکا رجحانِ طبع دیکھ کر ان کو ہنر سکھائے جائیں اور وہ اپنے آپ کو معاشرے میں ناموزوں (Misfit) نہ سمجھیں۔

مشینی زندگی کی بے کیفی اور بے رنگی میں رنگ بھرنے کے لیے علم و ادب بھی ضروری ہیں کہ بقول اقبالؒ :- ع احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لیکن آج کل مشین ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے اس نے انسانوں کو بہت سی سہولتیں بھی بہم پہنچائی ہیں۔ روزگار کے مواقع بھی پیدا کیے ہیں اور ساتھ ساتھ بے روزگاری میں اضافہ بھی کیا کیونکہ پہلے جو کام لاکھوں ہنرمند اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے آج ایک مشین وہ کام لمحوں میں کر دیتی ہے اور بڑی ستھری اور پائیدار بنا کر مارکیٹ میں بھیج دیتی ہے جس سے دستکار حضرات بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی بے روزگاری کو معاشی اصطلاح میں Technological Unemployment کہتے ہیں[۳۵] لیکن اب تو مشین آج کی ضرورت بن چکی ہے تو ان بے روزگار ہونے والے دستکاروں کو بھی قرض حسنہ دے کر بے روزگاری کے بے رحم شکنجے میں جانے سے بچایا جائے تاکہ وہ بھی اپنے ہنر اور دستکاری کو مشینی یعنی (Industrialise) کرلیں اور عزت کی روزی کما سکیں۔ اور ایک کا روزگار دوسروں کی بے روزگاری کا سبب نہ بن سکے۔

۵ / اجارہ داری کا خاتمہ

احتکار کرنے والا (اجارہ دار) (Monopolist) دولت کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور بسا اوقات زائد سامان کو تلف کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک خاص نرخ لوگوں پر مسلط کر سکے۔ یہ طرزِ عمل صریح طور پر سامانِ معیشت کے ان سماجی خزانوں کی بربادی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے فائدے کے لیے زمین میں پیدا کیا ہے۔ اسی لیے اسلام نے احتکار کو دائرۂ دین

سے خارج کرنے والا جرم قرار دیا ہے۔

من احتکر طعاماً اربعین یوماً فقد بریٔ من اللہ وبریٔ اللہ منہ

ترجمہ:۔ جس نے چالیس دن تک خوراک کو ذخیرہ کیے رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں نہ اللہ کو اس کی کوئی پرواہ ہے (مسند امام احمد)

۶۔ سُحت و استحصال کا تدارک

استحصال کسی قسم کا بھی ہو ختم ہونا چاہیئے خواہ مستاجر کے ہاتھوں اجیر کا استحصال ہو یا مذہبی پیشہ وروں کے ہاتھوں اپنے عقیدت مندوں کا ہو یا اخبارات وجرائد کے مالکوں کے ہاتھوں یا پبلشروں کے ہاتھوں غریب لکھنے والوں کا ہو۔ اخبارات و رسائل کی اشاعت بھی آج کل دیگر منفعت بخش صنعتوں کی طرح ایک صنعت بن چکی ہے اور اس میں بڑا منافع ہے کیونکہ یہاں خام مال (مضامین، افسانے، نظمیں اور غزلیں) مالکوں کو بالکل مفت مل جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان لکھنے والوں کو جن کی تخلیقات یہ اخبارات وجرائد کے مالک شائع کرتے ہیں۔ اس رسالے یا اخبار کی ایک اعزازی کاپی بھی یہ مالکان نہیں بھیجتے وہ بھی انہیں خود خریدنا پڑتی ہے۔ یعنی قلم اور لفظ (جن کی قسم اللہ نے کھائی ہے) ن۔ والقلم وما یسطرون بالکل بے قیمت ہے اس کی اس ملک میں کوئی قیمت نہیں حالانکہ لفظ تو انمول ہوتا ہے۔ ایسا قانون بنانا چاہیئے کہ یہ مالک ہر لفظ کی قیمت ادا کریں جو یہ اپنے اخبارات وجرائد میں شائع کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ جو خود استحصال کے خلاف لکھتے نہیں تھکتے لکھنے والوں کا استحصال نہ کرسکیں

۷۔ اسراف و تبذیر کے خلاف اقدام

ہمارے ملک میں جہاں لوگوں کی اکثریت نانِ جویں کو محتاج ہے وہاں ایک محدود اقلیت ذرائع ووسائل معاش پر قابض ہے اور وہ اپنی بے انتہا دولت و ثروت میں محروم لوگوں کو شریک کرنے کی روادار نہیں ہے۔ ان سے جب رفاہی کاموں میں امداد مانگی جائے تو وہ دس روپے دیتے ہوئے دس دفعہ سوچتے ہیں لیکن جب بسنت منانا ہو تو بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ پتنگ بازی پر لاکھوں روپے کا ضیاع، وقت کا ضیاع اور لہو ولعب ہے یہ اسراف ہے اسے قانوناً ممنوع قرار دے دینا چاہیئے اور ان کی زائد از ضرورت دولت کو ترمذی کی اس حدیث کی رو سے إن فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ (مال میں زکوٰۃ کے علاوہ حق بھی ہے) ٹیکس کے ذریعے حاصل کرکے بے روزگاروں اور حاجت مندوں پر صرف کر دینی

چاہیئے اور عملاً" اسلامی معیشت کی ایسی تصویر پیش کرنی چاہیئے جیسا کہ اسلامی معاشی نظام کا تقاضہ ہے.

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃً بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ

مال تمہارے مالداروں میں ہی چکر نہ لگاتا رہے [۱۴۷]

اسلام کے معاشی نظام کو نافذ کر کے بتدریج وہ تمام فاصلے کم کر دیئے جائیں جو امیر اور غریب میں پائے جاتے ہیں اور اسی تدریجی عمل میں وہ مقام آجائے کہ پورے معاشرے میں ایک بھی حاجت مند باقی نہ رہے۔

نکتہ، شرع مبیں ایں است و بس
کسے نہ باشد در جہاں محتاج کس

واٰخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین



مصادر و مراجع

1, Syed Abdul Quddus, Social Change in Pakistan Lahore, 1990 P-110.

۲ ، ابن ہشام۔ السیرۃ النبویۃ۔ قاہرہ ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء ج۔۱ ص۲۶۰

۳ ، الضحیٰ

۴ ، ابن ہشام ، " " " ص۲۶۰

۵ ، المدثر : ۴۲ تا ۴۷

۶ ، الحاقۃ : ۳۰ تا ۳۴

۷ ، ابوعبید قاسم بن سلام۔ کتاب الاموال۔ قاہرہ ۱۳۲۵ھ ص۳۵۰

۸ ، ابوالحسن علی بن احمد الواحدی۔ اسباب النزول۔ قاہرہ ۱۳۷۸ھ ص۲۵۰

۹ ، الذاریات : ۱۷ تا ۱۹

۱۰ ، الواحدی۔ اسباب النزول۔ قاہرہ ۱۳۷۸ھ ص۲۵۰

۱۱ ، المعارج : ۲۳ تا ۲۵

۱۲ ، لسان العرب۔ بیروت۔ ۱۹۵۶ء۔ ج۔۵ ص۶۰

۱۳ ، ابن کثیر۔ جلد پنجم۔ جز ۲۶۔ ص۱۰۹

۱۴ ، البقرہ : ۲۷۳

۱۵ ، الجصاص۔ ج۔۳۔ ص۱۵۱

۱۶ ، سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ قرآن کی معاشی تعلیمات۔ لاہور ۱۹۸۴ء ص۵۵

۱۷ ، مولانا ابوالکلام آزاد۔ ترجمان القرآن۔ ج۔۲۔ ص۱۲۹

۱۸ ، پروفیسر سید خالد محمود ترمذی۔ مقالات سیرت۔ وزارت مذہبی امور، اقلیتی امور اسلام آباد ۱۹۸۹ء۔ ص۱۱۶

۱۸, Dr. Anwar Iqbal Qureshi. Economic Problems Facing Pakistan - Karachi. 1971 P-51.

۲۰ ، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی - اسلام اور جدید معاشی نظریات - لاہور ۱۹۸۶ء - ص ۸۴ تا ص ۸۶

۲۱ ، سیّد قطب شہید - ترجمہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی - اسلام کی اقتصادی پالیسی - لاہور ۱۹۶۹ء - ص ۵۰

۲۲ ، ایضاً " " " " " " ص ۴۲

۲۳ ، مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری - اخلاق و معاش کا باہمی ربط کراچی - ص ۹

۲۴ ، ابن ہشام - السیرۃ النبویۃ - قاہرہ ۱۳۵۶ھ - ج ۱ - ص ۳۱۳

۲۵ ، حم السجدۃ : ۶ - ۷

۲۶ ، ابن ہشام - السیرۃ النبویۃ - قاہرہ ۱۳۵۶ھ - ج ۱ ص ۳۵۹

۲۷ ، ابن کثیر - ج - ۴ - جز ۲۴ - ص ۱۶

۲۸ ، سہ ماہی فکر و نظر - اسلام آباد شمارہ شوال - ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ ص ۱۵

۲۹ ، ابن ہشام ، ج - ۲ - ص ۱۱۸

۳۰ ، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی - اسلام اور جدید معاشی نظریات لاہور ۱۹۸۶ء - ص ۱۱۰

۳۱ ، النساء : ۱۱

۳۲ ، الروم : ۳۹

۳۳ ، البقرہ : ۲۷۶

۳۴ ، البقرہ : ۲۷۸ تا ۲۸۰

۳۵ ، ابن کثیر - ج - ۱ - جز ۳ - ص ۲۷ تا ص ۳۱

۳۶, Syed Abdul Quddus Social Change in Pakistan. Lahore - 1990 - P-103

۳۷ ، الحشر - ۷

اسلام میں قرضِ حسنہ کی حیثیت

مولانا مبشر احمد جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

قرض کے لغوی معنی

قرض "اِقْرَاضٌ" سے ماخوذ ہے۔ قرض دینا۔[1]
باب ضَرَبَ سے قَرَضَ یَقْرِضُ۔ کسی کو بدلہ دینا۔ باب سَمِعَ سے۔ مرجانا۔[2]

۲ : القرض هو القطع فی اللغة سمی هذا العقد قرضا لما فیه قطع طائفة من ماله۔[3]

ترجمہ : قرض کا معنی ہے علیحدہ کرنا اور اسکو قرض اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں بھی مال کا ایک حصہ علیحدہ کیا جاتا ہے

۳ : (هو) لغة ما تعطیه لتتقاضاه[4]

ترجمہ :- وہ مال جس کو تو واپسی کی شرط کے ساتھ دیتا ہے۔

قرض کی شرعی تعریف

هو عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی

---

[1] لغات القرآن ، ج اوّل ، ص ۱۸۶ - [2] المنجد اردو ، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی - [3] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ، مطبوعہ مصر ، ج ۷ ، ص ۳۹۵ - [4] حاشیہ ردالمحتار علی الدر المختار ، ج ۴ ، ص ۱۷۹ -

لایخولیرد مثلہ [۱]

یعنی قرض وہ خاص معاملہ ہے جس میں مُقرِض (قرض دینے والا) مُستَقرِض (قرض لینے والے) کو ایسا مال دیتا ہے جس کی ہم مثل موجود ہے تاکہ اس سے وصولی کے وقت اس جیسی چیز وصول کر سکے۔

۲ : وہ احسان یا عطیہ جو پہلے کیا جائے یا وہ مال جو مقررہ میعاد کے بعد واپسی کی شرط سے دیا جائے۔ [۲]

قرض اور دَین میں فرق

دَین عربی میں عین کے مقابلے میں آتا ہے۔ نقد کے لئے عین اور ادھار کے لئے دَین بولا جاتا ہے۔ اور اس سے مقصود کاروبار اور لین دین میں ادھار کا معاملہ کرنا ہے۔ خواہ قیمت ادھار ہو یا چیز ادھار ہو۔

۲ : الدَّین ما وجب فی الذمۃ بعقد او استھلاک [۳]

ترجمہ :- دَین وہ مال ہے جو کسی کے ذمہ عقد (بیع و شراء) کے سبب لازم ہوا ہو یا کسی کا مال ہلاک اور ضائع کر دینے کے سبب لازم ہوا ہو۔

اور قرض یہ ہے کہ ایک کا دوسرے سے صَرف اور خرچ کے لئے مال مثلی لینا۔ جیسے نقد روپے لینا، گندم لینا، اس شرط پر کہ اسی جیسا واپس کرے گا۔ مال دینے والا مُقرِض اور لینے والا مُستَقرِض اور مال قرض کہلاتا ہے۔

قرض میں قبضہ شرط ہے، دَین میں قبضہ شرط نہیں۔ دَین میں مدت مقرر کی جاتی ہے قرض میں مدت مقرر نہیں کی جاتی۔

لزم تاجیل کل دین ان قبل المدیون [۴]

ترجمہ :- ہر دین میں مدت مقرر کرنا لازم ہے بشرطیکہ مدیون اس کو قبول کرے۔

۲ : قرض میں قانونی نقطہ نظر سے دو باتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک حیثیت میں قرض عاریت

---

[۱] حاشیہ رد المحتار علی الدر المختار : ج ۴ ، ص ۱۷۹ ۔ [۲] المنجد ، ص ۷۹۳ ۔ [۳] رد المحتار علی ھامش الدر المختار للشیخ محمد امین المشہور بابن عابدین : ج ۴ ، ص ۱۴۶ ۔

[۴] ...

ہوتا ہے کیونکہ اس میں دوسرے سے ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور دوسری حیثیت سے اس میں معاوضہ کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ کیونکہ مال حفاظت کیخاطر نہیں بلکہ واپسی کی خاطر لیا گیا ہے اور مقصد قرض کے ذریعہ قرض دار کی ضرورت کو پورا کرنا ہے

قرضِ حسنہ کی تشریح

قبل اس کے کہ قرض کے احکام تحریر کئے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ کے عنوان (قرضِ حسنہ) کی وضاحت کر دی جائے کہ کتاب وسنت میں قرضِ حسنہ کے کیا معانی ہیں۔

۱ : مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ [۱]

ترجمہ :- کون ہے جو اللہ تعالےٰ کو اچھا قرض دیتا ہے پس اللہ تعالےٰ اس کو بڑھائے گا اور اسے اچھا بدلہ دے گا۔

۲ : اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَہُمْ وَلَہُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ۔ [۲]

ترجمہ :- بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور قرض دو اللہ تعالےٰ کو قرض اچھا دوگنا کیا جائے گا ان کے لئے اور ان کو اچھا بدلہ دیا جائے گا۔

۳ : وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ھُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا وَّاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۳]

ترجمہ :- اور اللہ تعالےٰ کو اچھا قرض دو اور جو مال تم اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجتے ہو اس کو اللہ تعالےٰ کے پاس پاؤگے وہ بہتر اور بڑے اجر کی چیز ہے اور اللہ تعالےٰ سے بخشش طلب کرو بے شک اللہ تعالےٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

---

[۱] پ ۲۷، آیت ۱۱، رکوع ۱۸ - [۲] پ ۲۷، آیت ۱۸، رکوع ۱۸ - [۳] پ ۲۹، س مزمل آیت ۲۰-

۴ : لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ [۱]

ترجمہ :- اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اللہ تعالےٰ کو قرض حسنہ دو تو میں تمہارے گناہوں کو مٹا دوں گا۔ اور تمہیں باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

۵ : اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ [۲]

ترجمہ :- اگر تم اللہ تعالےٰ کو اچھا قرض دو تو وہ تمہارے لئے اس کو دگنا کرے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تعالےٰ قدر دان اور بردبار ہے۔

یہ وہ آیات ہیں جن میں قرض حسنہ کی ترغیب اور فضیلت بیان ہوئی ہے اب سوال یہ ہے کہ قرض حسنہ سے کیا مراد ہے ؟ تو شیخ محمد بن احمد القرطبی اپنی مایۂ ناز تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

فیہ ثلاثۃ اوجہ احدھا انہ یرید سائر الصدقات ثانیھا یرید اداء الزکوۃ علی احسن وجہ وھو اخراجھا من الطیب الاموال و اکثرھا نفعا للفقراء و ابتغاء وجہ اللہ و الصرف الی المستحق و ثالثھا یرید کل شئ یفعل من الخیر مما یتعلق بالنفس والمال [۳]

ترجمہ :- اس میں تین توجیہات ہیں۔ ۱ :- اس سے مراد تمام صدقات ہیں۔
۲ :- اس سے مراد زکوٰۃ کو اچھے طریقے سے ادا کرنا ہے اور اچھا طریقہ یہ ہے کہ حلال

---

[۱] پ ۶ : رکوع ۱۶ : آیت ۱۲ - [۲] پ ۲۸ : آیت ۱۸ : تغابن - [۳] القرطبی : ج ۱۶ ص ۱۱۴-

مال سے ادا کرے اور جس سے فقراء کو زیادہ نفع ہو وہ مال دے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے دے اور مستحق پر خرچ کرے۔

۳۔ ا۔ اس سے مراد ہر نیک عمل ہے خواہ وہ نفس کے ساتھ ہو یا مال کے ساتھ۔

۴۔ ا۔ شیخ محمود آلوسیؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرضِ حسنہ کا معنی ہے بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا۔ اور بعض نے کہا صدقِ دل کے ساتھ اور صدقات نافلہ جس چیز سے بھی ہو۔ پس وہ استعارہ ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے ثواب اور جزاء کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کو قرض کے ساتھ تشبیہ دیا ہے اس لئے کہ وہ اس کی مثل بدلہ دے گا۔ اور قرضِ حسنہ وہ ہوتا ہے جو خوش قلبی کے ساتھ مال خیرات کیا جائے۔ اور بعض نے کہا جس کے بعد احسان جتانا، اور تکلیف پہنچانا نہ ہو۔ اور بعض نے کہا جو حلال مال سے صدقہ دیا جائے وہ قرضِ حسنہ کہلاتا ہے۔[۱]

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

خدا کو قرض دینے سے مراد اس کے دین اور اس کے پیغمبروں کی حمایت میں مال خرچ کرنا ہے۔ جس طرح روپیہ قرض دینے والا اس امید پر دیتا ہے کہ اس کا روپیہ واپس مل جائے گا اور قرض لینے والا اس کے ادا کرنے کو اپنے ذمہ لازم کر لیتا ہے۔ اسی طرح خدا ہی کی دی ہوئی چیز یہاں اس کے راستہ میں خرچ کی جائے گی وہ ہرگز گم یا کم نہیں ہوگی۔ حق تعالیٰ نے کسی مجبوری سے نہیں محض اپنے فضل و رحمت سے اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے کہ وہ تم کو عظیم الشان نفع کی صورت میں واپس کر دے۔ اور قرضِ حسنہ سے مراد یہ ہے کہ اخلاص سے دو اور اپنے محبوب اور مرغوب اور پاک و صاف مال میں سے دو۔[۲]

زکوٰۃ اور قرضِ حسنہ میں فرق

زکوٰۃ کا ادا کرنا قانونی طور پر ضروری ہے لیکن قرضِ حسنہ سے مقصود ہے دین کی برتری اور رفاہِ عام کے

---

[۱] تفسیر روح المعانی ، ج ۶ ، ص ۸۸ - [۲] افاداتِ شیخ الاسلام رح بحوالہ تفسیر معالم القرآن مطبوعہ سیالکوٹ ، ج ۶ ، ص ۳۷۹ -

سارے اجتماعی کاموں کے لئے انفرادی ذمہ داری کے ساتھ اجتماعی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ وقت کے ملی تقاضوں اور مطالبات کو پورا کرنے کے لئے رضا کارانہ طور پر اپنے ملکی سرمایہ سے کچھ وقف کرنا تاکہ جماعتی مقاصد کو پورا کیا جا سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال کی متعینہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی ایک مسلمان دین کے مالی مطالبات سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ اور اب بھی اس کی دولت میں حق باقی رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کے اخلاقی احساسات معاشرے کی بھوک اور ناداری پر قابو نہ پا رہے ہوں یا دین کی حفاظت اور نصرت کا فرض ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ایسی حالت میں قرضِ حسن یقیناً اخلاقی سے قانونی شکل اختیار کر لے گا اور اس دفعہ کی رو سے اسلامی حکومت مجاز ہوگی کہ وہ غریب اور نادار شہریوں کی ضرورتوں اور دین کے مفاد کی خاطر مال داروں پر مزید بار ڈالے۔

فقہاء کی اصطلاح میں جس چیز کو فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کہا جاتا ہے اسی کو ہم نے قانونی اور اخلاقی ذمہ داری سے تعبیر کیا ہے۔ زکوٰۃ ان کے یہاں فرضِ عین ہے تو قرضِ حسن فرضِ کفایہ [1]

بقا اور فناء کا فلسفہ

یا یوں تعبیر کر لیجئے کہ قرضِ حسنہ انسانیت کی بقاء کا پیش خیمہ ہے کیونکہ یہ ایک سخاوت ہے جو دل کی شجاعت اور حوصلہ کی بلندی چاہتی ہے طبیعت میں بے نیازی پیدا کرتی ہے دوسروں کی ضرورتوں کا احساس، ان کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا سخاوت اور جود و کرم کی اصل روح ہے۔ یہ روح کار فرما ہوتی ہے تو ہمدردی، غم خواری، رحم اور خدمتِ خلق کے جوہر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یعنی انسانیت کا جوبن نکھرتا ہے، شرافت کا علم بلند ہوتا ہے، میل ملاپ اور محبت کی فضا ہموار ہوتی ہے، سخاوت اگر کار فرما ہو تو طبقاتی جنگ کی نوبت نہیں آتی۔ کیونکہ دولت مند طبقہ ہمدرد اور غمگسار ہوتا ہے اور غریب و نادار اس کے وفادار و جاں نثار ہوتے ہیں اور اس طرح ایک نظم و ضبط پیدا ہو جاتا ہے جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہوتا ہے جو معاشرہ اور سماج کو اطمینان کی دولت

---

[1] تفسیر معالم القرآن، ج ۶، ص ۳۷۸، تفسیر معارف القرآن، ج ۳، ص ۷۹ -

بخشتا ہے جس میں ایک دوسرے سے نفرت اور بغض نہیں بلکہ محبت اور باہمی اعتماد کی نعمت میسر آتی ہے۔ اور جب محبت اور اعتماد و تعاون کی کلیاں چٹختی ہیں تو معاشرہ اور سماج رواداری اور شریفانہ اخلاق کا گلدستہ بن جاتا ہے۔ یہی تہذیب بہیمیت اور حیوانیت کو کچلتی ہے اور شرافت و آدمیت کو سربلند کرتی ہے جس سے رب العالمین کی نیابت و خلافت کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ اور دنیائے پرمحن جنت نشان بن جاتی ہے [1]

سخاوت کے مقابل میں بخل ہے۔ جو طمع، تنگ نظری، خود غرضی، بزدلی، بے رحمی سنگدلی، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، رشوت، خیانت اور سود جیسے زہریلے جراثیم پیدا کرتا ہے جو انسانوں کی معیشت کو تباہ کرتے ہیں۔ اور ان کی خوش حالی کے لئے اژدہا بن جاتے ہیں۔

سرمایہ ختم کیا جائے یا بخل

اسلام اس حقیقت سے آنکھ بند نہیں کرتا کہ دولت صرف ایک مہمل ایک آلہ ہے اصل چیز دولت نہیں بلکہ عمل اصل ہے۔ چشمۂ شیریں کے پانی سے آپ لالہ زار کو شاداب کرکے سنبل و ریحان کے تختے اور خیابان بھی تیار کرسکتے ہیں اور خارستان کے خار دار جھاڑیوں کو بھی دھار دار اور نوکیلے بنا سکتے ہیں۔ نتیجہ کا تعلق آپ کے عمل سے ہے۔ اصلاح یہ نہیں کہ پانی کو خشک کردیں۔ یا لالہ زار کی بجائے کسی خندق میں بہائیں۔ اصلاح یہ ہے کہ کانٹوں سے نفرت دلائیں اور گل و غنچہ کی محبت بڑھائیں۔ اسلام اصلاح کی یہی صورت پیدا کرتا ہے کہ وہ جود و سخا کے گلشن اور چمن کو زکوٰۃ، خیرات، صدقات، قرض حسنہ اور وقف سے آبیاری کرتا ہے اور انسانیت کی بقا و حفاظت کے وہ لازوال ذرائع و اسباب مہیا کرتا ہے کہ انسانیت، حیوانیت سے ملکوتیت کے جوہر کے ساتھ آراستہ اور پیراستہ ہو جاتا ہے۔ تو گویا قرض حسنہ انسانی معیشت کے لئے ایک پل ہے اس کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کی منزل مراد پا سکتے ہیں۔

قرآن حکیم اسی نقطہ کو سامنے رکھتا ہے اور فنا و بقا کے فلسفہ کو ذہن نشین کرلے کے اس

---

[1] دور حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل، ص ۱۱۰

حقیقت کا یقین پیدا کراتا ہے کہ دولت کا بقا تجوریوں میں بند کرنے اور زمین دوز خزانوں میں دفن کرنے سے نہیں بلکہ اس کے بقا کی صورت یہ ہے کہ اس پر انفاق فی سبیل اللہ کا عمل زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔ بینک بیلنس آپ کا کتنا ہی زیادہ ہو اس سے آپ کو قوت حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی آپ کا سرمایہ محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ اس بچت کو ایسے بینک میں محفوظ کرایا جائے جس کا محافظ حقیقی نگران ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللهِ بَاقٍ۔ (النحل : ع ۱۳)۔

جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

فی سبیل اللہ بینک

آپ بینک میں رقم ڈیپازٹ کراتے ہیں کہ رقم محفوظ رہے اور اس کا انٹرسٹ (سود) آپ کو ملتا رہے لیکن ڈیپازٹ رقم آپ کی کب تک ہے۔ اپنی دانست میں آپ نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا کہ زندگی کا بیمہ کرا دیا۔ مگر کیا بیمہ قضاء و قدر کے فیصلہ میں کوئی تبدیلی کر سکتا ہے؟

عدالت نے کسی کو دیوالیہ قرار دے دیا ہے تو وہ کسی وقت دولت مند بن بھی سکتا ہے لیکن جس کو قضاء و قدر نے دیوالیہ قرار دے دیا جو دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہوا وہ کبھی دولت مند نہیں بن سکتا۔ البتہ اگر آپ نے قرآن حکیم کے اصول پر اپنی زندگی کا بیمہ کرا لیا تو آپ کی دولت پر کبھی زوال نہیں آ سکتا۔ یہ دولت دن بدن بڑھتی ہی رہے گی۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا۔ [۱]

ترجمہ :- اور جو آگے بھیجو گے اپنے واسطے کوئی نیکی اس کو اللہ کے پاس پاؤ گے اللہ تعالیٰ کے پاس بہتر بدلہ اور زیادہ اجر ہے۔

ڈیپازٹ رقم پر آپ کو دس فیصد سود ملتا ہے لیکن جو رقم آپ فی سبیل اللہ بینک میں جمع کراتے ہیں اس کے نفع کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

---

[۱] مزمل ، ع ۲ ، پ ۲۹۔

قرآنِ حکیم کی وضاحت یہ ہے کہ جو رقم آپ فی سبیل اللہ کے بینک میں جمع کراتے ہیں اس کو صرف کھاتہ میں درج نہیں کر دیا جاتا بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کو تخم بنا کر ایک زرخیز کشت زار میں بو بھی دیا جاتا ہے ۔ زرخیز زمین ایک گیہوں کی نال پر سات بالیں آجاتی ہیں۔ اور ایک ایک بال میں سو سو دانہ ہوتے ہیں تو ایک دانہ سے سات سو دانہ بن جاتے ہیں ۔ یعنی انٹرسٹ (نفع) ستر ہزار فیصد ہو جاتا ہے [۱]

لیکن یہ شرط ہے کہ دولت مند جو امداد کرے اس میں خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو۔ یہاں تک کہ اس کو کبھی زبان پر بھی نہ لائے جس سے غریب اور ضرورت مند کو کمتری کا احساس ہو یا کوئی ذہنی اور دماغی کوفت ہو۔

دنیا کے دوسرے نظاموں سے موازنہ

گفتگو بہت طویل ہوگئی اب دنیا کے دوسرے نظاموں سے موازنہ بھی کیجئے ۔

۱ :۔ سرمایہ داری کا دشمن اسلام بھی ہے اس کو سرمایہ داری سے انتہائی نفرت ہے مگر وہ سرمایہ داری کو اس لحاظ سے اچھا بھی سمجھتا ہے کہ اس میں انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے اور وہ سرمایہ دار اللہ کو بہت پسند ہے جو اپنے سرمایہ سے غریب نادار، مزدور طبقہ لوگوں کی معیشت کو سنبھالا دیتا ہے اور اپنے سرمایہ میں حق سائل اور محرومین کو ادا کرتا ہے ۔ ارشاد ربانی ہے ۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [۲]

ترجمہ :۔ اور ان کے سرمایہ میں مانگنے والے اور محروم طبقہ لوگوں کے لئے حق معلوم ہے ۔

۲ :۔ ایسے تمام پروگرام اسلام کی نظر میں ناقابل برداشت ہیں جن سے امیر اور غریب میں طبقاتی جنگ یا باہمی نفرت پیدا ہو۔ اسی لئے وہ سرمایہ کو کسی نہ کسی شکل میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے ۔ زکوٰۃ، خیرات، قرضِ حسنہ، وقف، ہدیہ وغیرہ ۔

۳ :۔ انسان کو اپنی حقیقت اور فنا و بقا کا فلسفہ یاد کرا کر سرمایہ دار اور دولت مند کو یقین

---

[۱] بقرہ : ع ۳۶ ‏$\frac{۲}{۲۶۱}$ - [۲] المعارج : ع ۱ : پ ۲۹ -

دلاتا ہے کہ غریب اور ضرورت مند کی امداد خود اس کی اپنی امداد ہے۔ یعنی اس کا نفع دوسروں سے زیادہ خود اس کو پہنچ رہا ہے۔

مالی نظام کے اسلامی اصول

۱:۔ سورت مزمل نبوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ پہلے حصہ میں فرعونیت (ملوکیت) کے مقابلے کا ذکر ہے۔ دوسرے حصہ میں احکام یعنی نماز، زکوٰۃ اور قرضِ حسنہ کا۔ اس میں خداپرستی کا صرف ایک حکم ہے نماز پڑھو۔ لیکن دولت کے متعلق دو حکم ہیں۔ زکوٰۃ اور قرضِ حسنہ۔

۲:۔ سورۃ علق کے پہلے حصہ میں آغاز وحی کا ذکر ہے دوسرے حصہ کا پہلا فقرہ ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰیٓ ۔ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی

یعنی بے شک انسان حد سے نکل رہا ہے اس پر کہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ مستغنی (دولت مند) ہو گیا ہے۔

۳:۔ سورت مدثر سب سے پہلی سورت ہے جس میں آپؐ کو دعوت و تبلیغ کی ہدایت دی گئی۔ اس میں یہ حکم ہے کہ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ کسی پر اس غرض سے احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ حاصل کرنا مقصود ہو۔ یعنی معاوضہ کے حاصل کرنے کے لئے کسی پر احسان نہ کرو۔

۴: مکی سورتوں میں سورۃ البلد کا مطالعہ فرمائیے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ [۱]

ترجمہ:۔ آپ کو معلوم ہے گھاٹی کیا ہے جس سے گزرنا مشکل ہوتا ہے۔ کوئی گردن چھڑانا (یعنی غلام خرید کر آزاد کرنا، یا مقروض کا قرض ادا کر دینا) یا کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی مٹی میں ملنے والے مسکین کو۔

---

[۱] البلد: پ ۳۰: آیات ۷ تا ۱۶۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو آنکھوں اور کانوں اور زبان والا اس لئے بنایا ہے کہ وہ ہر ضرورت مند کی امداد کرے خواہ عزیز و قریب ہو یا اجنبی ۔

۵ :۔ سورۃ الھمزۃ بھی مکی دور کی سورت ہے یہ پوری سورت سرمایہ داری کے خلاف اس شدت سے گرج رہی ہے کہ انقلاب پسندوں کے تمام لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی ۔

ترجمہ :۔ تباہی اور بربادی ہے ہر اس شخص کے لئے جو اپنی دولت اور سرمایہ کے زعم میں دوسروں کو طعنہ دیتا ہے ، ان میں عیب نکالتا ہے ۔ جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال سدا رہے گا ، ہرگز نہیں ۔ یقین رکھو ایسی آگ میں ڈالا جائے گا کہ اس میں جو کچھ پڑے وہ اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے ۔ آپ کو کچھ معلوم ہے وہ توڑنے پھوڑنے والی آگ کیا ہے ؟ وہ اللہ کی آگ ہے جو سلگائی گئی ہے ، جو دلوں تک پہنچے گی اور ان پر بند کر دی جائے گی لمبے لمبے ستونوں میں ۔ [1]

۶ :۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حرم کعبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے مجھے آتے دیکھا تو فرمایا ۔

ھم الاخسرون و رب الکعبۃ یوم القیمۃ

رب کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ سب سے زیادہ خسارہ میں رہیں گے ۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ الفاظ سنے تو لرز گیا ۔ مجھے خوف ہوا کہ شاید یہ میرے بارے میں نازل ہوا ہے ۔ میں نے عرض کیا آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں کن کے متعلق یہ ارشاد ہو رہا ہے ؟

فرمایا کہ وہی جن کے پاس دولت زیادہ ہے ۔ پھر ہاتھ پھیلا کر دائیں بائیں ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرمایا ۔ اس خسارے سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہو سکتے ہیں جو اس طرح دونوں ہاتھ بڑھا کر سامنے دیتے ہیں ، دائیں دیتے ہیں ، بائیں دیتے ہیں [2]

---

[1] الھمزہ : ۱۰۴ ، پ ۳۰ ۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلہ ، ج ۲ ، ص

بہر حال اسلام جس کو قرض کہتا ہے اس کا اثر تو یہ ہوتا ہے کہ دولت مند کی ابھری ہوئی سطح پست ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس قرض میں کبھی پوری دولت کا بھی مطالبہ ہو جاتا ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ [۱]

آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں ؟ آپ فرما دیں جو کچھ افزود ہے سب خرچ کر دو۔

اس سے غریب کی غربت ختم ہوتی ہے اور حاجت مند کی حاجت پوری ہوتی ہے۔ اور پسماندہ طبقہ پروان چڑھتا ہے۔ لیکن سرکاری قرضوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو جاتا ہے۔ صاحب دولت کی دولت خدا کے نام پر خزانہ سے نکل کر گردش کرے گی تو ظاہر ہے دولت مند کو اس دولت سے دنیا میں کچھ فائدہ حاصل ہو گا تو عوام اور غریب طبقہ کو بہت فائدہ ہو گا وہ یہ کہ ان کی اقتصادی سطح بلند ہو جائے گی۔ اس طرح امیری اور غریبی کے درمیان مسافت اعتدال پر آجائے گی۔

اس لئے اللہ تعالےٰ نے بندوں سے قرض حسنہ مانگا ہے۔ تا کہ اس کے سب بندے سکون و چین کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اور اللہ تعالےٰ نے بندوں پر خرچ کو اپنے نفس پر خرچ سے تعبیر فرمایا ہے۔

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ قیامت میں ایک شخص سے فرمائیں گے۔ اے بندۂ خدا میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ میں ننگا تھا تو نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ میں بیمار تھا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی ؟ وہ شخص کہے گا اے اللہ تعالےٰ تو تو ان چیزوں سے پاک ہے۔ تو جواب ملے گا۔ تیرے پاس میرا فلاں بندہ بھوکا آیا تھا اس نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو کھانا نہ دیا۔ اگر تو اس کو کھانا دیتا تو گویا مجھے کھانا دیتا۔ اگر اس کو کپڑا دیتا تو گویا مجھے کپڑا دیتا وغیرہ وغیرہ [۲]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ کے بندوں پر خرچ کرنے کو اللہ تعالےٰ نے اپنے نفس سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسی کا نام قرض حسنہ رکھا ہے اور قرض کا معاوضہ اپنے ذمہ لازمی

---

[۱] بقرہ ، آیت ۲۱۸ - [۲] مسلم شریف ، الحث علی الصدقۃ ، ج ۱ ، ص ۳۲۷ -

کیا ہے ۔ اس قرض سے عوام کی ضرورت پوری ہو رہی ہے ، ان کی سطح بلند ہو رہی ہے ۔ اور اہلِ ثروت کا اخلاقی فرض ادا ہو رہا ہے ۔ خود غرضی اور سنگدلی کی بجائے آپس میں محبت ہمدردی اور احترام کے جذبات بڑھ رہے ہیں ۔

اسبابِ فرمانروائی و محبت

محبت روحانی تعلیم سے پیدا ہوتی ہے ۔ ماں باپ کی محبت فطری ہوتی ہے لیکن سماج اور معاشرے کا ہر ایک فرد دوسرے کا ماں باپ نہیں ہوتا ۔ اس میں برابر کے بھائی بہن بھی ہوتے ہیں ۔ اور ایسے اجنبی بھی ہوتے ہیں جن سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا ۔ یا اگر ہوتا ہے تو بہت دور کا ہوتا ہے ۔ محبت اور انسیت ثمرہ ہوتا ہے احسان کا ، نتیجہ ہوتا ہے لطف و کرم کا ، ایثار و قربانی کا داد و دہش اور سخاوت کے پودوں پر محبت کے پھول کھلا کرتے ہیں ۔ ہدیہ و تحفہ کی ڈالیوں پر عنایت و شفقت کے غنچے چٹخا کرتے ہیں ۔

لیکن اس طرح کے سماج کی تشکیل و تخلیق میں جو چیز بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے وہ انفاق ہے یعنی اپنی دولت کو خرچ کرنا ۔ اور یہی خرچ دوسرے کو متاثر کرتا ہے ۔ اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر جب دوسرے کی ضرورت کو مقدم سمجھا جائے تو اس کا ثمرہ جذبہ شکرگزاری ہو گا جو شکرگزار جاں نثار بھی ہو سکتا ہے ۔ اور احسان کرنے والا قدرتی طور پر فرمانروا بھی بن جاتا ہے ۔ الانسان عبد الاحسان ۔ انسان احسان کا بندہ ہے ۔

خسارہ پورا کرنے والا آمدنی کا ایک مدّ

قرضِ حسنہ آمدنی کی ایک ایسی مد ہے جس سے ملک کے بجٹ کا خسارہ پورا کیا جا سکتا ہے ہر سال ملک میں خسارے کے بجٹ کا اعلان ہوتا ہے مگر قرضِ حسنہ ایک ایسی اسلامی دفعہ ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے منافع کا بجٹ پاس ہوا کرے گا ۔ سورۃ انفال ؛ آیت ۶۰ ۔ سورۃ محمدؐ ؛ آیت ۳۸ ۔ سورۃ بقرہ ؛ آیت ۱۹۵ ۔ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قرضِ حسنہ دیتے ہیں دس گنا سے بھی زیادہ بڑھا دیتے ہیں ۔ اب بتایئے آمدنی جب دس گنا سے زائد بڑھ جائے گی تو خسارہ کیسے ہو گا ؟

ہماری حکومتیں بھی قرض لیتی ہیں جن کا سود بھی ادا کرتی ہیں مگر اس قرض کا بوجھ ملک کے غریب عوام جو ٹیکس دینے والے ہوتے ہیں ان پر پڑ جاتا ہے۔ جن سے عوام کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے اور زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ ۔ البقرہ

ترجمہ :۔ اللہ تعالےٰ سود سے برباد کرتا ہے اور صدقات سے ترقی دیتا ہے۔

ایک مثال جن صحابۂ کرام علیہم الرضوان نے ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں انفاق فی سبیل اللہ کیا۔ ان کو اللہ تعالےٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق دنیا میں پورا پورا بدلہ دیا۔ اور آخرت میں تو ملے ہی گا۔ مثلاً حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ابتدائی حالت یہ تھی کہ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ تعالےٰ عنہا اونٹ کے چارے اور چولہے کے سوختے کے لئے بار دو تین میل دور سے اپنے سر پر رکھ کر لایا کرتی تھیں۔ مگر تیئس سال بعد جب وہ شہید ہو گئے تو ان کا ترکہ پانچ کروڑ سے زیادہ کا تھا جو قطعاً جائز اور پاک آمدنی سے حاصل ہوا تھا۔ جب کہ وہ تمام غزوات میں پیش پیش رہے تھے۔ اور کروڑوں روپے راہِ خدا میں خرچ کئے تھے۔ [1]

اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ صدقاتِ واجبہ کو قانونی طور پر وصول کرے اور اخلاقی طور پر ملک کے سرمایہ دار طبقہ کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دے۔

دولت کا اندازہ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کون شخص اتنی قدرت کا مالک ہے کہ وہ قرضِ حسنہ سے ملکی خسارے کو پورا کر سکتا ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صاحبِ نصاب لوگ جب سالانہ ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ دیتے ہیں تو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا کل اثاثہ چالیس ہزار ہوگا۔

اب اگر اس انتالیس ہزار میں سے دو چار ہزار مزید ملک و ملت کی خدمت کر دیتا ہے تو ملک کا اقتصادی بحران خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ ملک کے سرمایہ دار پر قومی اور ملی حق بھی ہے

---

[1] بخاری شریف : ص ۴۴۱ و ۴۴۲ ۔

کیونکہ وہ اس ملک کے دیگر مفادات سے مستفید ہو رہا ہے۔ نیز حُبّ الوطن من الایمان "وطن کی محبت ایمان کا تقاضہ ہے" کے تحت ایسا ہر شخص کو کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی ضروریات سے افزودہ اور فاضل رقم قرضِ حسنہ کے طور پر ملک وملت پر صرف کرے۔ [1]

قرضِ حسنہ کے شعبے زکوٰۃ کے علاوہ صدقات کی اسلامی اصطلاح اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اسلام دولت مند کو زکوٰۃ دینے کے بعد بھی قومی و اجتماعی انفاق کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ انفاق کے لئے دوسری راہیں بھی کھولتا ہے۔ اور ان کو صدقات اور قرضِ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ صدقات کی یہ ذمہ داری دو حصوں پر تقسیم کی گئی ہے۔ ایک انفرادی یعنی کسی متمول فرد کا کسی حاجت مند کی حاجت روائی کے لئے بطورِ خود انفاق کرنا۔

دوسرا اجتماعی یعنی زکوٰۃ کی طرح قوم کی اجتماعی اقتصادی حالت کی بہتری اور حاجت مندوں کی حاجت کے انسداد کے لئے بذریعہ حکومت خرچ کرنا۔ مثلاً صدقہ فطر، غریب والدین کا نفقہ، غریب اولاد کا نفقہ، جہاد اور رفاہِ عام کے اہم مواقع میں بیت المال کے علاوہ فنڈ کی فراہمی وغیرہ۔

اس مقام کی وضاحت میں بعض کم علم لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ مسلمان دولت مند طبقہ پر زکوٰۃ یا صدقۃ الفطر کے علاوہ (انفاق) کا کوئی شرعی مطالبہ عائد نہیں کرتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور جس نے بھی ایسا کیا ہے قلت تدبیر کی بنا پر کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما کی تصریح ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بعض حقوقِ مالی غنی کے ذمہ واجب ہیں۔ فرماتے ہیں۔

فی مالك حق سوى الزكوة وصح عن الشعبي وغيره [2]

تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔

---

[1] دورِ حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل : از مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ ، ص ۲۲۸

[2] اسلام کا اقتصادی نظام ، ص ۳۱۱ ؛ از مولانا حفظ الرحمٰن ؒ ، مطبوعہ ادارہ اسلامیات ، لاہور

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقالہ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس صدی کے مفکر اسلام مانے گئے ہیں جن کی شخصیت ہر طبقہ و فرقہ میں غیر متنازعہ ہے فرماتے ہیں۔

"غور کرو بلاشبہ عقل و حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان یہ طریقہ لازمی اور ضروری ہونا چاہیئے کہ اہل قبیلہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور دردمندی اور بہی خواہی کا ثبوت دیں اور ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا ذاتی نفع او نقصان سمجھیں اور یہ بات ایسی جبلت اور خلقت کے بغیر ناممکن ہے جس کی پشت پر اس کو مضبوط بنانے کے لئے خارجی اسباب اور اس کو محفوظ رکھنے کے لئے سنت متوارثہ موجود ہو۔ یہاں جبلت تو اس علاقہ کا نام ہے جو باپ اور بیٹے یا مثلاً بھائی بھائی کے درمیان موجود ہے۔ اور اسی طرح دو یا چند عزیزوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ اور اسباب خارجی باہمی الفت و مودت، رہنمائی، غمگساری، ہمدردی وغیرہ کا نام ہے۔ کیونکہ یہ امور آپس میں محبت پیدا کرتے اور مصائب و آلام میں ایک دوسرے کی اعانت و بصیرت کے لئے بہادر بناتے ہیں۔ اور سنت ان امور کو کہتے ہیں جن کو شریعت کی زبان لوگوں میں رشتۂ اخوت پیدا کرنے کے لئے ضروری قرار دیتی ہے۔ اور اس کے نہ کرنے پر قابل ملامت ٹھہراتی ہے۔ مثلاً وہ حکم دیتی ہے کہ صلہ رحمی ضروری ہے اور ایسا نہ کرنے والا آثم اور گنہگار ہے۔

اگر کوئی شخص ان عمدہ صفات سے بغاوت کرتا ہے تو حکمرانوں کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ ان اخلاقی امور کی نگرانی کرے۔"[1]

اب شعبوں کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

قرض حسنہ کا ایک شعبہ وراثت و ترکہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے ورثار اور قرابت داروں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۱۷۔

کی معاشی حالت مضبوط ہوتی ہے ۔ارشاد نبوی ہے ۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بیمار ہوا فتح مکہ والے سال ۔اور مرنے کے قریب ہو گیا ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کو تشریف لائے ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا مال بہت ہے اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے ۔تو کیا میں اپنے سارے مال کی راہِ خدا میں وصیت کر جاؤں ؟ فرمایا نہیں ۔ پھر میں نے کہا کیا دو ثلث مال کی وصیت کروں ؟ آپ نے فرمایا نہیں ۔ کیا نصف مال کی وصیت کروں ؟ فرمایا نہیں ۔ کیا ایک تہائی وصیت کروں ؟ فرمایا تہائی کافی ہے ۔اور تہائی بھی بہت ہے ۔اس کے بعد فرمایا ۔

انّك ان تذر ورثتك اغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس انك لن تنفق نفقة الا اجرت فيها حتى اللقمة ترفعها الى فى امراتك [1]

ترجمہ :۔ البتہ ورثاء کو غنی بنا کر چھوڑنا بہتر ہے اس سے کہ وہ تنگ دست رہ کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں ۔اہلِ حقوق پر جو بھی تو خرچ کرے گا تجھے اس کا اجر ملے گا ۔یہاں تک کہ اگر ایک لقمہ تو اپنی بیوی کے منہ میں لے جائے گا تو تجھے اس کا بھی بدلہ اور اجر ملے گا ۔

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ورثاء کے لئے مال کو چھوڑ جانا بہت بڑے اجر کا باعث ہے ۔ نیز متعدد مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض رشتہ دار بہت مفلس اور تنگ معیشت والے ہوتے ہیں جب کوئی دوسرا رشتہ دار فوت ہوتا ہے اور اس کا مالِ وراثت تقسیم ہوتا ہے تو وہ بہت بڑے سرمایہ دار ہو جاتے ہیں ۔ اور ان کی معاشی حالت بہت بہتر ہو جاتی ہے ۔

---

[1] ترمذی شریف اردو ؛ ج اوّل ؛ ص ۷۷۵ ۔

اوقاف

قرضِ حسنہ کے شعبوں میں سے ایک شعبہ وقف بھی ہے۔ وقف کی حکمت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی پیدا کردہ یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت اپنی ضروریات سے فاضل سمجھتا ہے لیکن دولت کی محبت اور سرمایہ کی فراہمی کا عشق اس کو حاجت مندوں کی اعانت اور جماعت سے غریب افراد کی امداد کی جانب کسی طرح متوجہ نہیں ہونے دیتے اور وہ دولت کو بڑھاتا ہی جاتا ہے۔ لیکن جب اس کا آخری وقت آتا ہے اور وہ موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آکر مغلوب ہو جاتا ہے تو حسرت اور یاس کے ساتھ اس دولت سے منہ موڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام کہتا ہے کہ موت کے فولادی پنجہ سے قبل اپنی محبوب دولت میں سے کچھ خدا کے نام پر دے جانا چاہیئے تاکہ صدقہ جاریہ رہے۔ چنانچہ قرآن عزیز میں اس قسم کے انفاق اور جماعتی افادیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون [۱]

ترجمہ:۔ تم ہرگز خیر اور بھلائی کو پہنچ نہیں سکتے جب تک خدا کی راہ میں اس چیز کو خرچ نہ کرو، جو تمہارے لئے سب سے پیاری اور محبوب ہے۔

اور داعی انقلاب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کی تشریح اس طرح فرمائی ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا مات الانسان انقطع عنہ عملہ الا من ثلثۃ الا من صدقۃ جاریۃ او علم ینتفع بہ او ولد صالح یدعولہ [۲]

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے تمام عمل ختم ہو جاتے ہیں مگر تین مستثنیٰ ہیں۔ ایک صدقہ جاریہ، دوسرا علم نافع، اور تیسرا نیک اولاد، جو اس کے لئے دعاگو رہے۔

---

[۱] پ ۴، ع اول، آل عمران۔ [۲] مشکوٰۃ شریف، ج اول، ص

صدقہ جاریہ کی جس قدر جزئیات علماء اسلام نے شمار کرائی ہیں ان سب میں وقف اعلیٰ اور مقدم ہے ۔ اور اسی لئے سب سے قبل متمول صحابہ کرام رضہ نے اس ترغیب پر لبیک کہا اور ملکیت کو وقف کرکے خدا تعالےٰ سے اجر کے طالب ہوئے ۔ مثلاً حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ مدینہ کے سب سے زیادہ مال دار تھے ۔ ان کا سب سے زیادہ محبوب مال بیرحا (کھجوروں کا باغ) تھا ۔ مسجد نبوئ کے قریب تھا انہوں نے یہ باغ وقف کیا اور کہا کہ میں اللہ تعالےٰ سے اجر اور اس کے ذخیرۂ خیر کا طالب ہوں ۔ نیز حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ارضِ خیبر کی جاگیر اللہ کے نام پر وقف فرمائی ۔

وقف کا حکم — وقف شدہ جاگیر کسی کی ذاتی پراپرٹی نہیں رہتی بلکہ رفاہ عام کا ایک قائم و دائم سرمایہ بن جاتا ہے [۱]

وقف کی اقسام — وقف کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وقفِ اہلی ۔ (۲) وقف خیری ۔ وقف اہلی یعنی اولاد پر یا قرابت داروں کے لئے وقف ہو ۔ اس میں اولاد اور اقرباء اور جمیع امور خیر شامل ہوتے ہیں ۔ اور وقف خیری میں صرف امور خیر ہی کے لئے وقف کیا جاتا ہے ۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا وقف اہلی میں شمار کیا گیا ۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا وقف وقف علی الخیر کی قسم میں رکھا گیا [۲]

ہبہ — قرضِ حسنہ کے شعبوں میں سے تیسرا شعبہ ہبہ ہے ۔ اجتماعی معاشی نظام میں ہبہ بھی ایک مفید طریق کار ہے ۔ بشرطیکہ واہب کا مقصد نیک ہو اور کسی کی حق تلفی بھی نہ کر رہا ہو ۔

ہبہ میں اگرچہ فقیر یا حاجت مند کی شرط نہیں بلکہ غنی کو بھی ہبہ کیا جاسکتا ہے مگر اسلام کے معاشی نظام میں صرف اسی شق کا اعتبار ہوتا ہے جس میں غرباء اور حاجت مندوں کی حاجت کا انسداد ہو ۔ حدیث شریف میں ہبہ کی ترغیب دیتے ہوئے یہ حکمت بیان فرمائی گئی ہے کہ ہدیہ اور ہبہ کی عادت ڈالو اس سے باہمی محبت اور مودت مستحکم ہوتی ہے ۔

---

[۱] ردالمختار ، ج ۳ ، ص : کتاب الوقف ، جامع الاصول ، ج ۲ ، ص ۱۷۷ ۔ [۲] جامع الاصول ، ج ۲ ، ص ۲۷۳ ۔

تہادوا تحابوا[1] ۔ آپس میں ہدیہ لیا دیا کرو آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے ۔

فقہ اسلامی میں ہبہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔

ہبہ کی تعریف ـــ وہ کسی شئی کو دوسرے کی ملکیت میں بغیر عوض کے دے دینا ۔ جو کہ قرض حسنہ کی اصطلاحات میں سے ہے ۔

حدیث شریف میں اس کی حکمت معاشی وسائل میں اضافہ بتائی گئی ہے ۔ ارشاد ہے کہ اگر سوال اور انتظار کے بغیر ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مالی بھلائی کرتا ہے تو اس کو قبول کر لینا چاہیئے اور رد نہ کرنا چاہیئے ۔ اس لئے کہ یہ رزق ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس بہانہ سے اس کے لئے مقرر کیا ہے ۔[2]

بہرحال ہبہ میں بھی اسی صورت کو ترجیح دی گئی ہے جو نیک نیتی سے حاجت مندوں پر ہو ۔

وصیّت ـــ قرض حسنہ کا چوتھا شعبہ وصیت ہے انسان اپنی زندگی کے لمحات میں موت کی حقیقت سے آگاہ ہونے اور مسلسل مشاہدہ کرتے رہنے کے باوجود اکثر حقوق واجبہ و نافلہ سے غافل رہتا ہے ۔ لیکن جب یقین ہو جاتا ہے کہ پنجۂ موت نے دبا لیا ہے تب اضطرابی کیفیت کے ساتھ تلاش کرتا ہے کہ کیا اب بھی مکافات کی کوئی شکل ہے تو اس سے بہتر کوئی صورت اسے نظر نہیں آتی کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے کہ مرنے کے بعد تا قیامت اس کا اجر ملتا رہے ۔ لہذا اس عمل کا نام وصیت ہی ہے ۔

وصیت کی تعریف ـــ کسی شئی کو یا اس کے منافع کو بہ طریق حسن سلوک یہ کہہ دینا ، یا لکھ دینا کہ میری موت کے بعد فلاں کے لئے میری اتنی جائیداد یا مال وصیت ہے ۔ غرض وصیت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ سے ایک متمول اپنی آخری لمحات حیات میں بطور تبرّع اور حسن سلوک غرباء اور اہل حاجات کو مالی فائدہ پہنچا دیتا ہے ۔ اور

---

[1] مسند ابویعلی ، از جامع الصغیر ، جلد ۱ ، ص ۴۵۴ ۔ [2] سعیدیات حصہ دوم ، ص ۱۳ بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام ، ص ۳۲۴ ۔

بسا اوقات اس طریق کار سے اہم اور ضروری اجتماعی کام بخوبی انجام پاتے ہیں۔
اس میں بھی یہی شرط ہے کہ موصی غربا۔ و ضرورت مند طبقہ کو ترجیح دے اور کار خیر میں وصیت کرے۔

عاریت کسی شخص کا اپنی ملکیت کے منافع کو بغیر معاوضہ کے دوسرے کی ملک بنا دینا اسلامی نقطۂ نظر سے عاریت کہلاتا ہے۔

وابجتمعت الامۃ علی جوازھا واستحبابھا واستحسانھا لما فیھا من اجابۃ المضطر واغاثۃ الملھوف۔ [1]

ترجمہ :۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ عاریت نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اس لئے کہ اس میں مضطر اور نادار کی حاجت روائی اور اعانت ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ضرورت کی ہر شئ ہر شخص کے پاس نہیں ہوتی اور وہ بھی انسان میں جو قوت خرید نہیں رکھتے۔ پس اگر ان کی اعانت کا یہ طریقہ جو عاریت کی شکل میں پیش آتا ہے معاشی نظام کا حصہ نہ بنے اور اس کو رائج کرنے کے لئے اقدام نہ کیا جائے تو باہمی معاشی تعاون کا ایک ضروری حصہ معدوم ہو جائے۔ قرآن کریم میں ان انسانوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو ایسے مضطر اور نادار کی اعانت اور امداد سے باز رہے اور اپنی چیز کو عاریت پر دینے سے گریز کرتے ہیں۔
ارشاد ربانی ہے۔ ویمنعون الماعون ترجمہ :۔ اور ان کے لئے بھی ہلاکت ہے جو برتنے کی چیز کو عاریت پر نہ دیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے۔

من کان فی عون اخیہ کان اللہ فی عونہ [2]

جو شخص اپنے بھائی کی امداد میں ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی امداد میں ہوتا ہے۔

امانت ایک شخص اگر نقدی یا مال کسی دوسرے شخص کے پاس امانت رکھتا ہے اور امین کو اجازت دیتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ تصرف کرسکتا ہے تو یہ بھی ایک

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام ؛ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رح ، ص ۳۲۷ [2] مشکوٰۃ شریف ، ج ۲ ، ص ۴۲۲ ۔

اعانت ہے اور حاجت مند کی حاجت کو پورا کرنا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس کے افادی پہلو کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ الامانۃ غنیٰ۔ یعنی امانت ایک قسم کی رفاہیت ہے۔ اور مشہور محدث ابن اثیر رح نے نہایہ میں اس جملہ کی یہ تشریح فرمائی ہے کہ امانت امین کی رفاہیت کا باعث بنتی ہے اس لئے کہ جب اس کی امانت داری کی شہرت ہوگی لوگ کثرت سے اپنے مال کو اس کی امانت میں رکھنے کا اقدام کریں گے اور جب اس کو تصرف کی اجازت مل جائے گی تو یہ اس کی رفاہیت اور فراخی معیشت کا سبب بن جائے گی[1]

خلاصہ

مذکورہ صورتیں انسانی کفالت کی بہترین صورتیں ہیں۔ جب کہ یہ سب کام ملکی و ملی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور جذبۂ خدمتِ خلق کے طور پر کئے جائیں۔

اسلام میں قرضِ حسنہ کی حیثیت بھی یہی ہے جیسے کہ قرضِ حسنہ کی تعریف سے ظاہر ہے کہ ایک دولت مند کسی ضرورت مند کی ضرورت کے انسداد اور اس کی حاجت روائی کے لئے اس طرح اپنی رقم سے فائدہ پہنچائے کہ اس کا کوئی بدل اس سے حاصل نہ کرے۔ اور چونکہ یہ اخلاقی مسئلہ ہے اس لئے احادیث میں قرض خواہ کو قرضدار کی دعوت قبول کرنے سے احتیاط کا حکم دیا گیا ہے۔ تاکہ عوض خواہی کا قطعاً سد باب ہو جائے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ قرض دار اس لئے قرض خواہ کی دعوت کرتا ہو کہ وہ اپنے قرض کا جلد مطالبہ نہ کرے اور اس حالت میں یہ بھی ایک قسم کا ربوٰ ہو جائے گا۔ اِلّا یہ کہ دونوں کے درمیان اس معاملہ سے قبل بھی اس قسم کے تعلقات قائم ہوں۔ اور چونکہ اس معاملہ میں قرض دار کی جانب سے بد دیانتی اور وفاءِ عہد کے فقدان کا زبردست خطرہ ہے اس لئے اس قسم کی اعانت کو واجب نہیں کہا گیا بلکہ خدا تعالےٰ کے انعام و اکرام کے وعدوں کے ساتھ صرف اخلاقی ترغیب ہی پر اکتفاء کیا گیا۔ اور ساتھ ہی قرضدار کو سخت تنبیہ کی گئی کہ قرضِ حسن کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدرتِ ادا کے باوجود دوسرے کی رقم ہضم کر جائے یا تاخیر کر کے قرض دہندہ کو نقصان پہنچائے۔

ارشادِ نبوی ہے۔ مطل الغنی ظلم[2] ترجمہ :- دینے کی قدرت کے باوجود،

---

[1] نہایہ، ج اوّل، باب امانت بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۳۲۹۔ [2] بخاری شریف۔

دوسروں کے حق مطالبہ کی ادا میں تاخیر ظلم ہے۔

اَلدَّیْنُ مَقْضِیٌ ۔ ترجمہ :۔ قرض کی بروقت ادا فرض ہے۔

عمل الیہ ما اخذت حتی تودی ۔

ترجمہ :۔ جو کسی نے کسی سے چیز لی ہے جب تک ادا نہ کرے اس کا بارِ ادا، اس پر برابر قائم ہے [۱]

قرضِ حسنہ کی علتِ غائی

قرآن مجید کی آیات جن کا ترجمہ سطور بالا میں گزر چکا ہے بار بار مطالبہ کیا گیا اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کہ اللہ تعالےٰ کو قرضِ حسنہ دو اور اس کا مصرف عباد اللہ کو بنایا گیا۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرضہ مانگ کر اپنے بندوں پر صرف کرنے کا حکم کیوں دیا ؟ ایسا کیوں نہ کر دیا کہ وہ اپنے سب بندوں کو دولت مند بنا دیتا اور سب کا رزق فراخ کر دیتا۔

۱ :۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ بندوں کے ہاتھوں سے بندوں کو دلوا کر انسانیت کا مفہوم سمجھا رہا ہے کہ انسانیت انس و محبت کا نام ہے اور انس و محبت کے اظہار کی یہی شکل ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ داد و دہش کا معاملہ کیا جائے۔

۲ :۔ نیز ارشاد نبویؐ ہے۔

الانسان کالبنیان یشد بعضہ بعضا۔ [۲]

ترجمہ :۔ انسان کی مثال عمارت کی سی ہے جس طرح عمارت میں ایک اینٹ دوسری کو مضبوط کرتی ہے تو اسی طرح ایک انسان تب ہی انسان بن سکتا ہے جب کہ وہ دوسرے انسان کے ہاتھ مضبوط کرے۔

۳ :۔ المومن کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی عینہ اشتکی کلہ واذا اشتکی رأسہ اشتکی کلہ۔ [۳]

---

[۱] اسلام کا اقتصادی نظام : ص ۳۲۶ - [۲] مشکوٰۃ شریف : ج دوم : ص ۴۲۲

[۳] مشکوٰۃ شریف : ج دوم : ص ۴۲۲ -

ترجمہ :- سب مومن ایک جسم کی مانند ہیں جب اس کی آنکھ کو درد ہوتا ہے تو سارے جسم کو درد محسوس ہوتا ہے ۔ اور جب سر کو درد ہوتا ہے تو اس کے سارے بدن کو درد ہوتا ہے ۔

اسی طرح انسان مومن کہلانے کا حق دار تب ہی ہوگا جب کہ دوسرے مسلمان کی تکلیف اور حاجت کو اپنی تکلیف اور حاجت سمجھے ۔ اور اس کی تکلیف و حاجت کو ایسے ہی دور کرے جیسے اپنی حاجت و تکلیف کو دور کرتا ہے ۔

احساسِ فرض

یہ حکم دے کر انسان کو احساسِ فرض دلایا گیا ہے کہ انسانیت رحمدلی ہمدردی، کا نام ہے ۔ نہ کہ سنگدلی اور بربریت کا ۔ انسانیت خیر خواہی اور برابری کا نام ہے نہ کہ بد خواہی اور جبر و تکبر کا ۔

نیز دولت و ثروت جمع و ذخیرہ کے لئے نہیں بلکہ صَرف و خرچ کے لئے ہے اور اس کا مصرف صرف ذاتی و انفرادی تعیّش نہیں بلکہ اجتماعی ضروریات کی کفالت ہے ۔ مال کی گردش جمیع طبقہائے انسانی کی حیات کا ذریعہ ہے اور احتکار و اکتناز (جمع کرنا) باعث تباہی و بربادی ارشاد ربانی ہے ۔

وَاَنْفِقُوا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۔ [1]

ترجمہ :- اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو ۔

(یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے رکنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے) ۔

حقیقی قرض کے احکام

چونکہ ہمارے مقالے کے عنوان میں لفظِ "قرض" ایک جزو ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حقیقی قرض کے احکام بھی تحریر کر دیئے جائیں ۔ قرضِ حسنہ کو تو استعارۃً قرض سے موسوم کیا گیا ہے حقیقی قرض تو یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو مالِ مثلی واپسی کی شرط کے ساتھ دیتا ہے ۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ قرض کی لغوی اور اصطلاحی تعریف آغازِ مقالہ میں ذکر کر دی گئی ہے ۔ اب بقیہ احکام ذکر کئے

---

[1] البقرۃ

جاتے ہیں۔

رکن قرض اما رکنہ فہو الایجاب والقبول والایجاب قول المقرض اقرضتک ہذا الشئ او خذ ہذا الشئ قرضا او نحو ذلک والقبول ہو ان یقول المستقرض استقرضت او قبلت الخ [۱]

ترجمہ:۔ قرض کا رکن ایجاب اور قبول ہے۔ ایجاب یہ ہے کہ مُقرِض (قرض دینے والا) کہے کہ میں نے تجھے یہ چیز قرض دی یا یہ چیز بطورِ قرض لے۔ اور قبول یہ ہے کہ مُستَقرِض (قرض لینے والا) کہے میں نے قرض لیا یا میں نے قرض قبول کیا۔

لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ان الرکن فیہ الایجاب واما القبول فلیس برکن وجہ ہذہ الروایۃ ان الاقراض اعارۃ والقبول لیس برکن فی الاعارۃ۔ [۲]

ترجمہ:۔ قرض میں رکن صرف ایجاب ہے قبول رکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِقراض (قرض دینا) اعارہ (کوئی چیز مانگنا) ہے۔ اور اعارہ میں قبول رکن نہیں ہے۔

شرائطِ قرض شرائط قرض مختلف ہیں۔ بعض کا تعلق مقرِض (قرض خواہ) کے ساتھ ہے اور بعض کا مستقرِض (قرض دار) کے ساتھ اور بعض کا نفسِ قرض کیساتھ۔

اما الذی یرجع الی المقرض فہو اہلیۃ للتبرع۔

ترجمہ:۔ وہ شرائط جو قرض خواہ کے ساتھ متعلق ہیں پس وہ اہلیتِ تبرّع ہے۔

یعنی قرض وہی شخص دے سکتا ہے جو دوسرے پر احسان کرنے کا اہل بھی ہو۔ کیوں کہ قرض بھی تبرّع ہے اس لیئے کہ اس میں فوراً عوض اور بدلہ مطلوب نہیں ہوتا۔ لہذا قرض دینے

---

[۱] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۱ ج ۷ ، ص ۳۹۴۔

[۲] " " " " " "

کا بھی وہی اہل ہو گا جو تبرّع کا اہل ہے ۔ مثلاً وصی، صبی (بچہ) عبد ماذون (جس غلام کو تجارت کی اجازت دی گئی ہو) مکاتب (جس کی آزادی مال کے ساتھ مشروط ہو) یہ تبرّع کے اہل نہیں ہیں ۔ لہٰذا یہ کسی کو قرض دینے کے اہل بھی نہ ہوں گے ۔

واما الذی یرجع الی المستقرض ھو القبض و ذلک بالتسلیم الی المستقرض لہ[1]

ترجمہ :- وہ شرائط جن کا تعلق قرضدار کے ساتھ ہے وہ قبضہ کرنا ہے ۔ اور قبضہ تب ہو گا جب وہ مال مستقرض کو سپرد کر دیا جائے ۔ یعنی اس قرض کے مال پر قرض خواہ قبضہ بھی کرے تب وہ قرض دار شمار ہو گا ۔

۲ :- ومنھا ان یکون ممالہ مثل کالمکیلات والموزونات والعددیات المتقاربۃ ۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ قرض مثلی چیز سے ہو جیسے مکیلات (وہ اشیاء جو ناپی جاتی ہیں ۔ یا موزونات (وہ اشیاء جو تولی جاتی ہیں) یا عددیات (وہ اشیاء جو گنی جاتی ہیں) کیونکہ اگر وہ چیز مثلی نہ ہو گی تو اس کا واپس کرنا مشکل ہو جائے گا ۔ نیز قیمت دینا بھی مشکل ہو گا ۔ کیونکہ اشیاء کے تفاوت سے قیمت میں تفاوت ہوتا ہے ۔ اور اس طرح معاملہ نزاع تک پہنچے گا ۔

اسی بناء پر امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ فرماتے ہیں روٹی کو قرض پر لینا جائز نہیں ہے ۔ (یعنی یوں کہنا کہ مجھے ایک روٹی آج قرض دو کل میں واپس کر دوں گا) ۔ کیونکہ روٹی چھوٹی بڑی ہوتی ہے ۔ نیز آٹے میں بھی فرق ہوتا ہے ۔ اس میں بھی نزاع کا امکان ہے ۔ لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ عدداً روٹی کے قرض کو جائز رکھتے ہیں عرف عام کی بنا پر کہ عوام ایسے فرق کو محسوس نہیں کرتے ۔[2]

مسئلہ ۲ :- اخروٹ اور انڈے قرض لے سکتے ہیں اور فلوس (پیسے) بھی قرض

---

[1] بدائع الصنائع ، ج ۷ ، ص ۳۹۵ ۔ [2] ایضاً ۔

لے سکتے ہیں۔ اگر پیسے کھوٹے ہو گئے تو ان کی مثل دیئے جا سکتے ہیں۔

واما الذی یرجع الی نفس القرض فھو ان لا یکون فیہ جر منفعۃ نحو ما اذا اقرضہ دراھم غلۃ علی ان یرد علیہ صحاحا او اقرضہ وشرط شرطا لہ فیہ منفعۃ لما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ نھی عن قرض جر نفعا۔ [1]

ترجمہ :۔ وہ شرائط جن کا تعلق نفس قرض کے ساتھ ہے وہ یہ ہے کہ اس میں فائدہ حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص نے کسی کو کھوٹے درہم قرض دیئے اس شرط پر کہ وہ کھرے درہم واپس کرے گا۔ یا اس کو قرضہ دیا اور اس کے نفع میں کچھ حصہ مقرر کیا۔ نبی علیہ السلام نے ایسے قرض سے منع کیا ہے جسمیں نفع حاصل کرنا مقصود ہو۔

کیونکہ یہ زیادتی مشروطہ سود کے مشابہ ہو گا۔ اور سود حرام ہے۔

والتحرز عن حقیقۃ الربا أو عن شبھۃ للربا واجب۔

حقیقی سود اور مشابہ بالسود (جو چیز سود کے مشابہ ہے) سے بچنا واجب ہے۔

مسئلہ اگر قرضہ میں نفع مشروط نہ ہو اور نہ ہی قرض خواہ کی خواہش ہو۔ مگر قرضدار اپنی طرف سے ادائیگی قرض عمدہ چیز سے کر دیتا ہے تو اس کا کوئی حرج نہیں بلکہ یہ چیز مندوب ہے۔ کیونکہ نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے خیار الناس احسنھم قضاءً۔ سب سے بہتر شخص وہ ہے جو ادائیگی قرض عمدہ طریقے سے کرتا ہے۔

نیز ارشاد نبوی ہے۔

عند قضاء الدین لزمہ للوازن زن راجح۔ [2]

ادائیگی قرض کے وقت آپ ﷺ نے تولنے والے سے فرمایا کہ ذرا جھکتا وزن کر۔

مسئلہ قرض میں مدت کی تعیین بھی نہیں ہوتی۔ خواہ شرط لگائیں یا نہ لگائیں بخلاف

---

[1] بدائع : ج ۷ ، ص ۳۹۵۔ [2] ایضاً

باقی دیون کے۔ کیونکہ قرض ایک قسم کا تبرّع اور احسان ہے۔ اور تبرع میں تاجیل مدت نہیں ہوتی۔ نیز قرض عاریت کے قائم مقام ہے۔ والاجل لا یلزم فی العواری۔ اور مانگی ہوئی اشیاء میں مدت لازمی نہیں ہوتی۔

مسئلہ ہاں ایک اور صورت ہے جس میں مدت متعین ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شخص وصیت کرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد ایک سال تک فلاں شخص کو ایک ہزار روپیہ قرض دے دینا۔ اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی۔ اور اس شخص کو وہ قرضہ اس کے مال میں سے دیا جائے گا۔ اور اس کے ورثاء ایک سال سے قبل اس قرضہ کا مطالبہ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

قرض کا حکم

واما حکم القرض فہو ثبوت الملک للمستقرض فی القرض للحال۔ [1]

قرض کا حکم یہ ہے کہ قرضدار اس چیز کا فوراً مالک ہو جائے گا اور اس کو اس میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو گا۔

مثلاً ایک شخص نے کسی سے ایک بوری گندم قرض لی یا ایک لاکھ روپیہ قرض لیا تو اب اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ اور جب ادا کرے تو اس کی مثل دوسری گندم یا رقم دے سکتا ہے۔ اگر وہی چیز بھی پڑی ہو تب بھی دوسری چیز اس کے مثل دے سکتا ہے۔ اس مسئلہ میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ قرض پر صرف قبضہ کرنے سے آدمی مالک نہیں ہوتا جب تک اس کو استعمال نہ کر لے یا ہلاک نہ کر دے۔ لہٰذا اگر وہی چیز موجود ہے تو ادائیگی قرض کے وقت وہی اصلی چیز واپس کرنی ہوگی۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اقراض کو اعارۃ کہتے ہیں۔ اور اعارۃ میں وہی چیز واپس کرنی ہوتی ہے۔ ہاں اگر ہلاک ہو جائے تو ضمان ہوتی ہے۔[2]

مسئلہ بیس آدمیوں نے ایک شخص سے قرضہ مانگا لیکن قبضہ ایک شخص نے کیا۔ تو یہ شخص سب کی طرف سے وکیل ہو گا۔ لہٰذا ادائیگی سب پر اپنے اپنے حصہ کی ہوگی قرضخواہ

---

[1] بدائع ، ج ۷ ، ص ۳۹۶ - [2] ایضاً ردالمحتار ، ج ۴ ، ص ۱۸۱ تا ۱۸۳-

صرف ایک شخص سے مطالبہ نہیں کرسکتا۔

مسئلہ وفیہا استقراض العجین وزنا یجوز وینبغی جوازہ فی الخمیرۃ بلا وزن سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن خمیرۃ یتعاطاھا الجیران أیکون ربا فقال مارأہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وما رأہ المسلمون قبیحا فھو عند اللہ قبیح ۔ [1]

ترجمہ :۔ آٹا قرض لینا تول کر جائز ہے اور گوندھا ہوا آٹا بھی قرض لیا جاسکتا ہے بلا وزن ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ پڑوسی ایک دوسرے سے گوندھا ہوا آٹا قرض لے لیتے ہیں تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ آپ نے فرمایا جس کو مسلمان اچھا سمجھتے ہیں اللہ تعالےٰ کے نزدیک بھی حسن ہے۔ اور جس کو مسلمان برا سمجھیں اللہ تعالےٰ کے نزدیک بھی قبیح ہے "

دَین کے احکامات

گذشتہ صفحات میں قرض اور دَین میں فقہی فرق تحریر کیا جاچکا ہے مگر عام اصطلاح میں قرض اور دَین مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ قرض اور دَین ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ دَین اور قرض میں عموم، خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ دَین عام ہے، قرض خاص ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔

یغفر للشہید کل ذنب الا الدین [2]

ترجمہ :۔ قرض کے سوا شہید کے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

اس حدیث میں ہر قسم کا قرض شامل ہے مالی ہو یا نقدی، تجارتی ہو یا غیر تجارتی۔ اور اکثر باتوں میں دَین اور قرض مساوی شرائط رکھتے ہیں۔ جو احکام دَین کے ہیں وہ قرض کے بھی ہیں۔ دَین کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ [3]

---

[1] ردالمحتار، ج ۴، ص ۱۸۳۔ [2] مشکوٰۃ، ج اول، ص ۔ [3] البقرہ، پ ۳، ع ۶، آیت ۲۸۲۔

ترجمہ :۔ اے اہلِ ایمان جب لین دین میں ایک مقررہ مدت کے لئے ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

تشریح

اس مکمل آیت میں قرض داروں اور قرض خواہوں کو نزاع سے بچانے کے لئے یہ ہدایات دی ہیں

— اوّل :۔ جب کسی قرض کا لین دین بقیدِ مدّت ہو تو اس کی دستاویز لکھ لی جائے
— دوم :۔ دستاویز لکھنے والا انصاف سے لکھے۔
— سوم :۔ لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے۔
— چہارم :۔ اگر قرض لینے والا کم عقل یا ضعیف ہو تو اس کا ولی اس کام کو سرانجام دے۔
— پنجم :۔ معاملہ پر دو گواہ ضرور بنانے چاہئیں۔
— ششم :۔ یہ دو گواہ مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔
— ہفتم :۔ گواہ مسلمان ہوں بالغ ہوں پسندیدہ اخلاق کے مالک ہوں۔
— ہشتم :۔ گواہ گواہی دینے سے گریز نہ کریں۔
— نہم :۔ ادھار کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی ضرور دستاویز لکھنی چاہیئے۔
— دہم :۔ کاتب یا گواہ کو عاقدین کوئی ضرور پہنچانے کی کوشش نہ کریں وہ تو اجتماعی خدمت انجام دیتے ہیں۔

حصولِ ملکیت کے چار ذرائع

۱ :۔ اوّل یہ کہ قیمت بھی موجود ہو اور مبیع بھی موجود ہو۔ اس کو تجارت حاضرہ کہتے ہیں۔ یہ بالاتفاق جائز ہے۔

۲ :۔ نہ قیمت موجود ہو اور جس چیز کو خریدا جا رہا ہے وہ موجود ہو۔ یہ بالاتفاق ناجائز ہے۔
۳ :۔ قیمت موجود مگر چیز موجود نہ ہو۔
۴ :۔ چیز موجود ہو، قیمت موجود نہ ہو۔

ان دونوں صورتوں میں

۱ :۔ یہ کہ دستاویز لکھ لی جائے۔ ۲ :۔ مدت مقرر کر لی جائے اور میعاد بھی واضح ہو

مبہم نہ ہو۔ تاریخ۔ماہ۔سن۔یوم۔کی وضاحت کردی جائے ورنہ نزاع کا خطرہ ہے۔

دستاویز لکھانا قرضدار کی ذمہ داری ہے

دستاویز کا ماحصل کسی حق کا اپنی طرف اقرار کرنا ہے۔ یہ اسی کو کرنا چاہیئے جس کے ذمہ کوئی حق واجب الادا ہے۔ یہاں دو شخص ہیں ایک لینے والا، دوسرا دینے والا۔ لینے والا من علیہ الحق۔ اور دینے والا من لہ الحق ہے۔ یا لینے والا مدیون، اور دینے والا دائن ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ قرض خواہ تحریر لکھ کر رکھتا ہے، قرض دار کو پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ ع

یہ الٹی ہی گنگا عجب چل رہی ہے

۲:- دستاویز لکھواتے وقت خوفِ خدا بھی پیشِ نظر رہے۔کہیں کمی بیشی نہ کردی جائے۔

کتابت کی افادی حیثیت

جن معاملات میں لکھنے کا عرف ہو اس کے لکھنے میں کسی قسم کی کاہلی اور سستی نہ کرنی چاہیئے۔ یہ اسلام کی اقتصادیات کا ایک اہم اور بنیادی قاعدہ ہے۔ معاملاتی فساد، افراد کے اخلاقی اور روحانی ارتقاء میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اس صورت میں فرد کی اخلاقی ترقی کے مواقع کم ہوجاتے ہیں۔ بعض روحانی مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں معاشی اور اقتصادی طاقت کا انحصار افراد کے ہاتھوں میں ہو اس طرح کی روحانی و اصلاحی تدابیر بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن مجید میں کتابت کی افادیت اجاگر کی گئی ہے۔

۱:- أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی اللہ کے نزدیک یہ زیادہ انصاف والی بات ہے۔ یعنی ایک کا حق نہ دوسرے کے پاس جائے گا اور نہ آئے گا۔ اور کتابت کی راہ سے عدل وانصاف کو پروان چڑھنے کا موقع ملے گا۔

۲:- أَدْنٰىٓ أَلَّا تَرْتَابُوٓا۔ یعنی اس میں شک کا امکان کم رہے گا۔گویا اہلِ معاملہ کا جی صاف رہے گا۔

۳:- اقوم للشہادۃ ۔ گواہی زیادہ محکم اور پائیدار رہے گی۔ اور گواہی آسان رہے گی۔

رہن اور قرض اگر سفر میں قرض اور ادھار کا معاملہ کرنا ہو۔ اور کوئی کاتب نہ ملے تو قرض کے عوض کوئی چیز مدیون کو اس کے پاس رکھ دینی چاہیئے۔ چونکہ سفر میں قرض کی زیادہ حاجت رہتی ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں سفر کی قید لگائی گئی۔ مگر یہ قید اتفاقی ہے۔ جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ جس طرح رہن سفر میں جائز ہے اسی طرح حضر میں بھی جائز ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھن مقبوضۃ [1]

ترجمہ:۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ ملے تو اس صورت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز رہن رکھ کر اس کا قبضہ دے دیا جائے۔

نیز معاملہ رہن کے لئے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو صرف اس صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک صورت ممکن ہے کہ جب دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے پر آمادہ نہ ہو تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے لے۔ لیکن قرآن حکیم چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دیتا ہے اور یہ بات بلند اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیئے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیئے ہوئے مال کے معاوضہ میں شئی مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل نہیں۔ یا اس کا کرایہ کھاتا ہے تو دراصل سود کھاتا ہے۔ قرض پر براہِ راست سود لینے اور رہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔

مسئلہ راہن اگر دیوالیہ ہو جائے اور اس کے سرمایہ میں مرہونہ چیز کے سوا کچھ نہ ہو تو یہ مرتہن ہی کا حق ہو گا۔ باقی قرض خواہوں کو اس میں مداخلت کی اجازت نہ دی

---

[1] بقرہ : پ ۳ ، ع ۷۔

جائے گی۔ ہاں اگر مرہون کو فروخت کرنے کے بعد مرتہن کا قرض ادا ہو کر کچھ بچ جائے تو اس کو باقی قرض خواہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

قرض کو رہن نہیں رکھا جا سکتا

رشید کے دو ہزار روپے بذمہ حمید قرض ہیں۔ رشید ان دو ہزار کو رہن رکھ کر کوئی چیز لینا چاہے، یہ بھی بالاتفاق نا جائز ہے کہ قرض جب تک قرض ہے اس کا قبضہ نہیں مل سکتا۔ قبضہ دَین نہیں عین میں ہوتا ہے۔ اس لئے قرض رہن نہیں رکھ سکتا۔

قرض اور ہدیہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس قرض سے منع فرمایا جو نفع آور ہو اور نفع کو سود قرار دیا ہے۔ اسی بنیاد پر قرض خواہ کو قرضدار سے ہدیہ قبول کرنے سے بھی روکا گیا ہے۔ چنانچہ اس پر حافظ ابن القیم رح نے سنن ابن ماجہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ جس میں یحیٰ بن اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو کچھ پیسے قرض دیتا ہے۔ اور قرض دار کچھ سوغات و ہدیہ ہمیں روانہ کر دیتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ جب تم کسی کو قرض دو اور قرض دار تمہیں ہدیہ یا سواری پیش کرے تو قبول نہ کرو۔ ہاں اگر پہلے سے تمہارے تعلقات ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔

نیز صحیح بخاری میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو بردہ کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ پہنچا تو عبد اللہ بن سلام سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے کہا، آپ تو ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں سودی کار و بار عام ہوتا ہے اگر آپ کا کسی کے ذمہ کوئی قرض ہو اور وہ آپ کو انجیر، جَو وغیرہ پیش کرے تو ہرگز نہ لینا کیونکہ یہ سود ہے [1]

---

[1] اغاثۃ اللھفان، ج ۱، ص ۲۶۲، حافظ ابن القیم الجوزیہ۔ معالم القرآن، ج ۳ ص ۳۶۲، مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی مدظلہ۔

قرض اور سود

وہ قرض جو ضروریاتِ زندگی اور غیر کاروباری اغراض کے لئے لئے جاتے ہیں اس پر تو سود لینا الم نشرح ہے یعنی سب حرام اور ظلم سمجھتے ہیں لیکن کاروباری اغراض کے لئے قرض لینے پر سود کو جائز سمجھا جاتا ہے ۔ اس لئے ہم اس مسئلے کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ قرض پیداواری ہو یا غیر پیداواری ، اغراض زندگی میں صَرف کر دیا گیا ہے یا کاروبار میں لگا دیا گیا ، سب پر سود لینا حرام ہے ۔ اس میں حکمت و وجہ یہ ہے کہ کاروبار میں نفع اور نقصان دونوں کا امکان رہتا ہے ۔ جب سرمایہ کا کاروبار میں لگنا لازماً نفع کے لئے نتیجہ خیز نہیں تو یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ اس سرمایہ پر بہر صورت ایک متعین نفع کا مطالبہ کیا جائے ۔ نفع آوری سرمایہ کی ذاتی اور لازمی صفت نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو جس کاروبار میں سرمایہ لگایا جاتا ، ضرور نفع ہوتا ۔ مگر ایسا کبھی بھی نہیں ہوا ۔ نفع کا انحصار آمدنی پر ہے نہ کہ پیداوار کی مقدار پر ۔ یہ پیداوار بازار میں فروخت ہو سکے گی یا نہیں ، کس قیمت پر فروخت ہو گی اور مجموعی لاگت کے مطابق نفع کتنا ہو گا ، اس کی کوئی خبر نہیں ہے لہذا اس پر سود لگانا بھی غیر معقول ہو گا ۔

اس صورتِ حال پر غور کیجئے کہ جب کاروبار میں خسارہ ہوا ہو ایک طرف تو قرضدار کو قرض کی واپسی کا انتظام کرنا ہے اور دوسری طرف کاروباری خسارہ کو بھی پورا کرنا ہے ۔ اس پر ہم مزید سود کا بھی بوجھ لاد دیں تو یہ ظلم ہو گا ۔

مجھے بتائیے کہ کیا ایسی صورت میں قرض خواہ اپنے قرض کے مطالبہ سے رک جاتا ہے یا نہیں یا اپنے قرض کی مقدار میں کمی کرتا ہے ؟ تو جواب نفی میں ملے گا ۔ لہذا قرض دار کو جب نفع ہوتا ہے جو کہ اس کی رات دن کی سعی و جد و جہد کا ثمرہ ہے تو اس ثمرہ میں بھی کسی کو شریک ہونے کا حق نہیں پہنچتا ۔ قرض چونکہ تبرع و احسان ہے اس لئے اس احسان کی جزاء رب ذوالجلال خود دیں گے ۔

ولا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذیٰ (البقرہ)

ترجمہ :۔ اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر بیکار نہ کرو ۔

نفع کمانے کے بارے میں اصولی حقیقت

ہاں نفع ونقصان میں شراکت ہو تو پھر قرض کا نفع بھی لیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ شرط لگائی جائے کہ نفع ہوگا تو نفع میں بھی برابر کا شریک ہوگا اور اگر نقصان ہو تو نقصان میں بھی برابر کا شریک ہوگا تو قرض کا نفع لے سکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فائدہ نقصان اٹھانے کی ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہے"

یہ حدیث ابو داؤد میں ہے۔

ایک دوسری حدیث ترمذی، نسائی، ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک ہی معاملہ میں ادھار لینا اور تجارتی سودا کرنا جائز نہیں۔ نہ ایک تجارتی معاملہ میں دو مختلف شرطیں کرنا درست ہے اور نہ اس چیز کا نفع لینا درست ہے جس کے نقصان کی ذمہ داری تم نے نہ لی ہو۔ اور ایسی چیز کی فروخت بھی صحیح نہیں جو تمہارے پاس نہ ہو [۱]

قرض پر سود کے معاشی نقصانات

قرآن کا دعوےٰ ہے کہ سود معاش اور عقلی نقطۂ نظر سے انسانی معیشت کے لئے تباہ کن ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ۔

"سود پر قرض لینے والے عام طور پر مفلس اور مضطر ہو جاتے ہیں اور یہ کاروباری دنیا میں سنگین جھگڑوں اور عظیم مناقشوں کا باعث بنتا ہے۔ اور جس قوم یا ملک میں بے محنت روپیہ حاصل کرنے کا رواج پڑ جاتا ہے وہاں عوام پر صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کی صحیح راہیں بند ہو جاتی ہیں۔" [۲]

---

[۱] معالم القرآن، ج ۳، ص ۲۶۳۔ [۲] حجۃ اللہ البالغہ، ص ۳۱۶۔

امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اسی طرح کے ریمارکس دیئے ہیں۔ امام فخرالدین رح نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ

"قرض پر سود اس لئے لیا جاتا ہے کہ اگر وہ مال اصل مالک کے پاس ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اس سے تجارت کے ذریعہ نفع حاصل کرسکتا۔ اب جب کہ اس مدت میں اس کے پاس نہ رہا تو وہ اس مال سے نفع سے مجبور رہا ہے لہذا اس کا حق ہے وہ نفع جو قرض دار نے کمایا ہے اس میں سے قرض خواہ کو بھی دے"؟

جواب تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کیا تم اس بات کی ضمانت دے سکتے ہو کہ اگر وہ مال قرض خواہ کے پاس ہوتا تو ضرور اس کو نفع ہوتا یا وہ مال محفوظ ہوتا اس کے پاس بھی امکان ہے کہ وہ مال چوری ہو جاتا یا ہلاک ہو جاتا۔ یا تجارتی خسارہ ہو جاتا۔ یقیناً جواب نفی میں ہے۔ اس لئے وہ نفع کا حقدار نہیں ہوسکے گا۔

بلکہ قرض دینے سے اس کا اصل سرمایہ ان خطرات سے محفوظ ہو گیا۔ کیونکہ قرض دار کو نفع ہو یا نقصان اس نے اصل قرض واپس کرنا ہے [1]

دوسرا معاشی نقصان اس کا دوسرا معاشی نقصان یہ ہے کہ اس طرح غریب طبقہ کی رہی سہی قوت خریداری، سرمایہ دار اور ساہوکار، غصب کر لیتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی بیروزگاری اور کروڑوں آدمیوں کی ناکافی آمدنی پہلے ہی تجارت اور صنعت کے فروغ میں مانع ہے اس پر مستزاد یہ کہ وہ طبقہ اس کو اشیاء کی خریداری پر صرف کرنے کی بجائے سوسائٹی کے سر پر مزید سود طلب قرض پر چڑھانے میں استعمال کرتا ہے فرض کیجئے اگر دنیا میں پانچ کروڑ آدمی ہوں اور وہ ماہانہ دس روپے سود ادا کرتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ماہ پچاس ۵۰ کروڑ روپے کا مال فروخت ہونے سے رہ جاتا ہے۔ اور اتنی بھاری رقم معاشی پیداوار کی پلٹنے کے بجائے مزید سودی قرضوں کی تخلیق میں صرف ہوگی۔ اس لئے اسلام نے انسان کو قرض حسنہ کی ترغیب دی ہے اور سود پر قرض لینے

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۳، ص

کو منع فرمایا ۔ کیونکہ قرضِ حسنہ سے انسان کی معاشی حالت مضبوط ہوتی ہے اور صنعت و تجارت ترقی کرتی ہے ۔ اور ملک اقتصادی بحران سے نکل جاتا ہے اور سود سے معیشت تباہ ہوجاتی ہے صنعت و تجارت ترقی نہیں کرسکتی اور ملک مزید اقتصادی بحران میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے ۔ ہمارا ملک اس کے لئے واضح ترین مثال ہے ۔

چونکہ میرا عنوان سود کی حیثیت بتانا نہیں اس لئے اس کو طول دینا مناسب نہیں بہرحال ربا القرض کے مفاسد واضح ہوگئے ہیں اس لئے ہمیں اس سے اجتناب کرنا چاہیئے ۔

احتکار

جناب پروفیسر محفوظ احمد، سانگلہ ہل
ایم اے (عربی و اسلامیات، ایم۔او۔ایل، بی ایڈ

اسلام تجارت کو معاشی نظام کا اہم جزو قرار دیتا ہے اسی لیے اسلام نے اپنے معاشی نظام میں بہت سی تجارتی سہولتیں اور جائز آسانیاں پیدا کی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان تمام بدعنوانیوں (مثلاً اتلاف مال، تخبیس اشیاء، اور اجارہ داری) کا سدباب بھی کیا ہے جو درحقیقت اسلام کے معاشی نظام کے مقصد اور نصب العین کو تباہ و برباد کرنے کا باعث بنتی ہیں اور تجارت کے نام سے عوام میں بدحالی اور خواص میں سرمایہ داری کو فروغ دیتی ہیں انہی بدعنوانیوں میں ایک بدعنوانی احتکار ہے۔

زیر نظر مضمون میں احتکار کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، احتکار کے متعلق شرعی احکام اور احتکار کے سدباب کے لیے شرعی اقدامات کا ذکر کیا جائے گا۔

لغوی مفہوم لفظ احتکار عربی لغت میں ح۔ک۔ر سے مشتق ہے ابن منظور (م ۷۱۱ھ) نے احتکار کا معنی ادخار الطعام للتربص[1] تحریر کیا ہے یعنی غلے کا مہنگا ہونے کے انتظار میں ذخیرہ کرنا ابن سیدہ کے نزدیک احتکار کا معنی یہ ہے" الاحتکار جمع الطعام ممایئوکل واحتساب انتظار وقت الغلاء به"[2] یعنی اشیاء خوردنی کا اس لیے ذخیرہ کرنا تاکہ ان کی قیمتیں بڑھ جائیں۔ علامہ زبیدی (م ۱۲۰۶ھ) نے احتکار کا لغوی معنی یہ بیان کیا ہے۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، بذیل مادہ "حکر" دار صادر بیروت، ۱۳۰۰ھ، ج ۴، ص ۲۰۸۔
[2] ایضاً

"احتبس انتظار الغلاء به"[1] اشیاء کو گراں بیچنے کے لیے روک رکھنا احتکار کہلاتا ہے۔
ان تمام معانی کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء لغت کے نزدیک احتکار غلہ مہنگے داموں فروخت کرنے کے لیے ذخیرہ کرنے کو کہتے ہیں۔

اصطلاحی مفہوم

علماء اسلام نے احتکار کی مختلف اصطلاحی تعریفیں کی ہیں۔
امام مجدالدین ابن الاثیر (م ۶۰۶ ھ) نے احتکار کی اصطلاحی تعریف یہ بیان کی ہے۔

"احتکر طعاما ای اشتراہ وجسه لیقل فیغلوا"[2]

اشیاء خوردنی کا ذخیرہ کرنا یعنی ان کو خرید کر اپنے پاس رکھ لینا تاکہ ان کی قلت ہو اور ان کی قیمتیں بڑھ جائیں۔
ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ ھ) نے مرقاۃ المفاتیح میں احتکار کی یہ تعریف کی ہے۔

"الاحتکار هو حبس الطعام حین احتاج الناس به حتی یغلوا"[3]

لوگ جب اشیاء خوردنی کے محتاج ہوں اس وقت ان اشیاء کی فروخت روک دینا تاکہ ان کی قیمتوں میں گرانی ہو جائے احتکار کہلاتا ہے۔
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ ھ) نے احتکار کے اصطلاحی مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"احتکار . . . . در شرع عبارت است از حبس اقوات بانتظار گرانی بایں طریق کہ بخرد در وقت گرانی ونگاہدارد تا گرانی تر ازاں شود"[4]

---

[1] زبیدی، تاج العروس، بذیل مادہ "حکر"، المطبعۃ الخیریہ مصر، ۱۳۰۶ھ ج ۳، ص ۱۵۴۔
[2] ابن الاثیر، النھایہ فی غریب الحدیث والاثیر، مؤسسۃ اسماعیلیان، قم ایران، ج ۱ ص ۴۱۷
[3] ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح، مکتبہ امدادیہ، ملتان، (ت۔ن) ج ۶، ص ۹۴
[4] عبدالحق محدث، اشعۃ اللمعات، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء ج ۳ ص ۳۹

یعنی شریعت میں کسی شخص کا اشیاءِ خوردنی کی فروخت کو اس نیت سے روک دینا تاکہ اسے زیادہ مہنگے داموں فروخت کرے احتکار کہلاتا ہے۔
جدید مفکر مصطفیٰ محمد عمارہ نے احتکار کی اصطلاحی تعریف یہ تحریر کی ہے۔
"حفظ عنده حتی تزاد قیمته ومنع الناس من الانتفاع به"[۱]
یعنی احتکار سے مراد یہ ہے کہ اپنے پاس غلے کو روک لینا تاکہ اس کی قیمت میں اضافہ ہو اور لوگوں کو اس سے نفع اٹھانے سے منع کرنا۔
مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کے نزدیک احتکار کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔
... کوئی شخص "غلہ" وغیرہ کو بہت بڑی مقدار میں اس لیے خریدے کہ بازار گراں ہو جائے اور پبلک میں اس چیز کی مانگ کا "مرکز" صرف وہی بن جائے اور پبلک اس کے مقررہ نرخ پر مجبور ہو جائے اور وہ من مانی گراں فروشی کرے"[۲]
خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص انسانی ضروریات کی عام اشیاء میں سے کسی چیز کو اس لیے ذخیرہ کرے تاکہ بازار میں اس کی مصنوعی قلت پیدا ہو اور وہ اسے مہنگے داموں فروخت کرے۔

شرائط احتکار

ائمہ فقہا کے نزدیک اگرچہ احتکار کی متعدد شرائط ہیں لیکن ان میں اہم اور قابل ذکر چار شرائط ہیں۔

اول: پہلی شرط مال سے متعلق ہے کہ شرع اسلامی میں کس مال کی ذخیرہ اندوزی کو احتکار کہا جائے گا۔
امام اعظم ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) کے نزدیک احتکار صرف غذائی اشیاء میں ممنوع ہے۔ خواہ وہ انسانی غذاؤں سے متعلق ہوں یا حیوانی غذاؤں سے ہدایہ میں ہے۔
یکرہ الاحتکار فی اقوات الآدمیین والبهائم ..... تخصیص

---

[۱] منذری، الترغیب والترہیب، محشی، مصطفیٰ محمد عمارہ، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۳ھ، ج ۲، ص ۵۸۲
[۲] حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، طبع چہارم، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۶۲۔

الاحتکار بالاقوات کالحنطۃ والشعیر والتین فی قول ابی حنیفۃ[1]

امام ابوحنیفہ کے نزدیک انسانوں اور حیوانوں کی اشیاء خوردنی مثلاً گندم، جو اور بھوسہ بھوسہ میں احتکار ممنوع ہے۔

امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) اشیاء خوردنی کے علاوہ کائی (ایک قسم کی گھاس)، اون اور زیتون کی ذخیرہ اندوزی کو بھی احتکار میں شمار کرتے ہیں۔ اشفاق الرحمٰن کاندھلوی نے مؤطا کے حاشیہ پر امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"وکان مالک یمنع من احتکار الکتان، والصوف، والزیت وکل شیء اضر باھل السوق اما انہ لیست الفواکھۃ من الحکرۃ"[2]

امام مالک کائی، اون اور زیتون کے علاوہ ہر اس ہیں احتکار سے منع کرتے جس میں احتکار عوام کے لیے مضرت رساں ہوتا البتہ پھلوں میں آپ کے نزدیک احتکار نہیں ہے۔

امام ابویوسف (م ۱۸۲ھ) بھی امام مالک کی طرح احتکار کو اشیاء خوردنی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ آپ کے نزدیک ہر اس چیز میں احتکار ہے جس میں ذخیرہ کرنے سے عوام کو اذیت ہو۔

ہدایہ میں ہی آپ کا یہ قول منقول ہے۔

"کل ما اضر بالعامۃ حبسہ فھو احتکار وان کان ذھبا اوفضۃ او ثوبا۔"[3]

یعنی جس چیز کا روکنا عوام کے لیے مضر ہو اس میں احتکار رہے اگرچہ سونا ہو یا چاندی ہو یا کپڑا

---

[1] برہان الدین مرغینانی، الھدایہ، محمد علی کارخانہ کتب، کراچی، ۱۳۱۱ھ، ج ۴، ص ۴۶۸۔
[2] امام مالک، مؤطا محشی، اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، میر محمد کتب خانہ، کراچی۔ (ت۔ن) ص ۵۹۱
[3] المنذری، مختصر سنن ابی داود، ج ۵، ص ۹۱

امام محمد (م ۱۸۹ھ) کے نزدیک احتکار کی تعریف یہ ہے۔

الاحتکار بما یتقوت به النّاس والبھائم[1]

احتکار ہر اس چیز میں ہے جس سے انسان اور حیوان خوراک حاصل کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کے نزدیک بھی احتکار عام ضروریات انسانی کی اشیاء میں ہوتا ہے۔

امام ابو داؤد (م ۲۷۵ھ) کہتے ہیں میں نے امام احمد سے پوچھا۔

"ما الحکرہ قال ما فیه عیش النّاس[2]

کس چیز میں احتکار ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہر اس چیز میں جو عام ضروریات انسانی سے متعلق ہو۔

ابن القیم الجوزیہ (م ۷۵۱ھ) نے امام احمد کا ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

"لیس الاحتکار الا فی الطعام خاصة لانه قوت النّاس"[3]

احتکار صرف انسانوں کی اشیاء خوردنی میں ہوتا ہے۔

ان تمام اقوال میں امام ابو یوسف (م ۱۸۲ھ) کا قول اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے کیونکہ حرمت احتکار کے شرعی مقاصد اس قول میں پورے ہوتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ میں حرمت احتکار کے اہم مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ دولت فرد واحد یا چند مخصوص افراد کے ہاتھوں میں جمع نہ ہو۔

۲۔ اسلامی ریاست کے شہریوں کو بے جا معاشی تکلیف نہ ہو۔

اگر احتکار کو صرف اشیاء خوردنی تک محدود کر دیا جائے تو عصر حاضر میں بہت سی ایسی اشیاء بھی ہیں جن کا تعلق بظاہر خورد و نوش سے نہیں لیکن حیات انسانی کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں مثلاً کھاد، سیمنٹ، پٹرول وغیرہ ہمارے ہاں سالانہ بجٹ کے موقع پر بالخصوص

---

[1] شیخ نظام وجماعۃ، الفتاوی الھندیہ، نوران کتب خانہ، پشاور (ت، ن) ج ۳، ص ۲۱۴۔

[2] ابن تیمیہ، نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، انصار السنۃ المحمدیہ، لاہور (ت۔ ن) ج ۵، ص ۲۳۵۔

[3] ابن القیم الجوزیہ، تہذیب، بذیل، المنذری، مختصر سنن ابی داود، ج ۵، ۹۰

اشیاء خورد و نوش کے علاوہ ان اشیاء اور ان جیسی دیگر متعدد اشیاء کا ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور بجٹ کے اعلان کے بعد ان ذخیرہ شدہ اشیاء کو مارکیٹ میں لایا جاتا ہے اس طرح اسلامی ریاست کے شہریوں کو غیر خوردنی اشیاء کے احتکار ہی بھی اتنی ہی معاشی اذیت پہنچتی ہے جتنی اشیاء خوردنی کے ذخیرہ سے ایذا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ان اشیاء کے ذخیرہ کرنے سے بھی ذخیرہ اندوز بے شمار دولت کے مالک بن جاتے ہیں اسی لیے امام ابو یوسف کے نزدیک ان تمام اشیاء کی ذخیرہ اندوزی احتکار شرعی ہوگی۔ جو کسی بھی طرح انسانی زندگی سے متعلق ہوں۔

اسلامی نظریہ احتکار کی روح کی تکمیل تب ہی ممکن ہے جب اس کا دائرہ ان تمام اشیاء پر حاوی ہو جو کسی بھی طرح انسانی ضروریات سے متعلق ہوں

دوم: احتکار کے متعلق دوسری شرط فقہاء اسلام نے یہ بیان کی ہے کہ محتکر کی نیت یہ ہو کہ اس چیز کی مصنوعی قلت پیدا کر کے اس کی قیمت بڑھائی جائے البتہ اگر کسی شخص نے عام حالات میں کسی چیز کو بڑی مقدار میں خریدا تاکہ اُسے نفع کے ساتھ فروخت کرے لیکن اتفاق سے اس شئے کی قیمت قدرتی عوامل سے بڑھ جائے تو بڑھی ہوئی قیمت پر اس چیز کو فروخت کرنا احتکار شرعی نہیں کہلائے گا۔ البتہ اگر اس مال کی فروخت لوگوں کی ضرورت کے وقت نہ کرے تو احتکار شرعی ہو جائے گا [1]

سوم: احتکار کے متعلق تیسری شرط یہ ہے کہ احتکار تنگی کے زمانے میں ہو یا کسی بھی وقت ہو لیکن اس کی ذخیرہ اندوزی سے بازار متاثر ہوتا ہو اگر محتکر کے غلہ روکنے سے بازار پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ چیز بازار میں عام مل رہی ہو تو جمہور ائمہ کے نزدیک یہ احتکار بلا کراہت جائز ہے جب کہ امام مالک کے نزدیک کسی بھی وقت مال کا مطلقاً ذخیرہ کرنا ناجائز ہے [2]

چہارم: احتکار کے متعلق چوتھی شرط یہ ہے کہ احتکار طویل مدت کے لیے ہو طویل

---

[1] مرغینانی، ہدایہ، ج ۴، ص ۴۶۹

[2] احمد یار خاں، مراۃ شرح مشکوٰۃ، نعیمی کتب خانہ، گجرات، (ت۔ن) ج ۴، ص ۲۸۸۔

اور قلیل مدت کے متعلق ہدایہ میں ہے۔

"الشھر لان دونه قلیل عاجل وما فوقه کثیرًا اجل"[1]

فقہاء کے نزدیک ایک ماہ تک مدت قلیل اور ایک ماہ سے زیادہ مدت طویل سمجھی جاتی ہے۔

بعض فقہاء کے نزدیک مدت قلیل میں احتکار نہیں کیونکہ اس میں ضرر نہیں[2] جب کہ طویل مدت میں بالاتفاق احتکار ممنوع ہے۔

آج کے دور میں فقہاء کی قلیل مدت بھی قابل ضرر ہے، راقم الحروف کے خیال میں مدت کے تعین کا انحصار محتکر کی نیت پر ہے اگر محتکر حرمت احتکار کے پیش نظر ایک دن بھی احتکار کرے گا تو وہ احتکار کا مرتکب ہوگا۔

علامہ قرطبی (م ۶۷۱ھ) نے ایک واقعہ نقل کیا ہے اس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ فقہاء کی قلیل مدت میں احتکار بھی احتکار شرعی کہلاتا ہے۔

واسط شہر میں ایک تاجر رہتا تھا اس نے اپنا گندم سے بھرا ہوا ایک جہاز بصرہ بھیجا۔ اور وہاں اپنے ایجنٹ کو لکھا کہ جس روز یہ جہاز بصرہ پہنچے اسی روز اس کو فروخت کر دو آنے والے دن کے لیے اسے بچا کر نہ رکھنا اتفاق ایسا ہوا کہ جس روز وہ جہاز بصرہ پہنچا تو گندم کا بھاؤ گرا ہوا تھا۔ غلہ کے تاجروں نے اس ایجنٹ کو کہا کہ اگر تم ایک ہفتہ انتظار کرو تو کئی گنا زیادہ نفع کماؤ گے۔ چنانچہ ایجنٹ نے ایک ہفتہ اس گندم کو فروخت نہ کیا اور ان ایام میں بھاؤ تیز ہوگیا اور اس نے کئی گنا زیادہ نفع کمایا۔ جب اس نے اپنے مالک کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو اس تاجر نے اس کو لکھا:

"یاھذا انا کنا قنعنا بربح یسیر مع سلامة دیننا وقد جنیت علینا جنایة فاذا اتاك کتابی ھذا فخذ المال

---

[1] مرغینانی، ہدایہ، ج ۴، ص ۴۶۹

[2] ایضاً

وتصدق بہ علی فقراء البصرۃ ولیتنی انجو من الاحتکار کفا فالا علی ولا لی[1]

اے فلاں اگر ہمارا دین سلامت رہے تو ہمیں تھوڑا نفع ہی کافی ہے تونے ہم پر بڑی زیادتی کی ہے۔ جس وقت میرا یہ خط تمہیں ملے تو سارا مال بصرے کے فقراء میں تقسیم کردو۔ اس غلہ کی ذخیرہ اندوزی کا جو جرم تم نے کیا ہے اس کے مواخذہ سے ہی اگر بچ جاؤں تو کافی ہے مجھے اس مال کے صدقہ کرنے سے مزید ثواب کی کوئی آرزو نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلام میں کسی شخص کے لیے کسی بھی چیز کا اس وقت ذخیرہ کرنا حرام ہے جب کہ عوام النّاس کو اس چیز کی ضرورت ہو لیکن وہ شے کو اس لیے فروخت نہ کرے تاکہ اس کی مصنوعی قلت پیدا ہو اور اسے مہنگے داموں فروخت کرے۔

احتکار کے متعلق شرعی احکام

اسلام میں دولت وسرمایہ داری کے متعلق ہر وہ اصول ناقابل تسلیم ہے جس میں کسی نہ کسی طرح احتکار واکتناز کی کوئی صورت پیدا ہو سکے اور اس سے دولت پھیلنے کی بجائے خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو جائے اور عام انسانی زندگی متاثر ہو۔ قرآن پاک میں احتکار واکتناز کی حرمت کا ذکر دو طرح سے کیا گیا ہے۔

اوّل: وہ آیات جن میں احتکار واکتناز کی حرمت بیان کی گئی ہے۔

دوم: وہ آیات مطہرہ جن میں انفاق فی سبیل اللہ کے وجوب کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگرچہ متعدد قرآنی آیات میں احتکار واکتناز کی حرمت اور وجوب انفاق کا ذکر ہے لیکن ذیل کی آیات اس مضمون کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ

---

[1] ابوعبداللہ محمد قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتاب العربی للطباعۃ والنشر، قاہرہ۔ ۱۹۶۷، ج ۱۹، ص ۵۶۔

فَتُكْوىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ[1]

ترجمہ: اور جو لوگ سونے اور چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کے لیے دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔ جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا یہ وہ خزانہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا پس خزانہ جمع کرنے کا مزا چکھو۔

۲۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ نِ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ[2]

ترجمہ: بڑی خرابی ہے ہر اس شخص کے لیے جو عیب چین اور بدگو ہے جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا ہرگز نہیں۔ وہ جہنم میں پھینکا جائے گا۔

۳۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينَ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ[3]

بے شک صدقات صرف فقیروں کے لیے اور مسکینوں کے لیے اور ان کے لیے جو صدقات کے وصول کرنے پر مامور ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں اسلام کی الفت پیدا کرنی ہے اور ان کے لیے جن کی گردنیں غلامی سے آزاد کرانی ہیں اور قرض داروں کے لیے (جو قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہوں) اور اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لیے اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی جانب سے

---

[1] توبہ : ۳۴، ۳۵
[2] الھمزہ : ۱ تا ۴
[3] توبہ ۶۰

فرض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔

۴۔ کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃً بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ [۱]

(فقراء، مساکین، قرابت داروں اور یتیموں وغیرہ پر اللہ تعالیٰ نے اس لیے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے) تاکہ مال و دولت صرف دولت مندوں میں ہی محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

۵۔ واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکاۃ [۲]

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

۶۔ وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ [۳]

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

۷۔ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیۡتَآءَ الزَّکٰوۃِ وَکَانُوۡا لَنَا عٰبِدِیۡنَ [۴]

اور ہم نے ان (انبیاء کرام) کی جانب وحی کی نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے۔

۸۔ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ [۵]

اور جو ہم نے تم کو رزق دیا اس میں سے اس سے پہلے ہی خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آجائے۔

ان آیات مقدسہ میں حرمت اکتناز و احتکار، ادائے زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ

---

[۱] حشر : ۷

[۲] بقرہ : ۴۳

[۳] بقرہ : ۱۹۵

[۴] انبیاء : ۷۳

[۵] منافقون : ۱۰

کا حکم دیا گیا ہے ان سب کی روح یہ ہے کہ دولت و ثروت جمع اور ذخیرہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ خرچ کرنے کے لیے ہے اور اس کا مصرف ذاتی و انفرادی تعیش کی بجائے انفرادی و اجتماعی ضروریات کی کفالت ہے۔

قرآن پاک میں احتکار کی حرمت کا ذکر بالواسطہ کیا گیا ہے جب کہ احادیث مبارکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً محتکر کے لیے وعیدوں اور جالبین (احتکار نہ کرنیوالے) کے لیے بشارتوں کا ذکر فرمایا ہے۔

محتکرین کے لیے ان احادیث میں وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ عن معمرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من احتکر فھو خاطئٌ [۱]

حضرت معمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا خطاکار ہے۔

۲۔ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من احتکر یرید ان یتغالی بھا علی المسلمین فھو خاطی وقد برئی منہ ذمۃ اللّٰہ [۲]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی مسلمانوں کے لیے قیمتیں بڑھانے کی غرض سے ذخیرہ اندوزی کرے وہ خطاکار ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے۔

ذخیرہ اندوزی نہ صرف ملکی معیشت کے لیے نامناسب ہے بلکہ معاشرے میں رہنے والے ہر فرد کو مصائب سے دوچار کرنے کا سبب بنتی ہے مسند ابی داؤد الطیالسی کی روایت ہے۔

---

[۱] امام مسلم، الجامع الصحیح، (کتاب البیوع، باب تحریم الاحتکار) مطبع علیمی، دھلی، ۱۳۴۸، ج ۲، ص ۳۱

[۲] حاکم، مستدرک علی الصحیحین، دار المعرفۃ، بیروت، (ت۔ن) ج ۲، ص ۱۲

۳ ۔ عن معقل بن یسارؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من دخل فی شئ من اسعار المسلمین لیغلیہ علیھم کان حقا علی اللہ تبارک وتعالیٰ ان یقذفہ فی معظم النار یوم القیمۃ [1]

ترجمہ: معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کہ اُسے گراں کرے تو اللہ تعالیٰ پر ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن اسے زبردست آگ میں پھینک دے۔

۴ ۔ عن عبد الرحمٰن بن ابی بکرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحتکر فی سوقنا کالملحد فی کتاب اللہ [2]

ترجمہ: حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکرہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے بازار میں ذخیرہ اندوزی کرنے والا ایسے ہے جیسے اللہ کی کتاب کا منکر۔

۵ ۔ عن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحتکر ملعون۔ [3]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ذخیرہ اندوز لعنتی ہے۔

۶ ۔ عن معاذؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بئس العبد المحتکر ان ارخص اللہ الاسعار حزن وان

---

[1] ابی داود، مسند ابی داود الطیالسی، بحوالہ محترم محمد فہیم عثمانی، اسلامی معیشت کے چند نمایاں پہلو، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷، ص ۸۹ ۔ ۹۰

[2] حاکم، مستدرک، ج ۲، ص ۱۲

[3] ایضاً، ص ۱۱

اغلاها فرح [1]

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ذخیرہ اندوز کتنا بُرا ہے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء میں اگر ارزانی پیدا کرتا ہے تو وہ مغموم ہوتا ہے اور اگر گرانی پیدا کرتا ہے تو مسرور ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ذخیرہ اندوز کو معاشی قاتل قرار دیتے ہوئے انسانی قاتل کے مساوی قرار دیا گیا ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

۷۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یحشر الحاکرون و قتلة الانفس ـــــــ فی درجة [2]

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن معاشی قاتل (محتکر) اور انسانی قاتل ایک ہی درجہ میں اٹھائے جائیں گے۔

۸۔ عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احتکر طعاما اربعین لیلة فقد برئ من اللہ وبرئ اللہ منہ [3]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے چالیس [3] رات تک غلے کی ذخیرہ اندوزی کی وہ اللہ سے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہوگیا۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ

---

[1] منذری، الترغیب والترہیب، ج ۲ ص ۵۸۳

[2] ایضاً، ۵۸۴

[3] چالیس دن کا ذکر حد بندی کے لیے نہیں کہ اس سے کم احتکار جائز ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو احتکار کا عادی ہو جائے اسکی یہ سزا ہے چالیس دن کوئی کام کرنے سے اس کام کی عادت پختہ ہو جاتی ہے البتہ بعض فقہاء نے اس حدیث سے مدت احتکار کا تعین کیا ہے (مرغینانی، ہدایہ، ج ۴ ص ۴۶۹)

[4] منذری: الترغیب والترہیب، ج ۲، ص ۵۸۲

صلی اللہ علیہ وسلم یقول من احتکر علی المسلمین طعامھم ضربہ اللہ بالجذام والافلاس [۱]

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس کسی نے مسلمانوں کے لیے غلے کا ذخیرہ کیا اللہ تعالٰی اس پر کوڑھ اور افلاس مسلط کر دے۔

۱۰۔ عن ابی امامۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من احتکر طعاما اربعین یوما ثم تصدق بہ لم یکن لہ کفارۃ [۲]

ترجمہ: حضرت ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے چالیس دن غلے کا ذخیرہ کیا پھر وہ سارا غلہ خیرات بھی کر دے تب بھی اس کا کفارہ نہ ہوگا۔

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بعض خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے عہد خلافت میں احتکار کو ممنوع قرار دیا۔

امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ اعلان فرمادیا تھا:

لاحکرۃ فی سوقنا لایعمد رجال بایدیھم فضول من اذھاب الی رزق من ارزاق اللہ نزل بساحتنا فیحتکرونہ علینا ولکن ایما جالب جلب علی عمود کبدہ فی الشتاء والصیف فذلک ضیف عمر فلیبع کیف شاء اللہ ولیمسک کیف شاء اللہ [۳]

---

[۱] ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، (ابواب التجارت، باب الحکرہ) نور محمد کتب خانہ، کراچی، ۱۳۸۱ھ ص ۱۵۶

[۲] ولی الدین، مشکوٰۃ المصابیح، (کتاب البیوع، باب الاحتکار) اصح المطابع، کراچی، ۱۳۶۸ھ ص ۲۵۱

[۳] امام مالک، مؤطا، (کتاب البیوع، باب الحکرۃ والتربص) ص ۵۹۱۔

ترجمہ : ہمارے بازار میں کوئی ذخیرہ اندوزی نہ کرے جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زائد دولت ہے وہ کسی ایک غلہ کو خرید کر ہمارے ملک میں ذخیرہ اندوزی نہ کریں اور جو شخص گرمی یا سردی میں تکلیف اٹھا کر ہمارے ملک میں غلہ لائے وہ عمر کا مہمان ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کو منظور ہو۔ بیچے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کو منظور ہو رہنے دے۔

ابن قدامہ المقدسی (م ۶۳۰ھ) نے المغنی میں ایک عبرتناک واقعہ نقل کیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک بار بازار نکلے تو آپ نے وہاں بہت سا غلہ دیکھا، آپ نے فرمایا یہ کیسا غلہ ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ہمارے لیے لایا گیا ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے اور اس کو بھی برکت دے جو یہ غلہ لایا ہے۔ پھر آپ سے کہا گیا یہ غلہ ذخیرہ کیا گیا تھا آپ نے پوچھا کس نے ذخیرہ کیا تھا انہوں نے کہا ایک حضرت عثمان رضؓ کے غلام نے اور ایک آپ کے غلام نے۔ آپ نے ان دونوں کو بلا کر ذخیرہ کرنے کے متعلق پوچھا تو ان دونوں نے کہا ہم اپنے اموال خریدتے ہیں اور بیچتے ہیں تو آپ نے ان سے کہا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو کوئی مسلمانوں کے غلے کو ذخیرہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر کوڑھ اور تنگدستی مسلط کر دے گا یہ بات سن کر حضرت عثمان رضؓ کا غلام غلہ باہر لے آیا راوی نے کہا حضرت عمر رضؓ کے غلام نے وہ غلہ فروخت نہ کیا میں نے اسے کوڑھ کی بیماری میں مبتلا دیکھا[1]

علامہ شوکانی (م ۱۲۵۰ھ) نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق تحریر کیا ہے کہ آپ نے ایک ذخیرہ اندوز کا غلہ (سزا کے طور پر) جلا دیا۔[2]

ان تمام احادیث و آثار صحابہ رضؓ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں احتکار کتنا بڑا مذموم فعل ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احادیث میں ان لوگوں کی فضیلت بھی بیان فرمائی جو غلے

---

[1] موفق الدین عبداللہ ابن قدامہ، المغنی (باب الاحتکار) مکتبۃ المنار، قاہرہ، ۱۳۴۷ھ، ج ۴، ص ۲۸۳

[2] محمد بن علی الشوکانی، نیل الاوطار، ج ۲، ص ۱۸۱ بحوالہ، ڈاکٹر نور محمد غفاری، اسلام کا قانون تجارت، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۶۶۔

کی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتے ان میں سے چند تحریر کی جاتی ہیں۔

۱۔ عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجالب مرزوق[1]

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بازار میں غلہ لانے والے کو رزق دیا جاتا ہے۔

۲۔ عن عبد الرحمٰن بن ابی بکرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الجالب الی سوقنا کالمجاھد فی سبیل اللہ[2]

ترجمہ: حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے بازار میں غلہ لانے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کیطرح ہے۔

۳۔ عن ابی سعید الخدری قال عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء[3]

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سچا امانتدار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

ان احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو تاجر احتکار کا مرتکب نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس کا رتبہ کتنا بلند ہے۔

احتکار کے سدِباب کے لیے شرعی اقدامات

احتکار کے سدِباب کے لیے شریعت اسلامیہ میں چار طرح کے اقدامات کیے گئے ہیں

اوّل: اخلاقی اقدامات۔ دوم: قانونی اقدامات

سوم: تعزیری اقدامات۔ چہارم: قانونی وسائل

---

[1] دارمی، سنن الدارمی، (کتاب البیوع، باب فی النہی عن الاحتکار) نشر السنۃ، ملتان (ت۔ن) ج ۲، ص ۱۶۵

[2] حاکم، مستدرک، ج ۲، ص ۱۲

[3] ترمذی، جامع الترمذی (ابواب البیوع، باب ما جاء فی التجار) مطبع نول کشور، لکھنؤ (ت۔ن) ج ۱ ص ۱۴۶

اول : اخلاقی اقدامات کا ذکر قرآن و حدیث میں محتکرین کے لیے وعیدوں اور جالبین کے لیے وعدوں کی صورت میں کیا گیا ہے ۔جن کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

دوم : قانونی اقدامات سے مراد یہ ہے کہ اسلام نے ذخیرہ اندوزی کی تمام ممکنہ صورتوں کو قانونًا ناجائز قرار دے دیا ہے ۔

عہد رسالت میں احتکار کی دو مروجہ صورتیں تھیں :

(i) بیع تلقی الرکبان (ii) بیع حاضر للباد

تلقی الرکبان کے متعلق بخاری کی روایت ہے ۔

عن عبد اللہ قال کنا نتلقی الرکبان فنشتری منھم الطعام فنھانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان نبیعہ حتی نبلغ بہ سوق الطعام[1]

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم غلہ لانے والے قافلوں کے پاس (شہر آنے سے پہلے) پہنچ جاتے تھے اور ان سے غلہ خرید لیا کرتے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس فعل سے منع فرما دیا کہ ہم اس غلے کو بازار میں پہنچنے سے پہلے خریدیں ۔

فقہاء اسلام نے "تلقی الرکبان کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ جب کبھی شہر میں غلہ یا دیگر اشیاء خوردنی کی قلت ہو اور قحط کے آثار نمایاں ہوں اور شہر کے بڑے بڑے تاجر شہر سے نکل کر شہر کی طرف آنے والے تجارتی قافلوں کو راستے میں ہی روک کر ان کا تجارتی سامان خصوصاً اشیاء خوردنی خرید کر چور بازاری سے اپنی شرائط کے مطابق فروخت کریں اور من مانی قیمت وصول کریں تو یہ تلقی الرکبان کہلاتا ہے[2]

"تلقی الرکبان" کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شہر کے تاجر باہر سے آنے والے کسانوں

---

[1] امام بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب البیوع، باب منتہی التلقی) نور محمد کتب خانہ دہلی، ۱۳۵۷ھ، ج ۱، ص ۲۸۹

[2] مرغینانی، الہدایہ، (کتاب البیوع، باب فیما یکرہ) ج ۳، ص ۶۹

اور عام دیہاتیوں کو شہر کے اصل بھاؤ سے بے خبر رکھ کر ان کی اشیاء سستے داموں خرید لیں اور شہر میں لا کر مہنگے داموں فروخت کریں۔

لیکن یہ صورت نہی تب آئے گی جب شہر میں اس مال کی قلت ہو اگر شہر میں اس مال کی نہ قلت ہو اور نہ ہی گرانی ہو تو ان اشیاء کا شہر کے باہر خرید لینا "تلقی الرکبان" میں نہیں آئے گا[1]

عہد رسالت میں احتکار کی دوسری مروجہ صورت "بیع حاضر للباد" تھی اس بیع کے متعلق بھی الصحیح بخاری میں روایت ہے۔

عن عبد اللہ بن عمر قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبیع حاضر لباد[2]

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ شہر والا دیہات والوں کے لیے بیچنے کا کام دے۔

فقہاء اسلام نے "بیع حاضر لباد" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تاجر کا سامان تجارت شہر میں موجود ہے مگر وہ اپنی نفع اندوزی اور زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی خواہش کی تکمیل کے لیے شہریوں کی ضروریات جاننے کے باوجود اپنا سامان ان کے ہاتھوں فروخت نہ کرے بلکہ دیہات میں جا کر سادہ لوح دیہاتیوں کو مہنگے داموں فروخت کرے[3]

اس بیع کی ایک اور شکل یہ بھی ہے کہ شہری دیہاتیوں کے درمیان مانع بن کر خود دیہاتیوں میں کی جانب سے ذمہ دار بن کر گراں قیمت پر اشیاء خرید کراتا ہے اگر شہری کا یہ عمل فریقین میں سے کسی کے لیے بھی نقصان کا باعث بنے تو یہ کاروبار ممنوع ہے لیکن اگر وہ صرف دلال کا کام کرے اور اس کی نیت اور عمل دونوں سے کسی فریق (دیہاتی یا شہری) کو نقصان نہ پہنچے تو یہ عمل (دلالی) درست ہے[4]

---

[1] امام بخاری، الجامع الصحیح، ج ۱، ص ۲۸۹

[2] مرغینانی، ہدایہ، (کتاب البیوع، باب فیما یکرہ) ج ۳، ص ۶۹

[3] ایضاً۔

بیع کی ان صورتوں کے علاوہ شریعت اسلامیہ میں ہر وہ بیع ناجائز ہے جس سے کسی طرح بھی احتکار ممکن ہو جیسے موجودہ دور میں احتکار کی مندرجہ ذیل شکلیں رائج ہیں۔

ا۔ شرکت قابضہ: ایسی شرکت جس میں پیداواری کاروبار کے اکثر حصص حصہ دار ہی خرید لیتے ہیں لہٰذا وہ کسی شے یا خدمت کی پیداوار کی حد اور اس کی قیمت کا تعین اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور یوں خریداروں کا استحصال کرتے ہیں۔

ت۔ ادماج: ادماج کا مطلب یہ ہے کہ چند کمپنیاں مل کر ایک وحدت قائم کر لیتی ہیں اور یوں کسی شے کی پیداوار اور اس کی قیمت پر اجارہ داری قائم کر لیتی ہیں۔

ج۔ وحدت قیمت: چند مل مالکان یا کارخانہ داران مل کر بازار میں ایک قیمت طے کر لیتے ہیں اور اس قیمت کے ذریعے گاہکوں کا استحصال کرتے ہیں اور اپنے نفع کا زیادہ سے زیادہ حصول ممکن بنا لیتے ہیں [1]

تعزیری اقدامات

احتکار کے سدباب کے لیے اسلام نے جہاں اخلاقی اور قانونی اقدامات کیے ہیں وہاں قاضی کو تعزیری اقدامات کرنے کا اختیار بھی دیا ہے تعزیری اقدامات کی بنیاد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مسند احمد میں ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاضرر ولا ضرار [2]

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ نقصان برداشت کرو اور نہ نقصان کا موجب بنو۔

فقہاء اسلام نے اسی حدیث کو فقہ کے قواعد میں شمار کیا ہے [3]۔ اسی قانونی کلیہ کے تحت

---

[1] نور محمد غفاری، اسلام کا قانون تجارت، ص ۶۹۔

[2] احمد بن حنبل، المسند، دار صادر، بیروت، (ت ان) ج ۱، ص ۳۱۳

[3] السید محمد عمیم الاحسان، قواعد الفقہ (الرسالۃ الثالثہ) قاعدہ نمبر ۲۵۲، الصدف پبلشرز کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۶

فقہاء اسلام کی ایک جماعت نے محتکر کے لیے درج ذیل دو تعزیری اقدامات کرنے کی اجازت دی ہے۔

(i) محتکر کو قید کی سزا کے علاوہ مالی سزا بھی دے سکتا ہے۔

(ii) قاضی محتکر کا مال اس کی رضامندی کے بغیر بازار کے نرخوں میں فروخت کرنے کا مجاز ہے۔ اس بنا پر ہدایہ میں ہے۔

اذا رفع الی القاضی هذا الامر (الاحتكار) يامر المحتكر ببيع ما فضل عن قوته وقوت اهله على اعتبار السعة فى ذلك وينهاه عن الاحتكار فان رفع اليه مرة اخرى حبسه وعذره على مايرى زجراً له دفعاً للضرر عن الناس[1]

ترجمہ: جب محتکر کا یہ مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ محتکر کو حکم دے گا کہ وہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی غذائی ضروریات (جن کا اندازہ فراخی سے کیا جائے) سے جو کچھ فاضل بچے اس کو فروخت کر دے اور قاضی اس کو احتکار کرنے سے منع کر دے گا اگر اسی تاجر کو دوبارہ اسی جرم میں قاضی کے سامنے پیش کیا جائے تو اسے قید کر کے مناسب مالی سزا دے تاکہ عوام کی ضرر رسانی ختم ہو۔

ان اقدامات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں کسی صورت میں احتکار جائز نہیں بلکہ اسلام محتکر کے خلاف ہر طرح کے اقدامات کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

چہارم۔ قانونی وسائل (تسعیر)

احتکار کے سد باب کے لیے اسلام صرف اخلاقی، قانونی اور تعزیری اقدامات پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ قانونی وسائل کو بھی پوری طرح استعمال میں لاتا ہے تاکہ اسلامی معاشرے سے اس برائی کا مکمل خاتمہ ہو اور اسلامی ریاست کے شہری امن وسکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکیں

---

[1] مرغینانی، الہدایہ، (کتاب الکراھیۃ) ج ۴، ص ۴۶۹ - ۴۷۰

احتکار کے خاتمے کے لیے اسلام جب قانونی وسیلے کو استعمال کرتا ہے اسے فقہی اصطلاح میں "تسعیر" کہا جاتا ہے۔

عربی لغت اور فقہ اسلامی میں تسعیر کا معنی بھاؤ مقرر کرنا ہے[۱]۔ اسلام نے حکومت یا کسی بیرونی طاقت کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ کسی چیز کی قیمت مقرر کرے کیونکہ اسلام کے عادلانہ قانون تجارت نے قیمتوں کے نظام کو اختیاری تصرفات سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ گرانی کا سبب اگر قدرتی عوامل ہوں تو اس صورت میں قانونی وسائل کے ذریعے اشیاء کی قیمتوں کو نیچے لانا اور تاجروں کو سستے داموں مال فروخت کرنے پر مجبور کرنا ظلم ہوگا یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جب قحط پڑا تو صحابہ کرامؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارزاں نرخ مقرر کرنے کی درخواست کی تو آپ نے انکار فرماتے ہوئے اُسے ظلم سے تعبیر کیا۔

کنز العمال میں طبرانی کبیر کی روایت ہے۔

اصاب الناس سنة فقالوا يارسول الله سعّر لنا قال لايسئلني الله عن سنة احدثتها عليكم لم يامرني بها ولكن سلوا الله من فضله[۲]

ترجمہ: لوگ قحط کا شکار ہوئے تو انہوں نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے نرخ مقرر کر دیجئے آپ نے فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے ایسا کرنے میں جواب طلب کرے گا جس کا اس نے مجھے حکم نہیں دیا ہو اور میں اسے اپنی طرح سے اختراع کرلوں بلکہ تم اللہ سے اس کے فضل کے لیے دعا کرو۔

اس طرح سنن ابی داؤد میں ایک ہے۔

عن انس قال قال النّاس يارسول الله غلا السعر فسعّر لنا

---

[۱] ابن منظور، لسان العرب بذیل مادہ "سعر"، ج ۴، ص ۳۶۵
سید محمد عمیم الاحسان، قواعد الفقہ (الرسالۃ الرابعہ، التعریفات الفقہیۃ) ص ۳۲۱۔
[۲] علی متقی حسام الدین، کنز العمال، (حدیث نمبر ۹۸۴۹) موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹ء ج ۴، ص ۱۰۳

فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم هو المسعر القابض الباسط الرزاق وانی لارجوا ان القی الله ولیس احد منکم یطالبنی بمظلمة فی دم ولا مال[1]

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نرخ گراں ہو گئے آپ ہمارے لیے نرخ مقرر کر دیجیے تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہی نرخ مقرر کرنے والا ہے (اشیاء کی پیداوار میں) تنگی پیدا کرنے والا فراخی پیدا کرنے والا اور رزق عطا کرنے والا اور میں چاہتا ہوں کہ خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہوں کہ تم میں سے کوئی مجھ سے کسی ظلم کا بدلہ طلب کرنے والا نہ ہو جو جان یا مال کے سلسلہ میں کیا گیا ہو۔"

یہ روایات صرف یہ بتاتی ہیں کہ نرخ گراں ہو گئے تھے اس گرانی کا سبب نہیں بتاتیں لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ گرانی کی وجہ یہ تھی کہ غلہ باہر سے ہی گراں نرخ پر آرہا تھا اور مدینہ منورہ میں غذائی اجناس زیادہ تر باہر ہی سے درآمد کی جاتی تھیں اس لیے جب باہر ہی سے مہنگا آرہا ہو تو مقامی تاجروں کو کمتر نرخ کا پابند بنانا صریحاً ظلم تھا اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ ایسی صورت میں تسعیر کی بجائے اشیاء کی رسد کو درست کرنے کی کوشش زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب قحط کے آثار نمایاں ہوئے اور قیمتیں چڑھنے لگیں تو آپ نے غذائی اشیاء کی رسد بحال کرنے کے لیے مصر اور شام سے غلہ، آٹا اور تیل وغیرہ اونٹوں پر منگوائے اس طرح قیمتیں اپنی اصلی سطح پر آگئیں[2]

بہرحال اگر گرانی قدرتی عوامل کے تحت ہو رہی ہو تو اس میں اسلام نے تسعیر (تعیین نرخ) کو نہ صرف ناجائز بلکہ ظلم کے مترادف قرار دیا ہے لیکن گرانی کی وجہ اگر احتکار ہو تو اس صورت میں اسلامی ریاست کو پورا اختیار ہے کہ وہ اشیاء کے نرخ متعین کر دے اور تاجروں کو مقررہ

---

[1] ابی داؤد، سنن ابی داؤد، (کتاب البیوع، باب فی التسعیر)، ج ۲، ص ۴۸۹

[2] ابن جوزی، سیرۃ عمر بن خطاب، مطبع السعادت، قاہرہ، ۱۳۴۲ھ، ص ۱۵۴

قیمت پر اپنے مال فروخت کرنے پر مجبور کرے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو مناسب سزا دے ۔ چنانچہ اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مرغینانی (م ۵۹۳ھ) نے لکھا ہے ۔

لا ینبغی للسلطان ان یسعر علی الناس لقوله علیه السلام لاتسعروا فان الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق ولان الثمن حق العاقد فالیه تقدیره فلاینبغی للامام ان یتعرض لحقه الّا اذا تعلق به دفع ضرر العامة . . . . فان کان ارباب الطعام یتحکمون ویتعدون عن القیمة تعدیا فاحشا وعجز القاضی عن صیانة حقوق المسلمین الابالتسعیر فحینئذ لاباس به بمشورة من اهل الرای والبصیرة [1]

ترجمہ : سلطان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ لوگوں کو متعین قیمتوں کا پابند بنائے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیمت مقرر نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی قیمت مقرر کرنے والا ، تنگی پیدا کرنے والا فراخی پیدا کرنے والا ، رزق عطا کرنے والا ہے ۔ اور اس لیے کہ قیمت بتانا عقد بیع کرنے والے کا حق ہے لہٰذا اس کی تعیین وہی کر سکتا ہے ۔ پس امام کو اس کے حق میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے بجز اس صورت حال کے جب ضرر عامہ کا دفعیہ اس کا متقاضی ہو ۔

اگر غلہ کے تاجر من مانی قیمتیں وصول کرتے ہوں اور معقول قیمتوں سے زائد دام وصول کرتے ہوں اور قاضی نرخ مقرر کرنے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہ کر سکتا ہو تو ایسی صورت میں اہل الرائے اور صاحب بصیرت افراد کے مشورہ سے قیمتیں مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں ۔

اسی مسئلہ کو امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) نے بھی اس طرح بیان کیا ہے ۔

---

[1] مرغینانی ، ہدایہ (کتاب الکراھیة) ج ۴ ، ص ۴۶۹ - ۴۷۰

کہ جب لوگ معروف طریقہ کے مطابق اپنی تجارتی اشیاء فروخت کر رہے ہوں اتفاقاً کسی شے کی قلت یا آدمیوں کی کثرت کی بنا پر اس چیز کا نرخ بڑھ جائے تو تاجروں کو اس بات کا پابند بنانا کہ وہ اس شے کو مقررہ قیمتوں پر فروخت کریں ظلم ہوگا۔

البتہ محتکر جب احتکار کے ذریعہ عوام پر ظلم کر رہا ہو تو اس وقت صاحب امر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جب عوام کو ان اشیاء کی ضرورت ہو تو تاجروں کو اپنا مال قیمت مثل پر فروخت کرنے پر مجبور کرے[1]

کیونکہ اس قانونی وسیلے کا استعمال احتکار کے سدِ باب کے لیے بہت حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں کسی چیز کی قیمت بڑھانے کی غرض سے اس شے کی مصنوعی قلت پیدا کرنا احتکار کہلاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں احتکار کی نہ صرف صراحتاً حرمت بیان کی گئی بلکہ محتکرین کے لیے بہت سی وعیدوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے احتکار کے سدباب کے لیے قرآن و حدیث میں حرمت کے بیان کے علاوہ اسی بیع کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جس سے احتکار کا اندیشہ بھی ہو۔ اس ضمن میں اسلام قاضی کو یہ اختیار بھی دیتا ہے کہ جو شخص اس فعل شنیع کا مرتکب ہو اس کو جسمانی و مالی سزا دینے کے علاوہ اس کا مال اس کی رضامندی کے بغیر عام نرخوں پر فروخت کرنے کا حکم دے۔

اسلام احتکار کے اسلامی معاشرے سے جڑ سے اکھاڑنے کیلیے ایک قانونی وسیلے کو استعمال میں لانے کی بھی اجازت دیتا ہے جسے فقہی اصطلاح میں "تسعیر" کہا جاتا ہے اگرچہ قحط کے دنوں میں جبکہ قحط قدرتی عوامل کی بنا پر ہو تسعیر کی اجازت نہیں دیتا لیکن اگر تاجروں کی مصنوعی قلت خود پیدا کردہ ہو تو حاکم وقت تسعیر کا اختیار رکھتا ہے۔

ان تمام اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا شہری پر امن معاشی زندگی بسر کر سکے۔

---

[1] ابن تیمیہ، الحسبۃ فی لاسلام او وظیفۃ الحکومۃ الاسلامیہ، دار الکاتب العربی (تاریخ و مقام اشاعت نامعلوم) ص ۱۶

اسلام میں بیت المال کا تصوّر

جناب ڈاکٹر حمید اللہ، ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

بیت المال کا لغوی معنی: خزینۃ المال[1] یعنی مال کا خزانہ "حکومت اسلامی کا خزانہ"[2] "مال یا دولت کا گھر"[3]

اصطلاحی تعریف: "کسی مسلم ریاست کے خزانے یا اسلامی سلطنت کے اس خزانہ خاص کو کہتے ہیں جس کو ریاست بلکہ اسلامی حکومت عام رعایا کی اصلاح و بہبود کے لیے خرچ کرتی ہے"[4]

"بیت المال سے مراد مسلمان عوام کا بینک بھی ہے اور قومی خزانہ بھی، ملی جائداد کا ضامن بھی، تجارت کا ادارہ بھی، امانت کا محافظ بھی اور مسلمانوں کے مرکزی ادارے کا سرکاری خزانہ بھی"[5]

بقول مولانا حفظ الرحمٰن رحمہ اللہ اسلام کے معاشی نظام کو بروئے کار لانے کے لیے حکومت ربّانی (خلافت اسلامی) کے لیے خزانہ سرکاری کا وجود ضروری ہے۔ اس خزانہ کے محفوظ مقام کو "بیت المال" کہتے ہیں۔ اور اگرچہ کبھی کبھار "بیت المال" کا اطلاق وسعت کے ساتھ پورے

---

[1] المنجد، (دار المشرق، بیروت، ۱۹۶۰ء) ص ۵۵

[2] عبد الحفیظ بلیادی: مصباح اللغات (دہلی، ۱۳۶۹ھ) ص ۵۵، القاموس الحدیث، ص ۶۰۵

[3] ظفر نیازی: نقاد اللغات (نقاد بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۰ء) ص ۷۶

[4] منشی محبوب عالم: اسلامی انسائیکلوپیڈیا (پیسہ اخبار، لاہور) ۱/۱۵۳

[5] اسلم: اسلام کا جمہوری نظام (لاہور)

بدل اشتراک

فی پرچہ	= ۵۰/ روپے
سالانہ	= ۱۵۰/ روپئے

بانی

مولانا سید محمد متین ہاشمی رحمۃ اللہ علیہ سابق ڈائریکٹر ریسرچ سیل

ناشر

حافظ غلام حسین قائمقام ڈائریکٹر ریسرچ سیل

طابع

لیاقت بلوچ میٹرو پرنٹرز
چیمبرلین روڈ لاہور

قیمت شمارہ ہذا ○ ۱۶۰/- روپئے

ادارہ کا مقالہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

اسلام میں بیت المال کا تصوّر

جناب ڈاکٹر حمید اللہ، ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی

بیت المال کا لغوی معنی : خزینۃ المال[1] یعنی مال کا خزانہ "حکومت اسلامی کا خزانہ"[2]
"مال یا دولت کا گھر"[3]

اصطلاحی تعریف : "کسی مسلم ریاست کے خزانے یا اسلامی سلطنت کے اس خزانہ خاص کو کہتے ہیں جس کو ریاست بلکہ اسلامی حکومت عام رعایا کی اصلاح و بہبود کے لیے خرچ کرتی ہے"[4]

"بیت المال سے مراد مسلمان عوام کا بینک بھی ہے اور قومی خزانہ بھی، ملی جائداد کا ضامن بھی، تجارت کا ادارہ بھی، امانت کا محافظ بھی اور مسلمانوں کے مرکزی ادارے کا سرکاری خزانہ بھی"[5]

بقول مولانا حفظ الرحمٰن رحمہ اللہ اسلام کے معاشی نظام کو بروئے کار لانے کے لیے حکومت ربّانی (خلافت اسلامی) کے لیے خزانہ سرکاری کا وجود ضروری ہے۔ اس خزانہ کے محفوظ مقام کو "بیت المال" کہتے ہیں۔ اور اگرچہ کبھی کبھار "بیت المال" کا اطلاق وسعت کے ساتھ پورے

---

[1] المنجد، (دار المشرق، بیروت، ۱۹۶۰ء) ص ۵۵

[2] عبد الحفیظ بلیاوی : مصباح اللغات (دہلی، ۱۳۶۹ھ) ص ۵۵، القاموس الحدیث، ص ۶۰۵

[3] ظفر نیازی : نقاد اللغات (نقاد بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۰ء) ص ۷۶

[4] منشی محبوب عالم : اسلامی انسائیکلوپیڈیا (پیسہ اخبار، لاہور) ۱/ ۱۵۳

[5] اسلم : اسلام کا جمہوری نظام (لاہور)

لی نظام پر بھی کر دیا جاتا ہے تاہم عام اصطلاح میں مرکزی خزانہ کے محفوظ مقام پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔[1]

"اسلامی ریاست اپنی مالیتی پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے اور اس کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے سرکاری خزانہ قائم کرتی ہے اور سرکاری خزانہ کے محفوظ مقام کو "بیت المال" کہتے ہیں۔" بیت المال "کا لفظ اسلامی ریاست کے پورے نظام مالیات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔"[2]

"Baitul Mall means treasurer, especially that of State and is applied not to the actual building in which the financial business of the State is trasacted but also in a figurative sense to the national exchequer or fiscus"

بیت المال کے بارے میں اسلام کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ اللہ اور مسلمانوں کا مال ہے اور کسی شخص کو اس پر مالکانہ تصرف کا حق نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تمام امور کی طرح بیت المال کا انتظام بھی قوم کے نمائندوں کے مشورے کے مطابق ہونا چاہیے... مسلمانوں کو اس پر محاسبہ کا پورا حق ہے۔[4]

تاریخ وارتقاء: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المال کا باقاعدہ وجود نہیں تھا۔ اس کا قیام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا: علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں: "اسلام میں فاروق اعظم سے پہلے نہ تو اس قدر کثیر رقم آتی تھی کہ جس کے رکھنے کے لیے "بیت المال" یا خزانہ بنایا جاتا اور نہ اس کی ایجاد ہوئی۔ رسول اللہ کے زمانے میں جو رقمیں آتی تھیں وہ کل

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام (دینی کتب خانہ، لاہور، ۱۳۶۱ھ) ص ۱۲۰

[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء) ۵/ ۱۹۸

نور محمد غفاری: اسلام کا نظام مالیات، ص ۴۰

[3] Encyclopedia of Islam, Vol.I, P.598

[4] مودودی: معاشیات اسلام (لاہور، ۱۹۷۵ء) ص ۳۹۱۔

ایک ہی نشست میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی اس کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ جو مال آتا اس کو تقسیم کر دیا جاتا۔ ۱۵ھ میں یا اس کے قریب "بیت المال" کی ابتدا یوں ہوئی کہ بحرین سے پورے سال کا خراج پانچ لاکھ دراہم آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس رقم کثیر کی بابت مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے تجویز دی کہ اس کو ایک سال کے اندر تقسیم کر دی جائے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی مخالفت کی ولید بن ہشام نے بتایا کہ شام کے یہاں خزانہ اور دفتر جدا جدا محکمہ دیکھا ہے حضرت عمرؓ نے اس تجویز کو پسند کیا اور "بیت المال" کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے مدینہ منورہ میں "بیت المال" قائم ہوا اور اس کی نگرانی کے لیے عبداللہ بن ارقم کو منتخب کیا جو ایک معزز صحابی تھے۔ اور حساب و کتاب میں کمال مہارت رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ اور صوبوں اور صدر مقاموں میں "بیت المال" قائم کیے اور اس کے آفیسر جداگانہ مقرر فرمائے۔ مدینہ کے علاوہ اور صوبہ جات اور اضلاع کو یہ ہدایت تھی کہ وہاں کے ضروری مصارف کے لیے رقم نکال کر بقیہ جس قدر ہو سال تمام ہونے پر مدینہ منورہ کے "بیت المال" میں بھیجدیا کریں۔ چنانچہ عمرو بن العاص کو ایک فرمان جاری کیا تھا جس کے الفاظ تھے۔

"فاذا حصل إليك وجمعته اخرجت منه عطاء المسلمين وما يحتاج اليه مما لا بد منه ثم انظر فما فضل بعد ذلك فاحمله إليّ"

ترجمہ: "تجھ کو کل مالیہ وصول ہو جائے تو ان کو جمع کر لے اس میں سے مسلمانوں کے ضروری وظائف اور ضروریات نکال لے اس کے بعد جو کچھ بچ جائے وہ میرے پاس بھیجدے"[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ "بیت المال" کی عمارت تعمیر کروائی[2]

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے "بیت المال" قائم کیا تھا۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون، ترجمہ حکیم احمد حسین (دواخانہ پریس، الہ آباد، ۱۳۴۸ھ) ۴/۱۴۷-۱۴۸

[2] شبلی نعمانی: الفاروق، ص ۴۳

لیکن عموماً خالی رہتا تھا۔ حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے "بیت المال" کو خالی پایا۔[۱]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں "بیت المال" کے سلسلے میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے الگ کوئی طریقہ اختیار کیا ہو بلکہ حضرت عمرؓ کے نظام "بیت المال" کو قائم رکھا۔ بے شک حضرت عثمانؓ کے دور میں "بیت المال" کی آمدنی بڑھ گئی۔[۲]

حضرت علیؓ نے بھی "بیت المال" کی حفاظت میں حضرت عمرؓ کی طرح اہتمام کیا۔ آپ کے چچیرے بھائی حضرت عبداللہ بن عباس نے بصرہ کے "بیت المال" سے دس ہزار کی رقم لے لی تھی۔ حضرت علیؓ کو معلوم ہوا تو وہ رقم اُن سے واپس کروادیا۔[۳]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابو رافع "بیت المال" کے نگران تھے ایک دفعہ انہوں نے "بیت المال" سے ایک موتی اپنی لڑکی کو پہنا دیا تو حضرت علیؓ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ جب فاطمہؓ کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی تو میرے پاس مینڈھے کی ایک کھال تھی جس پر رات کو سوتا تھا اور دن کو اس پر مویشی کو چارہ دیتا تھا ایک خادم تک میرے پاس نہ تھا۔[۴]

خلافتِ راشدہ کے دور حکومت میں "بیت المال" کی آمدنی تسلی بخش تھی صرف سواد اور کوفہ کا خراج حضرت عمرؓ کے آخری عہد میں ایک کروڑ درہم تھا۔ آمدنی خرچ سے بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف سادگی تھی۔ تنخواہوں میں اعتدال تھا۔ خلفاً خود اور ان کے امراء "بیت المال" سے کم فائدہ اٹھاتے تھے۔

اموی دور میں بھی "بیت المال" کا تعلق اسی نہج پر رہا جس طرح کہ حضرت عمر فاروقؓ مقرر کر گئے تھے۔ کوئی قابل ذکر تبدیلی کا ذکر نہیں ملتا صرف خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کچھ

۱۔ شبلی نعمانی : الفاروق، ص ۱۸۱، ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، ۳/ ۱۵۲

۲۔ الطبری، ۲۸۰۴، الفاروق، ص ۳۴۳

۳۔ یعقوبی، ۲/ ۲۳۷

۴۔ ابن الاثیر: ۳/ ۵۹ ازتاریخہ/ معین الدین ندوی: تاریخ اسلام، ص ۲۹۵—۲۹۶

مالی اصلاحات کی تھیں۔ جن کا ذکر قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے کیا ہے ؛

"عبد الملک بن مروان حکمران ہوئے تو انہوں نے لوگوں کے محاصل کے بارے میں از سر نو جائزہ لیا اور محنت کرنے والوں کے لئے مناسب حیثیت میں معاوضہ کا انتظام کروایا،،" [۱]

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے بیت المال کے مصارف میں کافی اصلاحات کیں۔ ملک میں جتنے مجبور اور معذور اشخاص تھے، سب کے نام درج رجسٹر کر کے ان کا وظیفہ مقرر کیا، اگر اس میں کسی عامل سے ذرا بھی غفلت ہوتی تھی تو سخت تنبیہ کرتے تھے [۲] وہ قرض دار جو ناداری کی وجہ سے قرض ادا نہ کر سکتے تھے ان کے قرض کی ادائیگی کی مد قائم کی [۳]

شیر خوار بچوں کے لئے وظائف مقرر کئے [۴] ایک عام لنگر خانہ قائم کیا جس سے فقراء اور مساکین کو کھانا ملتا تھا۔ [۵]

حضرت عمر بن عبد العزیز رح کی ڈھائی سال کی خلافت میں لوگ اتنے خوشحال ہوئے تھے کہ کوئی شخص "بیت المال" سے صدقہ" زکوٰۃ" لینے کے لئے تیار نہ تھے [۶]

عباسی دور میں مالی نظام کم و بیش وہی رہا۔ آمدنی کا سب سے بڑا حصہ خراج تھا۔ بعد کے ادوار آمدنی کے اہم ذرائع خراج اور غیر شرعی ٹیکس رہے ہیں۔ علاؤ الدین خلجی نے خراج مقاسمہ کا طریقہ رائج کیا۔ [۷]

---

۱ ابو یوسف : کتاب الخراج ، ص ۴۱

۲ ابن حجر عسقلانی : الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ، ۵/۸۰

۳ ابن سعد : الطبقات الکبریٰ ، ۵/۲۵۵

۴ ابن سعد : الطبقات الکبریٰ ، ۵/۲۵۷

۵ ابن سعد : الطبقات الکبریٰ ، ۵/۲۵۵

۶ سیرت عمر بن عبد العزیز ، ص ۸۵

۷ مفتی محمد شفیع : اسلام کا نظام اراضی ، ص ۸۷

آج کل تمام اسلامی ممالک (اِلاّ ماشاء اللہ) میں بیت المال کا نظام تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ اس نظام کو از سرِ نو نافذ العمل کرنے کی ضرورت ہے۔

بیت المال کے ذرائع آمدنی

العشر۔ الخراج۔ الجزیۃ۔ الفیٔ۔ الزکاۃ۔ الخمس۔ العشور۔ الوقف۔ اموال فاضلہ مزید محاصل (عارضی ٹیکس) ان کی تفصیل یوں ہے۔

۱/ العشر عشری زمین وہ ہے جس کے باشندے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیں یا فوج کشی کے ذریعے غیر مسلموں کا علاقہ فتح ہو جائے اور وہ زمین مسلمانوں (فاتحین) میں تقسیم کی جائے یا وہ زمین (بنجر) جس کو مسلمان آباد کر لے۔

اگر ندی نالہ اور تالاب سے سیراب شدہ زمین ہے تو اس کی پیداوار پر نصف عشر (بیسواں) زکاۃ فرض ہے[1] قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(وآتوا حقہٗ یوم حصادہ) انعام: ۱۴۱

ترجمہ: جس دن کٹیں (یا توڑے جائیں) ان کا حق ادا کرو۔

اور حدیثِ نبوی ہے:

فیما سقت السماء العشر وفیما سقی بالنضح نصف العشر[2]

جس کا ترجمہ اوپر کیا گیا ہے۔

۲/ الخراج خراجی زمین وہ ہے جس پر مسلمان قوت (فوج کشی) کے ذریعے قابض ہو جائے اور زمین مفتوح غیر مسلموں کے پاس رکھ چھوڑے اور

---

[1] السید سابق: (فقہ السنۃ)

(دار الکتاب، بیروت، ۱۴۰۵ھ) ۱/ ۳۵۵

د ابو یوسف: کتاب الخراج (ادارہ القرآن، کراچی، ۱۴۰۷ھ) ص ۶۹

[2] الجامع الصحیح للبخاری، (نور محمد۔ کراچی) ۱/ ۲۰۱

اس پر خاص ٹیکس مقرر کرے جو وہ ادا کریں[1]

سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران، عراق اور مصر کی زمینوں کو خراجی قرار دیا بعد ازاں بہت سے دوسرے علاقے فتح ہوئے تو ان کی بعض زمینیں خراجی قرار پائیں[2]

جو زمینیں ایک دفعہ خراجی قرار دے دی جائیں ان پر ہمیشہ خراج ہی عائد ہوگا خواہ بعد ازاں وہاں کے باشندے اسلام قبول کر لیں، یا وہ زمینیں مسلمان خرید لیں۔

۳۔ الجزیہ ذمیوں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اس کو جزیہ کہتے ہیں۔ جزیہ فوجی خدمت سے استثنا کے سبب اور جان و مال کے تحفظ کے لیے وصول کیا جاتا ہے۔ اگر ذمی غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے لیے آمادہ ہوں اور ریاست اس پر اعتماد کر سکتی ہو تو ان کو جزیہ سے بری کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بوڑھے، مسکین اور غریب اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی جزیہ سے مستثنیٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے[3]

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب مسلمانوں کو جہاد کے لیے روانہ فرماتے تو غیر مسلموں کے سامنے تین شروط رکھنے کا حکم دیتے تھے:

(ا) قبول اسلام کی دعوت (ب) جزیہ کی ادائیگی (ج) آخری بات جہاد (قتال)[4]

۴۔ الفئ جو مال جنگ بندی کے بعد اور اس ملک کے اسلامی ملک بننے کے بعد ان مفتوح لوگوں سے حاصل ہو وہ فئ ہے۔ یعنی بغیر جنگ (قتال) کے حاصل ہو جائے۔ یہ مال سارے کا سارا بیت المال کا حصہ ہے۔ اس میں خمس (۵/۱) ہی نکالا جائیگا۔

---

[1] السید سابق : فقہ السنۃ ، ۳۵۵/۱
وابو عبید : کتاب الاموال (دار الفکر، بیروت، ۱۳۹۵ھ) ص ۹۳-۹۴ ، ۹۶

[2] مودودی : مسئلہ ملکیت زمین ، ص ۳۳ - ۳۷

[3] الشوکانی : نیل الاوطار ، ۶۳/۸ / امین احسن اصلاحی :
اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق ، ص ۳۷

[4] ابن قدامۃ : المغنی (مکتبہ ریاض، ۱۹۷۱ء) ۴۹۶/۸

اور یہی نوعیت اس مال کی بھی ہے جو جنگ شروع ہونے سے پہلے دشمن سے مل جائے۔ صلح کے نتیجہ میں مفتوح ملک سے حاصل ہونے والا مال بھی فئ میں شامل ہے۔[1]

۵/ الزکاۃ زکاۃ اسلامی ریاست کے ہر عاقل و بالغ و مسلمان پر فرض ہے۔ بشرطیکہ وہ صاحب نصاب ہو نابالغ بچوں، مجنوں افراد کے مال میں زکاۃ کے قائلین ہے اکثر علماء ہیں یعنی جمہور۔ احناف کے نزدیک نابالغ بچوں اور مجنوں افراد کی مملوکہ زمین کی پیداوار میں زکاۃ ہے لیکن مویشی، نقد اور مال تجارت میں زکاۃ نہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ ان کے مال پر زکاۃ فرض ہے۔[2]

مختلف اموال پر زکاۃ کی شرح چاندی کا نصاب بالاتفاق دو سو درہم ہے درم کے وزن میں علماء کا اختلاف ہے پاکستان و ہندوستان میں عام طور پر زکاۃ کا نصاب ۵۲½ تولہ یا ۶۱۲٫۴ گرام کے برابر ہوئے[3] سونے کی وہ کم از کم مقدار جس کے مالک سے زکاۃ وصول کی جائے گا۔ اکثر فقہاء کے نزدیک بیس دینار ہے۔ پاکستان و ہندوستان میں مشہور نصاب ۷½ تولہ یا ۸۷٫۵ گرام ہے۔[4]

زیادہ مناسب راجح مسئلہ یہ ہے کہ سونے کو معیار بنانے کے بجائے چاندی کو معیار مقرر کیا جائے۔ اس بات کی تائید ابومسعود کاسانی (حنفی) نے کی ہے۔ سونے اور چاندی کی شرح زکاۃ ۲½ فیصد سالانہ ہے۔[5] یہی شرح نقد سرمایہ کے لیے بھی ہے۔

---

[1] الماوردی : الأحکام السلطانیہ (المکتبہ التوفیقیۃ مصر) ص ۱۴۳ — ۱۴۵
ابوعبید : کتاب الاموال، ص ۲۷۱ وما بعدھا

[2] ابوعبید : کتاب الاموال، ص ۵۵۲ — ۵۵۳

[3] ابن رشد : بدایۃ المجتہد، ۲۵۵/۱
محمد نجات اللہ صدیقی : اسلام کا نظریہ ملکیت، ۲۳/۲ - ۲۴

[4] ایضًا مذکورہ مراجع

[5] بدائع الصنائع، ۱۸/۲

مال تجارت: ان پر بھی تمام فقہاء (اہل ظاہر کے علاوہ) کے نزدیک زکاۃ فرض ہے بشرطیکہ سامان تجارت کی قیمت سونے یا چاندی کے نصاب کے برابر ہو[1]

تجارتی مال پر زکاۃ عائد کرنے کی حکمت تاجروں کو احتکار اور اکتناز (ذخیرہ اندوزی وغیرہ) سے روکنا ہے اور مصنوعی قلت اور قیمتوں کے چڑھاؤ پر قابو پانا ہے۔

مویشیوں پر زکاۃ: مویشیوں پر زکاۃ کی فرضیت کے لئے درج ذیل شرائط ہیں:

(ا) جانور جنگل میں چرنے والے ہوں (سال کا بیشتر حصہ)

(ب) ان جانوروں کو خاص شخص کی ملکیت میں رہتے ہوئے پورا سال گزر جائے درمیان سال میں نصاب میں کمی نہ آئے[2]

اونٹ کا نصاب پانچ (۵)، گائے بیل اور بھینس کا تیس (۳۰)۔ بھیڑ، بکری اور دنبہ کا چالیس (۴۰) ہے[3]

نقود (بنک نوٹ): نقد روپیہ وغیرہ پر اس صورت میں زکاۃ فرض ہو گی اگر وہ اتنی ہو کہ چاندی کا نصاب یعنی ۵۲½ تولے یا ۶۱۲٫۳۶ گرام چاندی خرید سکے اور یہ نقدی سال کے دونوں طرف پائی جائے[4]

۶۔ الخمس

اسلام کے نظام مالیات میں خمس ۵٪ مندرجہ ذیل اموال پر ہے۔

(ا) مال غنیمت کا ۵٪ (ب) دفینوں کے مال کا ۵٪

(ج) کانوں سے نکلے ہوئے سونے اور چاندی کا ۵٪۔ یہ خمس بیت المال کا حصہ ہے[5]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] الماوردی: الاحکام السلطانیہ، ص ۱۲۸ / ابو عبید: کتاب الاموال، ص ۴۱۲

[2] الماوردی: الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۱

[3] الجزیری: الفقہ علی المذاہب الاربعہ (مصر) ۱/۵۹۶ - ۵۹۷

[4] " " ۱/۶۰۵

[5] غفاری: اسلام کا نظام مالیات، ص ۷۵ - ۷۶

"واعلموا انما غنمتم من شئ فانّ لله خمسه و للرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل "[1]

ترجمہ: جان لو! کہ تم کو کسی چیز سے مالِ غنیمت ملے تو اس میں پانچواں حصہ اللہ کے واسطے ہے اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لیے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "رکاز (دفینہ) پر خمس ہے"[2]

۷۔ العشور مالِ تجارت پر عائد کردہ ٹیکس کا نام "عشور" ہے۔ چونکہ ایران اور روم کی حکومتوں کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی بھی مسلمان تاجر ان کے سرحدوں میں تجارت کے لیے داخل ہوتے تو وہ حکومتیں ان سے ٹیکس وصول کرتیں لیکن غیر مسلم تاجر جب مسلمان ریاست میں آتے تو کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ اس معاملہ کو حضرت موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سمجھایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے یہ فرمان جاری کیا:

"خذ انت منهم كما ياخذون من تجار المسلمين وخذ من أهل الزمة نصف العشر ومن المسلمين من كل أربعين درهما درهم ما زاد فبحسابه"[3]

ترجمہ: اہل ذمہ سے نصف عشر ۲½ اور مسلمانوں سے یہ چالیس درہم پر ایک ۲½ درہم وصول کریں اور زائد مال پر اسی حساب سے وصول کریں۔

۸۔ الوقف بیت المال کی آمدنی کا ایک ذریعہ وقف بھی ہے۔ یہ آمدنی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ یا اسی قسم کی جائیداد سے ہوتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج وغیرہ۔[4]

---

[1] الانفال: ۴۱

[2] النسائی، ۱/۲۴۹ (باب المعدن)

[3] ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۱۳۵

[4] ایضاً، ص ۱۳۲

۹۔ اموال فاضلہ اس میں بیت المال کے متفرق آمدنیاں شامل ہیں۔ مثلاً اگر کسی مسلمان یا ذمی کا انتقال ہو جائے اور وہ لاوارث ہو تو اس کا مال "بیت المال" کا حق ہے۔ اسی طرح کوئی مرتد ہو جائے (العیاذ باللہ) تو اس کا تمام مال ضبط ہو کر "بیت المال" کی ملکیت ہو جاتا ہے۔[1]

۱۰۔ مزید محاصل (عارضی ٹیکس) مزید محاصل عائد کرنے کی ضرورت تین مختلف طریقوں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اولاً یہ کہ شرعی محاصل سے ہونے والی آمدنی ریاست کے بنیادی فرائض: دفاع، جہاد، تعلیم و تربیت، دعوت اسلام، تبلیغ (امر بالمعروف، نہی عن المنکر)، قیام عدل، اور کفالت عامہ کے لیے ناکافی ہو۔ ثانیاً، اسلامی ریاست کو ملک کے معاشی تعمیر و ترقی اور خود اپنے مصارف حکمرانی پورے کرنے کے لیے مزید مال کی ضرورت ہو۔ اس لیے کہ عشر و زکاۃ کی آمدنی کو مصارف حکمرانی پر نہیں خرچ کیا جا سکتا۔

ثالثاً، اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ کے اندر ہر آدمی کی کفالت کا انتظام کرے اور معاشی ناہمواری دور کرنے کے انتظامات کرے۔ اس سلسلہ میں ابن حزم کا موقف ہے:

"ہر ملک کے مال دار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریبوں کی کفالت کریں۔ اگر زکاۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فئے اس کے لیے کافی نہ ہو تو سلطان ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان غریبوں کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے کہ وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کر سکیں اور اس طرح جاڑے اور گرمی کا لباس، اور ایک ایسا مکان جو انہیں بارش، گرمی، دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔"[2]

اس موقف کے مؤیدین میں اور بھی حضرات ہیں۔

---

[1] عبدالوہاب خلاف: السیاسۃ الشرعیۃ (دارالانصار، قاہرہ، ۱۳۹۷ھ) ص ۱۲۸
الحدیث ورد فی سنن ابوداؤد، ص ۴۰۲

[2] ابن حزم: المحلی، ۶/ ۱۵۶۔ شاطبی: الاعتصام (مصر، ۱۹۱۴ء)
مزید دیکھئے ۲/۲۹۵ — ۲۹۸

بیت المال کے اخراجات (مصارف)

ہم مصارف کو چار شعبوں میں کرتے ہیں:

پہلا شعبہ : غنائم، کنز اور رکاز کے خمس اور صدقات پر مشتمل ہے۔

دوسرا شعبہ : زکاۃ، عشر اور مسلمان تاجروں سے حاصل شدہ تجارتی محصول (عشور) سے تعلق رکھتا ہے۔

تیسرا شعبہ : خراج، جزیہ، غیر مسلم تجار سے وصول شدہ عشور، کراء الارض غیر مسلموں سے تحائف اور ضرائب و نوائب (ہنگامی ٹیکس) پر مشتمل ہے۔

چوتھا شعبہ : اموال فاضلہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ان چاروں شعبوں کا اجمالی تعارف :

۱۔ پہلے اور دوسرے شعبے کے مصارف کو قرآنِ مجید نے خود متعین کیا ہے جن کو "مصارفِ ثمانیہ" کہا جاتا ہے۔

۲۔ تیسرا شعبے کے مصارف ہر قسم کے وظائف اور شعبہ ہائے حکومت کے نظم و نسق اور انتظام و انصرام کے اخراجات پر مشتمل ہیں۔

۳۔ چوتھے شعبے کے مصارف رفاہ عامہ اور فلاح کے دیگر تمام کام ہیں[1]

اگر کبھی ایک شعبہ کے مصارف بڑھ جائیں اور دوسرے شعبہ میں بچت ہو تو اس مد سے لیا جا سکتا ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں :

" وعلى الامام ان يجعل لكل نوع بيتا يختصه، وله ان يستقرض من أحدها ليصرفه للآخر"[2]

ترجمہ : امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر نوع کیلئے ایک خاص شعبہ بنائے اور اس کو ایک شعبہ سے قرض لے کر دوسرے پر خرچ کرنے کا اختیار ہے۔

---

[1] ابن عابدین : ردالمحتار (بمبئی، ۱۳۰۹ھ) ۲/۳۸۸-۳۸۹

[2] " : ردالمحتار، ۲/۳۸۹

ایک شعبے کی آمدنی کو دوسرے پر خرچ نہیں کیا جا سکتا جیسے ابو یوسفؒ فرماتے ہیں :

" ولا ینبغی للامام ان یجمع مال الخراج الی الصدقات و العشر لأن الخراج فیئ لجمیع المسلمین و الصدقات لمن سھم اللہ عز وجل فی کتابہ"[1]

ترجمہ : اور امام کو نہیں چاہیئے کہ خراج کو صدقات اور عشر کے ساتھ ملائے کیونکہ خراج سب مسلمانوں کے مشترک آمدنی ہے اور زکاۃ اور عشر متعین افراد کے لیے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

ان شعبہ جات کے مصارف کی تفصیل :

پہلے اور دوسرے شعبہ کے مصارف : ان دونوں کے شعبوں کے مصارف ایک ہی ہیں جنہیں مصارف ثمانیہ کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

واعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خُمُسَہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامی والمسٰکین وابن السبیل ان کنتم آمنتم باللہ وما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان واللہ علیٰ کل شیئ قدیر[2]

ترجمہ : جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے اس میں پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور ان کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے، اگر تم کو یقین ہے اللہ پر (آیۃ)۔

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے :

" انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم "[3]

---

[1] کتاب الخراج ، ص ۸۰

[2] الانفال : ۴۱

[3] التوبۃ : ۶۰

ترجمہ: زکاۃ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکاۃ کے کام کرنے والوں کا اور جن کا دل پرچانا مقصود ہو اور گردنوں کے چھڑانے کے لیے (یعنی قیدیوں اور غلاموں کی رستگاری کے لیے) اور ان کے لیے جو تاوان کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور اللہ کے راستے میں (جہاد کرنے والوں کے لیے) اور مسافروں کے لیے یہ مقرر ہے۔ اللہ کی جانب سے اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

مصارف ثمانیہ کی تفصیلات:

۱، ۲ ـــــ فقراء و مساکین: مصارف زکاۃ میں سب سے اہم حصہ ان دونوں کے لیے ہے اور انہی کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کا ذکر پہلے ہوا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی بھی معاشرہ ان فقراء و مساکین سے خالی نہیں [1] فقراء وہ لوگ ہیں جو اپنی گذربسر کے لیے دوسروں کی مدد کے محتاج ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نصاب سے کم مال رکھتے ہیں۔

مسکین: لفظ مسکین کے اندر وہ تمام اشخاص شامل ہیں جنہیں بڑھاپے یا بیماری یا غیر معمولی حالات نے بالکل ناکارہ اور نکما کر دیا ہو اور وہ اپنی روزی خود نہ کما سکیں۔ امام راغب الاصفہانی کے نزدیک المسکین من لاشئ لہ (یعنی جس کے پاس کچھ نہ ہو) اور یہ فقیر سے ابلغ ہے یعنی بنسبت فقیر کے مسکین زیادہ نادار ہوتا ہے۔

اور بعض فقہاء کے نزدیک مسکین سے فقیر زیادہ تنگدست ہوتا ہے [2] مساکین اور فقراء کے لیے صرف ایک سال یا ایک ماہ کے لیے زکاۃ نہیں دی جائیگی بلکہ ان کے لیے مستقل طور پر زکاۃ دی جائیگی یہاں تک ان سے تنگدستی دور ہو جائے اور صاحب نصاب ہو جائیں اور ضروریات زندگی کے حصول میں رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ ابو عبید نے اس اعرابی کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر محمد بن مسلمہ کی شکایت کی کہ انہوں نے مال زکاۃ سے ان

---

[1] ابراہیم عثمان: نظام مصرف الزکاۃ (الریاض، ۱۴۰۲ھ) ص ۴۷

[2] مفردات القرآن، ص ۴۳۴ اردو ترجمہ والمحلی، ۶/ ۱۴۸

خلاف: السیاسۃ الشرعیہ، ص ۱۳۰

کو محروم رکھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کی گرفت کی اور انہوں نے بھی افسوس اور اظہار ندامت کیا پھر اس مستحق کو اس کا حق ادا کیا۔[۱]

اسلام نے چودہ سو سال پہلے ہی اسلامی ریاست کے بجٹ میں بے روزگاروں معذوروں اور غرباء و مساکین کی امداد اور بحالی کے لیے ایک خاص مستقل حصہ مختص کر دیا جبکہ انگلستان میں امداد محتاجان کا قانون ۱۶۰۱ء میں پاس کیا گیا۔

عاملین علیہا : سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکاۃ کے وصول کرنے، محفوظ رکھنے تقسیم کرنے، اور اس کا حساب و کتاب رکھنے کا کام کرتے ہوں۔ گویا یہ لوگ یہ حصہ بطور حق خدمت لیتے ہیں نہ کہ حصہ بطور حقدار کے۔[۲]

مؤلفۃ القلوب : سے مراد وہ لوگ ہیں جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوں اور ان کو اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے مال دیا جائے۔ اور غیر مسلم کو اسلام سے مانوس کرنے اور اس میں داخل ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے مال دیا جائے۔ یا اس لیے مال دیا جائے تاکہ ان کی قوم میں جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کی دشمنی نہ کریں، فی الجملۃ اسلامی ریاست کے مفاد کی ترویج کے لیے بھی مال دینا اس مد کے تحت آتا ہے۔[۳]

فی الرقاب : سے مراد غلاموں کو آزاد کرنا بھی ہے اور مکاتب غلام بھی مراد لیا گیا ہے کیونکہ مال زکاۃ کے وہی مستحق ہوتے ہیں۔ جو مسلمان قیدی دشمن کے پاس ہوں ان کا فدیہ زکاۃ سے دے

---

[۱] ابوعبید : کتاب الاموال (المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر، ۱۳۴۷ھ) ص ۵۹۹
القرضاوی : فقہ الزکاۃ ، ۲/ ۵۷۸

[۲] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ، ۸/ ۱۷۸ ، الماوردی : الاحکام السلطانیہ ، ص ۱۱۸ ومابعدھا ، ابویعلی : الاحکام السلطانیہ ، ص ۱۱۶

[۳] ابن العربی : احکام القرآن (داراحیاء الکتب العربیہ ، ۱۳۷۶ھ) ۲/ ۹۵۰
ابن تیمیۃ : السیاسۃ الشرعیۃ ، ص ۵۰ — ۵۳ ، المحلی ، ۶/ ۱۴۹
النووی : المجموع ، ۶/ ۲۰۷

کر آزاد کرانا بھی اس کے تحت آتا ہے[۱]

احناف کے نزدیک زکاۃ کی مد سے صرف مکاتب غلام کو دیا جا سکتا ہے۔ غلام خرید کر آزاد نہیں کیا جا سکتا[۲]

الغارمین : سے مراد قرض یا تاوان کے بار سے دبے ہوئے ایسے افراد ہیں جو اگر اپنا قرض پورا ادا کریں تو صاحب نصاب نہ رہ جائیں۔ غارم کا لفظ ان تمام مقروضوں کو شامل ہے جو اپنے ذاتی جائز ضروریات یا مسلمانوں کے مصالح عامہ کے لیے قرض لیتے ہیں[۳]

فی سبیل اللہ : سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ خواہ وہ تلوار سے ہو یا قلم و زبان سے یا ہاتھ پاؤں کی محنت سے اور دوڑ دھوپ سے، سلف میں سے کسی نے بھی اس لفظ کو رفاہ عامہ کے معنی میں نہیں لیا ہے۔ ان کے نزدیک بالاتفاق اس کا مفہوم ان مساعی تک محدود ہے جو اللہ کے دین کو قائم کرنے اس کی اشاعت کرنے اور اسلامی مملکت کا دفاع کرنے کیلئے کی جائیں[۴]

ابن السبیل : یعنی مسافر، خواہ وہ اپنے گھر میں مالدار ہو۔ لیکن حالت سفر میں ہونے کی وجہ سے مدد کا محتاج ہو۔ گھر تک پہنچنے اور ضروریات کی حد تک زکاۃ لے سکتا ہے[۵]

تیسرے شعبہ کے اخراجات :

اس شعبہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں :

(۹) **پہلا حصہ :** مسلح افواج کی تنخواہیں اسی مد سے دی جائے گی[۶] تنخواہوں کے

---

۱ الاصفہانی : مفردات القرآن، ص ۳۶۴ (اردو ترجمہ)
ابو عبید : کتاب الاموال، ص ۷۲۳، ابن العربی، ۹۵۵/۲ (احکام القرآن)

۲ جصاص : أحکام القرآن، ۱۲۴/۳

۳ مفردات القرآن، ص ۶۶۴، الماوردی : الأحکام السلطانیہ، ص ۱۴۰

۴ الأحکام السلطانیہ، ص ۱۴۰، کتاب الاموال، ص ۷۲۶

۵ کتاب الاموال، ص ۷۲۶ـــ۷۲۷، الطبری : تفسیر جامع البیان، ۳۲۰/۱۴

۶ ابن سعد : الطبقات الکبری، ۲۱۷/۳، الماوردی : الأحکام السلطانیہ، ص ۲۳۰

علاوہ اسلحہ اور ہتھیار بھی اس مد سے خریدے جا سکتے ہیں۔[1]

(ب) **عدلیہ اور انتظامیہ کے مصارف** : ان کے مصارف بھی اسی شعبہ سے لیے جائیں گے اور ان اداروں میں کام کرنے والے ججوں اور آفیسروں کو معقول تنخواہیں ہونگی تاکہ وہ رشوت کی طرف مائل نہ ہوں اور ساتھ ساتھ مشاہروں میں بے جا تفاوت بھی نہ ہو۔[2]

(ج) اسلامی ریاست کے وہ افراد جو دین کی ترویج و تبلیغ کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتے ہیں ان کے اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر عائد ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس ادارہ پر خصوصی توجہ دی اور معلمین و مبلغین کے لیے مشاہرے مقرر کیے۔ "ان عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان کانا یرزقان المؤذنین والأئمة والمعلمین"[3] یعنی حضرت عمرؓ اور عثمانؓ دونوں موذنوں، اماموں اور اساتذہ کو وظائف دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعلیم و تدریس قرآن پر مشاہرے مقرر کروائے تھے۔ " ان عمر بن الخطاب کتب الی بعض عماله ان اعط الناس علی تعلم القرآن "[4] حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عمالین (گورنرز) کو یہ حکم بھیجا کہ قرآن کی تعلیم پر مشاہرے دیئے جائیں۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے بھی معلمین کے لیے مشاہرے مقرر کیے تھے[5]

اسی طرح طلبہ کے لیے بھی وظیفے مقرر کئے جاتے تھے۔

بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار میں بھی یہ شعبہ کام کرتا رہا۔ آج بھی اس شعبہ کو باقاعدہ اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

چوتھے شعبہ کے مصارف

بیت المال کا چوتھا شعبہ (جس کے ذرائع آمدنی اموال

۱ے السرخسی : المبسوط، ۱۸/۳

۲ے ابو یوسف : کتاب الخراج، ص ۱۸۶ — ۱۸۷

۳ے ابن الجوزی : سیرة عمر بن الخطاب، ص ۱۶۵

۴ے ابو عبید : کتاب الأموال، ص ۳۳۳

۵ے " : " ، ص ۳۳۳ — ۳۳۴

فاضلہ اور کفالت عامہ کے ٹیکس ہیں) غربا، مساکین، معذورین، یتامیٰ، بیوگان اور محروم المعیشت کی معاشی کفالت سے تعلق رکھتا ہے۔

اگر مال زکاۃ کافی نہ ہو تو اس صورت میں اصحاب ثروت پر فاضل ٹیکس عائد کر کے غریبوں کی کفالت کرنا ضروری ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (ان فی المال حقاً سوی الزکاۃ)[1] مزید انفاق کی ذمہ داری کا تعلق اسی حصہ پر ہے جو آدمی کی اپنی ضروریات سے زائد ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یسئلونك ماذا ینفقون قل العفو)[2]

ترجمہ: اور یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کتنا انفاق کریں۔ کہئے جو کچھ اپنی ضروریات سے زائد ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

"ان اللہ تعالیٰ فرض علی الأغنیاء فی أموالھم بقدر مایکفی فقرأھم، فإن جاعوا أوعروا وجھدوا فبمنع الأغنیاء وحق علی اللہ تعالیٰ أن یحاسبھم یوم القیامۃ، ویعذبھم علیھم"[3]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مال داروں پر ان کے مال میں اتنا حصہ فرض کیا ہے جو غریبوں کے لیے کافی ہو۔ اب اگر یہ لوگ بھوکے، ننگے یا مشقت میں مبتلا ہوں تو اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ مال داران کو ان کا حق نہ دیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ضرور ان مالداروں سے محاسبہ کرے گا اور سزا دے گا۔

ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ کفالت عامہ کے لیے اگر زکاۃ اور فیٔ کی آمدنی کافی نہ ہو تو مال دار پر مزید محاصل (ٹیکس) عائد کیے جائیں گے۔

---

[1] ترمذی : کتاب الزکاۃ

[2] البقرہ : ۲۱۹

[3] المحلی ، ۶/ ۱۵۸

" وفرض على الاغنياء من أهل كل بلد ان يقوموا بفقرائهم، يجبر هم السلطان على ذلك، ان لم تقم الزكوات بهم، ولا فى سائر اموال المسلمين بهم، فيقام لهم بما يأكلون من القوت الذى لابد منه، ومن اللباس للشتاء والصيف بمثل ذلك، وبمسكن يكنهم من المطر، والصيف، والشمس وعيون المارة "[1]

ترجمہ: ہر ملک کے مالدار پر فرض ہے کہ اپنے غریبوں کی کفالت کریں اگر زکاۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فئے اس کے لیے کافی نہ ہو تو سلطان ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان غریبوں کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کر سکیں اور وہ اس طرح جاڑے اور گرمی کا لباس اور ایک ایسا مکان جو انہیں بارش، گرمی، دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ نے بھی مزید محاصل عائد کرنے کی حمایت کی ہے اگر ضرورت ہو۔

" امام کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ ضرورت کی حد تک ٹیکس عائد کرے بشرطیکہ امام عادل ہو۔ مال دار لوگوں پر اتنے محاصل عائد کر دے جس کی آمدنی اس وقت کی ضرورت کے لیے کافی ہو "[2]

بیت المال خالی ہونے کی صورت میں فقطء شوافع نے بھی مزید محاصل عائد کرنے کی اجازت دی ہے[3]

اس موقف کے حامی امام غزالی۔ امام السرخسیؒ اور امام الماوردیؒ وغیرہ ہیں[4]

متعدد علماء نے جن میں ممتاز شافعی فقیہ عزالدین بن عبد السلام بھی شامل ہیں یہ فتویٰ

---

[1] المحلی، ۶/۱۵۶

[2] الاعتصام (مطبعۃ المنار، مصر، ۱۹۱۴ء) ۲/۲۹۵-۲۹۸

[3] امام غزالی: المستصفیٰ (مطبعۃ امیریہ، بولاق، مصر، ۱۳۲۲ھ) ۱/۳۰۳-۳۰۴

[4] الماوردی: الاحکام السلطانیہ، ص ۲۷۶

دیا کہ اگر بیت المال خالی ہو تو مزید محاصل عائد کر کے مال جمع کیا جا سکتا ہے اور اگر بیت المال میں مال موجود ہو تو ایسا کرنا جائز نہیں [۱]

"علماء اسلام اس پر متفق ہیں کہ جب مسلمانوں پر زکاۃ ادا کر چکنے کے بعد، کوئی ضرورت آن پڑے تو اس کے لیے (مزید) مال صرف کرنا واجب ہے۔ امام مالک رحمہ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ فدیہ ادا کر کے اپنے قیدیوں کو آزاد کرائیں خواہ ایسا کرنے میں ان کا سارا مال خرچ ہو جائے۔"[۲]

اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اس کے اندر بسنے والوں کی مکمل کفالت کرے بیت المال سے ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔ مثلاً صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو عارضی بے روزگاری، مرض، بڑھاپے یا کسی حادثہ کے سبب معذور ہو جانے کی حالت میں کارخانہ یا متعلقہ صنعت سے اتنا امدادی وظیفہ دلوانے کا اصول بنایا جا سکتا ہے جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ اسلامی ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے، بآسانی اور بلا تاخیر بیت المال سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں اور ریاست کا کوئی باشندہ بھوکا، پیاسا، ننگا، بے ٹھکانہ اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من ولاہ عزّوجلّ شیئاً من أمور المسلمین فاحتجب دون حاجتھم وخلّتھم وفقرھم احتجب اللہ تعالیٰ عنہ دون حاجتہ وخلّتہ"

قال: فجعل رجلاً علی حوائج الناس"[۳]

ترجمہ: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسے اللہ عزّوجلّ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا اور وہ ان کی ضروریات اور حاجت مندی اور فقر و فاقہ سے بے پرواہ ہو کر بیٹھ

---

[۱] محمد بن ایاس : تاریخ مصر (بولاق، مصر، ۱۳۱۱ھ) ۱/۹۴-۹۵

[۲] قرطبی : احکام القرآن، ۲/۲۴۲

[۳] ابوداؤد، کتاب الخراج والفیء، ۲/۴۰۹

رہا۔ اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہوگا۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے (یہ حدیث سن کر) ایک آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے) پر مقرر کر دیا۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"مامن عبد يسترعيه الله رعيّة فلم يحطها بنصيحة لم يجد رائحة الجنة "[1]

ترجمہ: جس بندہ کو اللہ نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اس کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ حاصل کر سکے گا"

یہ بھی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"الله ورسوله مولیٰ من لا مولیٰ له"[2]

ترجمہ: جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا نگران (سرپرست) اللہ اور اس کا رسول ہے۔

رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من ترك مالاً فلأهله ومن ترك ضياعاً فاليّ"[3]

ترجمہ: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے اہل (یعنی وارثوں) کے لیے ہے۔ اور جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری (کفالت اور مال خرچ کرنا میری ذمہ داری ہے) میرے اوپر ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

"انی حریص علی ان لا اریٰ حاجةً الا سددتها"[4]

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الأحکام، ۲/ ۱۰۵۸

[2] الترمذی، ابواب الفرائض، ص ۳۰۶

[3] الترمذی (نور محمد، کراچی) ص ۳۰۴ (باب ما جاء من ترك مالا فلورثته)

[4] ابن کثیر: البدایة (مکتبة المعارف، بیروت، ۱۹۷۴ء) ۷/ ۴۶

ترجمہ : مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں (کسی کو کوئی حاجت ہو) اسے پورا کروں۔

حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے یہ بھی اعلان فرمایا تھا :

"ومن أراد أن يسأل عن المال فليأتني فإن الله جعلني خازناً وقاسماً"[1]

ترجمہ : یعنی جو آدمی مال چاہتا ہے وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے (بیت المسلمین کا) خزانچی اور تقسیم کنندہ بنا دیا ہے۔

اسی انداز سے ذمہ داری کا احساس حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ کو بھی تھا۔ آپ ؒ نے اعلان فرمایا تھا :

"وما أحد منكم تبلغني حاجة الا حرصت ان أسدّ من حاجته ما قدرت عليه"[2]

ترجمہ : یعنی تم میں سے کسی کی بھی کسی ضرورت کا علم مجھے ہوگا اس کی ضرورت پوری کرنے کی میں حتی الامکان پوری کوشش کروں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط سالی اور دیگر مالی پریشانی میں ہمیشہ عامۃ الناس کا باقاعدہ کفالت کا اہتمام فرمایا[3]

اور یوں بھی ارشاد فرمایا :

"اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی بے سہارا ہو کر مر جائے تو میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے قیامت کے روز اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا"[4]

اسلامی تعلیمات کے اندر کفالت کا تصور صرف اسلامی ریاست کے مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ غیر مسلم

---

[1] ابن جوزی : سیرت عمر بن الخطاب ، ص ۱۰۱

[2] ابن عبد الحکم : سیرت عمر بن عبد العزیز ، ص ۴۱

[3] ابن جوزی : سیرت عمر بن الخطاب ، ص ۷۳

[4] ابن جوزی : سیرت عمر بن الخطاب ، ص ۶۱

رعایا کی کفالت کا ذمہ داری اسلامی ریاست پر ہے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے بیت المال کے نگران کو ہدایت کی تھی کہ ضرورت مند اہل ذمہ کا پتہ لگا کر ان کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔
حضرت عمر فاروق رضؓ کی ایک سائل سے ملاقات ہوئی جو بوڑھا بصارت سے محروم بھیک مانگ رہا تھا آپ رضؓ نے پوچھا کہ تم کس مذہب کے ہو تو اس نے جواب دیا یہودی ہوں۔ آپ رضؓ نے پوچھا تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب دیا بڑھاپے، ضرورت مندی اور جزیہ (ٹیکس) کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ (راوی) کہتا ہے حضرت عمر رضؓ اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور گھر سے اس کو کچھ دیدیا۔ پھر آپ رضؓ نے بیت المال کے خزانچی کو بلوایا اور ان سے کہا۔ اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو۔ کیونکہ اللہ کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے (جزیہ وصول کرکے) کھائیں اور بڑھاپے میں بے سہارا چھوڑیں"
شام کے سفر میں حضرت عمر رضؓ کو راستہ میں کچھ عیسائی ملے جو جزام میں مبتلا تھے۔ آپ رضؓ نے ان کی معذوری کے پیش نظر ان کے لیے روزینہ (وظیفہ) جاری کرنے کا حکم دیدیا۔
ان آثار و واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد معلوم یہ ہوا کہ اسلامی ریاست میں بیت المال کے ذریعہ تمام افراد کی کفالت عین ممکن ہے۔ اسی اسلامی نظام کو نافذ کرنے اور اس کو منظم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔
اللہ تعالیٰ پاکستان کے حکام کو بھی اور عوام کو بھی اسلامی نظام کو کما حقہ نافذ کرنے کی توفیق عطا کریں

پاکستان میں قیام بیت المال

حکومتِ پاکستان نے بیت المال کی قیام کے سلسلہ میں ایک قانون جس کو قومی اسمبلی کے اکتوبر ۱۹۹۱ء میں منعقدہ اجلاس نے پاس کرلیا ہے۔ پاس شدہ یہ مسودۂ قانون میرے پیش نظر ہے۔ اس مسودہ قانون کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مختصر جائزہ پیش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سے فضل اور توفیق کے لیے دعاگو ہوں۔
بیت المال کے ذرائع آمدنی : اس کی تفصیل مذکورہ مسودہ قانون کے صفحہ ۲ پر ہے۔ بیت المال

کے ذرائع آمدنی میں مختلف ذرائع ہیں۔ جن کی تفصیل گذشتہ صفحات میں بیان کرچکا ہوں۔ ان ذرائع آمدنی میں اوقاف، صدقات اور اموال فاضلہ وغیرہ شامل ہیں۔ لہٰذا ان ذرائع آمدنی کی بنیاد پر بیت المال کو چلانا درست اور مشروع ہے۔

اسلامی ریاست اپنی ضروریات کے لیے ہمدرد ممالک، افراد اور اداروں سے قرضے اور عطیات لے سکتی ہے۔ فتح مکہ کے بعد نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مختلف افراد سے بحیثیت مجموعی ایک لاکھ تیس ہزار درہم قرضے لیے تھے آپؐ نے فتح ہوازن کے بعد یہ رقمیں ادا کردیں۔[1]

ہاں اسلامی ریاست خیر خواہ غیر مسلموں کے عطیے اس صورت میں قبول کرسکتی ہے کہ جس کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ممالک کے حکمرانوں کے ہدیے قبول کیے ہیں۔ مصر سے مقوقس نے آپؐ کے خط کے جواب کے ساتھ کچھ ہدیہ بھی بھیجا تھا جسے آپؐ نے قبول فرمایا۔[2]

اسی طرح حبشہ کے حکمران نجاشی نے بھی آپؐ کو تحفہ بھیجا جسے آپؐ نے قبول فرمایا۔[3] بل کے صفحہ ۳ پر مصارف بیت المال اور صفحہ ۱۱ پر اس کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ انکو پیش نظر رکھ کر ہم اس پر یوں اظہار خیال کرسکتے ہیں اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات کا انتظام کرے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔

ہر وہ ضرورت بنیادی ہے جس کی تکمیل پر کسی انسان کی زندگی کی بقاء کا انحصار ہو۔ شریعت کی کسی نص میں ان ضرورتوں کی صراحت نہیں کی گئی ہے مگر خود یہ اصول نصوص سے ثابت ہے۔ ان چار چیزوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کی عدم تکمیل آدمی کی جان کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔ نصوص پر غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ان ضرورتوں کی تکمیل اس اصول کا لازمی تقاضا ہے۔ البتہ مخصوص حالات میں، مخصوص افراد کے لیے اسی اصول کے تحت بعض دوسری ضرورتیں بھی یہی نوعیت اختیار کرسکتی ہیں۔

---

[1] بلاذری : انساب الاشراف، ۳۶۳/۱

[2] ابوالقاسم عبدالرحمٰن : فتوح مصر واخبارھا (بریل لیدن، ۱۹۲۰ء) ص ۴۷

[3] ابوعبید : کتاب الاموال (القاہرہ) ص ۲۵۴

اگر بیت المال کے نظام کو (حکومتِ پاکستان) منظم کرلے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کا کوئی باشندہ بھوکا، پیاسا، ننگا، بے ٹھکانہ اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے گا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے اہل عیال (وارثوں) کے لیے ہے اور جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی (کفالت کی) ذمہ داری میرے سر ہوگی"۔[1]

ان مذکورہ بنیادی ضروریات کے علاوہ ایک اہم ضرورت عام تعلیم بھی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت زید بن ثابتؓ نے یہود کی زبان (سُریانی) لکھنا اور پڑھنا سیکھا تھا۔[2]

صفہ کی اسلامی درس گاہ میں شریک ہونے والے قرآن کریم اور تعلیمات دین کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے تھے چنانچہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے یہاں بعض لوگوں کو لکھنا بھی سکھایا تھا۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں کی تعلیم کے لیے معلّم مقرر کیے تھے۔ جن کو بیت المال سے تنخواہ دی جاتی تھی۔[4]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دیہات کے مسلمانوں کو اسلامی آداب زندگی کی تعلیم دینے کے لیے با تنخواہ معلّم مقرر کیے تھے۔[5]

آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے طالب علموں کے لیے اور ایسے افراد کے لیے جو اپنے علمی مشاغل کے سبب کسبِ معاش سے قاصر تھے وظائف بھی مقرر کیے تھے۔[6]

آپ (حضرت عمر بن عبد العزیز) نے شام میں نابینا افراد، فالج یا کسی دوسرے مزمن مرض کے سبب معذور افراد اور بے سہارا یتیم بچوں کی خدمت کے لیے سرکاری طور پر خادم فراہم

---

[1] ترمذی، ابواب الفرائض (باب ماجاء من ترک مالاً)

[2] ابوداؤد، کتاب العلم (باب روایت حدیث اہل کتاب)

[3] ابوداؤد، کتاب البیوع (باب فی کسب المعلّم)

[4] کنز العمال ج ۴

[5] ابو عبید: کتاب الاموال، ص ۲۶۲ - ابن جوزی: سیرۃ عمر بن عبد العزیز، ص ۷۴

[6] ابو عبید: کتاب الاموال، ص ۲۶۱

کیے تھے۔[1]

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مکہ اور مدینہ کے درمیانی راستہ پر عارضی قیام وطعام کا انتظام کردیا تھا تاکہ ہنگامی طور پر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔[2]

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمان کی روشنی میں حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری کردیا تھا کہ بیت المال سے مقروض افراد کو ادائے قرض کے لیے مالی امداد دی جائے۔[3]

بعض آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر شدہ افراد کو شادی کرنے کے لیے بیت المال سے مالی امداد دی جاتی تھی چنانچہ ایک حکم نامہ والیِ کوفہ زید بن عبد الرحمٰن کو بھیجا تھا جس میں کہا تھا کہ بیت المال کے فاضل مال میں سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے جنہوں نے شادی کی ہو اور ان کے پاس نقد نہ ہو۔[4]

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ محروم اہلِ حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام کرے۔ بعض بنیادی ضروریات کی تکمیل لازمی ہے مگر حتی الامکان دوسری اہم ضروریات کی طرف بھی توجہ کی جانی چاہیئے۔

اسلام کے بڑے بڑے فقہاء اور مفکرین کی جماعت نے اس کی واضح الفاظ میں صراحت کی ہے۔ ان میں ابو یعلی، الماوردی، ابن حزم اور امام غزالی وغیرہ ہیں۔

ضرورت مند کو پرکھنے کے لیے کیا کیا انتظامات ہوں تاکہ کوئی غیر مستحق فرد ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کے سدباب کے لیے حکومتِ پاکستان پر ضروری ہے کہ وہ اخلاقی تربیت، رائے عامہ کے دباؤ اور تعزیری سزاؤں سے اس کا تدارک کرے۔ قابل کار افراد کو ان کی ضروریات کی تکمیل کے پہلو بہ پہلو کام کرنے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے کہ بغیر محنت کیے ہوئے محض ریاست کی مدد کے ذریعہ فرد کو جو معیار زندگی میسر آسکتا ہو وہ اس معیار سے فروتر ہو جو خود کسبِ معاش کے ذریعہ

---

[1] ابن جوزی : سیرۃ عمر بن عبد العزیز، ص ۱۵۴ — ۱۵۵

[2] ابن سعد : طبقات، ۳/۲۸۵

[3] ابو عبید : کتاب الاموال (القاہرہ) ص ۲۵۱

[4] ابو عبید : کتاب الاموال، ص ۲۵۱

حاصل کیا جا سکتا ہے ایسی نفسیاتی، معاشی اور قانونی تدابیر ممکن ہیں جن کے ذریعہ مذکورہ بالا خرابیوں (بے کاری۔ آرام طلبی وغیرہ) کا بڑی حد تک سدباب کیا جا سکتا ہے خود عام انسانوں کی طبیعت ایسی نہیں ہوتی کہ وہ فقر اور امداد طلبی کی زندگی کو دیدہ و دانستہ اس بات پر ترجیح دیں کہ اپنی روزی اور اپنی قوت بازو سے حاصل کی جائے۔ لیکن اس حقیقت اور ہر طرح کی تدابیر کے باوجود اگر معاشرہ میں کچھ افراد ان انتظامات (انتظام بیت المال) سے بے جا فائدہ اٹھاتے رہیں تو یہ خرابی اس عظیم خرابی کے مقابلہ میں بہت معمولی ہے جو اس طرح کا انتظام نہ کرنے کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہے۔ یعنی بہت سے افراد بنیادی ضروریات کی عدم تکمیل، اس کے نتیجہ میں اموات اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنیں، اخلاقی مفاسد اور روحانی اضمحلال اور انحلال۔[1]

بیت المال کی اس مد سے غیر مسلموں کی کفالت بھی جائز ہے یعنی بلا امتیاز جنس، ذات، مسلک یا نسل۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ جب شام کے سفر میں تھے راستہ میں کچھ عیسائی ملے جو جزام میں مبتلا تھے آپؓ نے ان کے لیے روزینہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔[2]

غیر مسلم رعایا کی ضروریات کی تکمیل کا یہ اہتمام صرف حضرت عمرؓ کی مشفقت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ابتدا ہی سے اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک اہم اصول تھا۔ نبی پاکؐ نے اہل حمیر کو مخاطب کرتے ہوئے جو لکھا تھا اس میں اس کی صراحت موجود ہے۔[3]

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں جب اہل حمیر کے ساتھ، جو عیسائی تھے معاہدہ کیا تو اس میں یہ دفعہ بھی رکھی کہ " میں نے یہ ان کا حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آپڑے یا جو آدمی پہلے مال دار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگیں اس کا جزیہ (ٹیکس) ساقط کر دیا جائے گا اور اس کی اور اس کے اہل عیال کی کفالت مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔[4]

---

[1] نجات اللہ صدیقی : اسلام کا نظریہ ملکیت، ۲/۱۲۲

[2] بلاذری : فتوح البلدان، ص ۱۳۵

[3] ابو عبید : کتاب الاموال، ص ۲۰۲

[4] ابو یوسف : کتاب الخراج، ص ۱۷۲

مسودہ بل کے باب چہارم صفحہ ۴ پر چیرمین (امین) اور اراکین کے عہدے کی شرائط بیان کیا گیا ہے۔
ان شروط کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ اس میں علماء، فقہاء، اور اسلامی قانون میں مہارت رکھنے والے اشخاص کے علاوہ باقی افراد کو شامل نہ کیا جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر اس نظام کو چلانا ہے بے شک منتخب نمائندگا اور سماجی کارکنوں میں سے اگر ماہر شریعت و ماہر حسابات میسر آجائیں تو ان کو ضرور ان عہدوں پر فائز کیا جائے۔

اسی موقف کی تائید کے لیے ہمارے پاس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عمل بطور دلیل موجود ہے۔
جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ بیت المال کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے مدینہ منورہ میں بیت المال قائم کیا تو اس کی نگرانی کے لیے عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا جو ایک معزز صحابی تھے ان کی امانت کا یہ حال تھا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مختلف لوگوں کو خطوط لکھواتے اور مہر بھی ثبت کرواتے اور دوبارہ ملاحظہ نہیں فرماتے بلکہ ان پر اعتماد کرتے آپ رضی اللہ عنہ کاتبین وحی میں شامل تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو امین (خازن) بیت المال کی حیثیت سے معقول رقم کی پیش کش کی مگر آپ رضی اللہ عنہ نے قبول نہیں کیا[1]
لہٰذا امین اور دیگر ارکان بیت المال کا شرعی امور خصوصاً مالیات کے معاملہ میں ماہر ہونا اور مخلص و دیانتدار ہونا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا)[2]
ترجمہ: اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ۔
اسی آیت کریمہ میں ہر قسم کے ذمہ کو اس کے اہل کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔ بخاری و مسلم میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس میں امانت میں خیانت کو نفاق کی ایک خصلت قرار دیا ہے۔
نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اونٹ کا ایک بال اپنی دو انگلیوں کے درمیان لے کر فرمایا، "لوگو! اللہ کی قسم تمہارے فئے میں سے میرے لیے یہ بال بھی نہیں، بجز غنیمت کے (پانچویں حصہ کے،

---

[1] ابن حجر عسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، (مصر-۱۳۲۸ھ) ۲/۲۷۳-۲۷۴
تاریخ ابن خلدون، ۴/۱۴۷-۱۴۸

[2] النساء ۴: ۵۸

اور یہ پانچواں حصہ بھی تم پر ہی خرچ کر دیا جاتا ہے۔"[1]

امانت اور اخلاص (اور احتیاط) کی چند مثالیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ شہد کی ضرورت پڑی۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن آپؓ نے پہلے مجمع عام میں منبر پر کھڑے ہو کر مسلمانوں سے اجازت طلب کی اور فرمایا: "اگر تم مجھے اس کے بارے میں اجازت دو، ورنہ اس کا لینا میرے لیے حرام ہے۔"[2]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جب ذاتی کام کرتے یا نفل ادا کرتے تو بیت المال کا چراغ بجھا دیتے اور اپنی ذاتی چراغ استعمال کرتے۔[3]

آپ سے پہلے اموی حکمران شان و شوکت اور شاہانہ کرّ و فرّ پر جو کثیر مصارف بیت المال سے کرتے تھے ان کو آپ نے یک قلم بند کر دیا اور ایسے سارے املاک کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دیا۔[4]

بیت المال کے سلسلہ میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ مال غنیمت میں آئی ہوئی مشک کی خوشبو سونگھنا یا مطبخ عام کی آگ پر وضو کے لیے پانی گرم کرا لینا بھی گوارا نہ تھا۔[5]

خلفاء راشدین رحمہم اللہ بیت المال کے بارے میں اتنی احتیاط برتتے تھے کہ ان میں سے جو لوگ صاحب مال تھے انہوں نے اپنا سارا وقت امور ریاست کی نذر کر دینے کے بعد بھی بیت المال سے کوئی مشاہرہ لینا پسند نہیں کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنی وفات کے وقت یہ وصیت فرمائی کہ انہوں نے اپنے منصب

---

[1] ابن ہشام : سیرۃ النبی (مصر۔ ۱۲۹۵ھ) ۳/ ۱۸

[2] ابن سعد : طبقات ، ۳/ ۲۷۷

[3] ابو یوسف ، : کتاب الخراج ، ص ۱۹

[4] ابن عبد الحکم : سیرت عمر بن عبد العزیز ، ص ۳۵ - ۳۶

[5] ص ۴۴

خلافت میں مشاہرہ کے طور پر جو کچھ لیا ہے اس کا حساب لگا کر اتنی رقم ان کے ترکہ میں سے بیت المال میں داخل کر دی جائے[1]

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی ضروریات اپنے ذاتی مال سے ہی پوری کیں۔[2]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اُس سالانہ وظیفہ کے علاوہ جو فئے کے مال میں سے دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کو بھی ملتا تھا، بیت المال سے اپنی خدمت کے عوض کوئی مشاہرہ نہیں لیا۔[3]

مسودہ قانون کے باب دہم صفحہ ۸ پر حساب اور محاسبہ کے عنوان سے تفصیل دی گئی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر اسلام میں نظام احتساب کی اہمیت اور طریق کار کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔

خلفائے راشدین کے دور میں مدات آمدنی بیت المال کے آفیسروں کا نہایت سختی سے محاسبہ کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احتساب کا ایک مستقل محکمہ قائم کر دیا تھا۔ سختی کے ساتھ آمدنی وخرچ کا حساب رکھوایا جاتا۔۔۔۔۔اس طرح عمال کی تعیناتی کے وقت ان کے مال واسباب (جائداد) کی ایک فہرست تیار کر لی جاتی۔ واپسی پر اگر کسی کا سامان فہرست میں درج شدہ چیزوں سے زیادہ نکلتا تو باقاعدہ بازپرس ہوتی اور زائد مال ضبط کرکے "بیت المال" میں داخل کر دیا جاتا۔

اگر کوئی عامل قصور وار ہوتا تو اسے مجمع عام میں سرزنش کی جاتی اور عہدہ سے معزول کر دیا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ بجز ابو عبیدہؓ اور امیر معاویہؓ کے کوئی عامل بھی حضرت عمرؓ کے بازپرس سے محفوظ نہ رہا۔[4]

حضرت ابو ہریرہؓ کو حضرت عمرؓ نے بحرین کا عامل مقرر کیا تھا جب وہ وہاں سے آئے تو سرکاری مال کے علاوہ دس ہزار خود اپنا مال بھی ساتھ لائے۔ حضرت عمرؓ نے جواب طلبی کے بعد ان کا مال ضبط کر لیا۔[5] اسی طرح آپؓ نے حضرت عمرو بن العاص اور سعد بن ابی وقاص کا

---

[1] تاریخ طبری، ص ۲۱۴۳

[2] ؍؍ ؍؍ ، ص ۲۹۵۳

[3] ابن عبد الحکم : سیرت عمر بن عبد العزیز، ص ۴۳

[4] حمید الدین : تاریخ اسلام (فیروز سنز - ۱۹۵۲ء - لاہور) ص ۱۱۸

[5] ابو عبید : کتاب الاموال (قاہرہ - ۱۳۹۵ھ) ص ۳۴۲ - ۳۴۳

آدھا مال بھی ضبط کرلیا۔[1]

حضرت عمرؓ نے عتبہ بن ابی سفیان کو کنانہ کا عامل مقرر کیا تھا جب واپس آئے تو ذاتی مال بھی ساتھ لائے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے تجارت کی ہے حضرت عمرؓ نے ان کا سارا مال بیت المال میں داخل کرلیا۔[2]

لہٰذا معلوم ہوا کہ بیت المال کا مال اللہ اور مسلمانوں کا مال ہے اور کسی کو اس پر مالکانہ تصرف حاصل نہیں اور مسلمانوں کو اس پر محاسبہ کا پورا حق ہے۔[3]

۱۔ ابن عبدالحکم : فتوح مصر، ص ۱۴۸ . کتاب الاموال : ص ۳۴۲

۲۔ الطبری : تاریخ ۹ ، ص ۲۷۶۶

۳۔ مودودی : معاشیات اسلام (لاہور، ۱۹۸۲ء) ص ۳۹۱

بیت المال سے متعلق چند اہم مراجع

نام کتاب عربی کتب	مؤلف	مکان وتاریخ طبع
۱/ الأحکام السلطانیہ والولایات الدینیۃ	ابوالحسن الماوردی	مصطفی البابی۔ القاہرہ - ۱۳۴۸ھ
۲/ " "	قاضی ابویعلی	مصر
۳/ السیاسۃ الشرعیۃ	تقی الدین ابن تیمیۃ	دارالفکر۔ بیروت - ۱۳۷۸ھ
۴/ "	عبدالوہاب خلاف	مطبع سلفیہ۔ قاہرہ - ۱۳۵۰ھ
۵/ الطرق الحکمیۃ فی السیاست الشرعیۃ	شمس الدین ابن قیم الجوزیۃ	مصر - ۱۳۱۷ھ
۶/ کتاب الأموال	ابوعبید القاسم بن سلام	المکتبۃ التجاریۃ۔ القاہرہ - ۱۳۵۳ھ
۷/ کتاب الخراج	قاضی ابویوسف	مطبع سلفیہ۔ قاہرہ - ۳۵۲ھ
۸/ " "	یحیٰ بن آدم القرشی	القاہرہ

اردو کتب ومقالات

نام کتاب	مؤلف	مکان وتاریخ طبع
۹/ اسلام کا نظام بیت المال	مولانا محمد بخش مسلم	مکتبہ خاور۔ لاہور۔ ۱۹۷۲ء
۱۰/ اسلام کا نظام مالیات	ڈاکٹر نور محمد غفاری	مکتبہ نعمانیہ۔ ڈیرہ اسماعیل خان
۱۱/ اسلام کا نظریہ ملکیت جلد I-II	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور ۱۹۶۹ء
۱۲/ اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام	رفیع اللہ شہاب	اسلام آباد۔ ۱۹۷۳ء
۱۳/ اسلام میں بیت المال کی تاریخ مقالہ ایم اے اسلامیات جامعہ پنجاب - ۱۹۷۰ء	شہناز انور	شعبۂ اسلامیات۔ نمبر لائبریری ۱۹۷۰/۶
۱۴/ اسلامی بیت المال کا دائرہ کار مقالہ ایم۔ اے اسلامیات ۱۹۶۵ء	ناصرہ پروین	" ۔ نمبر ۱۹۶۵ / ۳۰

وصلی اللہ علی النبی وآلہ وسلم

اغنیاء کے اموال میں فقراء کا حق

حافظ محمد سعد اللہ، نائب مدیر

مندرجہ بالا عنوان کی وضاحت اور اس عنوان میں درج دعویٰ کے اثبات سے قبل اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مال و دولت کی جو اضافت اغنیاء اور دولت مندوں کی طرف ہے شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کی اصلیت کیا ہے اور کسی بھی چیز پر انسان کی ملکیت اور اس کے تصرف کی اسلام میں حقیقت کیا ہے؟ بعد ازیں اس چیز کا جائزہ لیں گے کہ شریعت نے اغنیاء کے مال میں فقراء کا حق کیوں اور کن مصالح کے تحت رکھا ہے؟ کن حالات میں رکھا ہے؟ اور یہ حق اغنیاء کے مال سے کس طرح اور کن شکلوں میں وصول کیا جائے گا۔

مال و دولت اور ملکیت کی حقیقت

شریعت اسلامیہ کے اولین اور بنیادی ماخذ قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق مال و دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ کریم کا پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ کائنات کی کوئی چیز حتیٰ کہ اس کا ایک حقیر ذرہ بھی بنیادی طور پر انسان کی مِلک نہیں۔ دوسری اشیاء کا کیا ذکر خود اپنی ذات پر بھی انسان کو اس قسم کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں کہ وہ اپنے جسم و جان کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہے کرے۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشی شریعت میں ناجائز اور حرام ہے۔ اس کے مالکانہ حقوق جن چیزوں پر بھی ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے ہیں۔ اس کی اپنی جان، جسم اور قوتیں، زمین کھیت گھر بار اس کا سارا مال اور اس کی تمام املاک اللہ کی طرف سے اسے امانتاً سپرد کی گئی ہیں۔ وہ ہر قسم کے اموال و مقبوضات کا امین اور کیشئیر ہے نہ کہ خود مختار مالک۔ اپنے قبضے میں کل مال و دولت اور جملہ

اشیاء پر اس ملکیت مجازی ہے نہ کہ حقیقی۔
سورۃ المؤمنون میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ[۱]

"(اے محبوب!) آپ پوچھیں کہ زمین اور اس کی ساری موجودات کس کی ملک ہیں؟ بتاؤ اگر تمہیں علم ہے تو وہ جواب دیں گے سب کچھ اللہ کا ہے"

پھر تھوڑا سا آگے چل کر فرمایا:

قُلْ مَنْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ ...... سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ[۲]

"پوچھیے کہ ساری چیزوں کی بادشاہت کس کے ہاتھ میں ہے ..... تو وہ کہیں گے کہ اللہ کے ہاتھ میں"

سورۃ بقرہ میں فرمایا:

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ[۳]

"اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے"

سورۂ نور میں ارشاد ربانی ہے:

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ[۴]

"اور انہیں (غلاموں کو) اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے"

یہاں مال کی اضافت اللہ کی طرف کر کے یہ حقیقت تازہ اور ذہن نشین کرا دی کہ یہ مال تمہارا اپنا ہے کب؟ جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ ہی کا تو ہو گا۔

اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا "قرآن کا بعض خود اپنے بعض کی تفسیر کرتا ہے"

---

۱ سورۃ المؤمنون: ۸۴-۸۵

۲ ایضاً آیت ۸۸

۳ سورۃ البقرہ: ۲۸۴

۴ سورۂ نور: ۳۳

کے مطابق اس کی وجہ بھی قرآن مجید نے ایک دوسری جگہ بڑے منطقی اور عقلی انداز میں بتا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے لیکن اس کوشش کو بارآور کرنا اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے؟ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے پھر اس بیج کو نپل اور کونپل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے۔ ارشاد ہے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝

"اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا ہم ہیں (اسکے) اگانے والے"[1]

ظاہر ہے زمین میں یہ صلاحیت رکھنا کہ دانہ کو نشو و نما دے سکے، دانہ میں یہ استعداد کہ مٹی سے نمو حاصل کر سکے، گرمی، روشنی، ہوا، پانی وغیرہ سے استفادہ کی قابلیت ان سب کو قوت سے فعل میں لانا۔ مناسب وقت پر مناسب مقدار میں بارش، اوقات مقرر پر مقدار مقرر میں آفتاب کی تابش غرض نظامِ زراعت کی ساری مشینری اور عوامل کو حرکت میں لانا اللہ کا کام ہے نہ کہ بندے کا۔

سورۂ یٰس شریف میں ہے:

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝[2]

"(ہم نے زمین میں چشمے جاری کیے) تاکہ وہ درختوں کے پھل کھائیں حالانکہ یہ پھل ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے سو کیا وہ شکر نہیں کرتے"

اس آیت کریمہ میں "وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ" کا جملہ بڑا قابلِ غور ہے۔ ساری دنیا خدائی قدرت و انتظام سے الگ ہو کر، اگر مل کر بھی کوشش کرے کہ تخم ریزی و آبپاشی کے نتائج غلہ، پھل وغیرہ کی شکل میں حاصل کرے تو ممکن نہیں۔ یقیناً ان مسببات کو انہیں نتائج کی صورت میں ظاہر کرنا خاص الخاص قدرت خداوندی ہے۔ اس اظہر من الشمس حقیقت

---

[1] سورۃ الحدید: ۶۳-۶۴

[2] سورۃ یٰس: ۳۵

کا بھی انسان اگر اعتراف نہ کرے تو اس سے بڑھ کر منعم حقیقی کی ناشکری کیا ہو سکتی ہے۔

ملکیت بطور نائب پھر سورۃ الحدید کی ایک آیت میں بالکل واضح اور صاف صاف لفظوں میں فرما دیا گیا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ مال و دولت ہے۔ اس میں اس کی حیثیت نائب اور خلیفہ کی ہے نہ کہ اصل مالک کی۔ فرمایا:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ[1]

"اور اس مال میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں (اپنا) نائب و خلیفہ بنایا ہے۔

مندرجہ بالا آیات بالخصوص سورۃ الحدید کی یہ آیت اس باب میں واضح نص ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ مال و دولت، زر، زمین، منقولہ وغیرہ منقولہ املاک ہیں ان کا اصل مالک اللہ ہے انسان محض نائب کے طور پر ان املاک میں تصرف کا مجاز ہے۔ ظاہر ہے نائب و خلیفہ کا تصرف انہی حدود کے اندر اور انہی مقاصد کے تحت ہونا چاہیے جو مالک حقیقی نے مقرر کر دیے ہوں۔ نائب کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل مالک کے ہوں اور اسے ان ذمہ داریوں کو بھی ادا کرنا ہوگا جو مالک نے اس پر عائد کی ہیں۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں اس مفہوم کو یوں ادا فرمایا ہے:

ان الاموال التی فی ایدیکم انما ھی اموال اللہ بخلقه وانشائه لها ثم انه تعالیٰ جعلها تحت ید المکلف وتحت تصرفه لینتفع بها علی وفق اذن الشرع فالمکلف فی تصرفه فی هذا الاموال بمنزلة الوکیل والنائب والخلیفة فوجب ان یسهل علیکم الانفاق من تلک الاموال کما یسهل علی الرجل النفقة من مال غیره اذا اذن له فیه[2]

"بیشک وہ تمام اموال جو تمہارے ہاتھوں (قبضے) میں ہیں بلاشبہ وہ اللہ کے اموال

---

[1] سورۃ الحدید: ۷

[2] امام فخر الدین رازی: تفسیر کبیر ج ۲۹ ص ۲۱۶ مطبوعہ مصر

ہے کیونکہ اسی نے ان کو پیدا فرمایا ہے پھر اس نے ان اموال کو مکلف (انسان) کے ہاتھ اور تصرف میں کر دیا تاکہ وہ (انسان) ان سے شریعت کے اذن کے مطابق نفع اٹھائے پس انسان ان اموال کے اندر اپنے تصرف میں بمنزلہ وکیل نائب اور خلیفہ کے ہے جب ملکیت کی حقیقت یہ ہے تو ضروری ہے کہ تم پر ان اموال میں سے خرچ کرنا آسان ہو جیسا کہ آدمی پر اپنے غیر کے مال میں سے خرچ کرنا آسان ہوتا ہے جب کہ وہ اسے اس میں سے خرچ کرنے کی اجازت دے۔

آزاد اور خود مختار ملکیت کی مذمت

مال و دولت کی اصل حقیقت جب معلوم ہوگئی تو پتہ چلا کہ شریعت میں انسان کے مالکانہ حقوق مطلق نہیں بلکہ مقید ہیں۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر "ملکیت" تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد خود مختار اور بے لگام نہیں۔ اس پر دولت کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود اور پابندیاں عائد ہیں مالکانہ تصرف کے باب میں خود کو پوری طرح آزاد سمجھنا گمراہ قوموں اور بگڑے ہوئے افراد کا شعار قارونی فکر اور غیر مؤمنانہ سوچ ہے۔ قرآن مجید نے قوم حضرت شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس سوچ اور نظریے کا مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور اس طرح تجارتی خیانتوں اور مالی معاملات میں بد دیانتی کر کے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو انہوں نے کہا۔

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا [1]

"اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں اسی بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں۔

---

[1] سورۃ ہود: ۸۷

یہ لوگ چونکہ "اموال" کو حقیقتہً "اپنا" (اموالنا) سمجھتے تھے اس لیے "نَفْعَلُ مَا نَشَاءُ" (جو چاہیں کریں) کا دعویٰ اور سوچ اس کا لازمی نتیجہ تھا یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے اور قرآن کریم نے جیسا کہ پیچھے گزر چکا، سورۂ نور میں اپنے اموال "اموالنا" کے لفظ کو "مال اللّٰہ" (اللہ کا مال) کے الفاظ سے بدل کر سرمایہ دارانہ سوچ کی اسی بنیاد پر ضرب لگائی ہے مگر اس کے ساتھ ہی "الَّذِیْ اٰتَاکُمْ" (جو اس نے تمہیں دیا ہے) فرما کر اشتراکیت کی جڑ بھی کاٹ دی ہے جو سرے سے انسانی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے اس کے برعکس اسلام اموال پر انسانی ملکیت کا قائل تو ہے مگر بے لگام اور آزاد ملکیت کا نہیں۔ اسلام میں اس پر مال و دولت کے اصل مالک کی طرف سے کچھ پابندیاں عائد ہیں جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دے وہاں اس کے لیے ایک نائب اور امین کی طرح خرچ کرنا لازمی ہے اور جہاں خرچ کرنے کی ممانعت فرما دے وہاں رک جانا ضروری ہے۔

قرآن مجید قارون کا قصہ سنا کر آگاہ کرتا ہے کہ دنیوی مال و متاع کو الٰہی ہدایت سے بے نیاز ہو کر برتنے کا انجام بہت بُرا ہے۔ ذیل کی آیات اس ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں جس کو شریعت مٹانا چاہتی ہے اور ساتھ ہی ان آیات میں مطلوبہ ذہنیت کی طرف رہنمائی بھی ہے۔

إِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَاٰتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ وَابْتَغِ فِيْمَا اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ قَالَ إِنَّمَا أُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔

"بے شک قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کا فرد تھا لیکن اس نے ان کے خلاف متکبرانہ روش اختیار کی۔ ہم نے اسے اتنے خزانے عنایت فرمائے تھے کہ اس کی

لہ سورۃ القصص : ۷۶-۷۸

کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو گرانبار کر دیتی تھیں۔ (اس کے استکبار کا یہ عالم تھا کہ) جب اس کی قوم نے اس سے کہا "اترا مت اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتا اور جو کچھ اللہ کریم نے تجھے عطا فرما رکھا ہے اس کے ذریعے آخرت (کی بھلائی) طلب کر اور اس دنیا سے (بھی) اپنا حصّہ نہ بھول۔ جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تو بھی (دوسرے انسانوں کے ساتھ) احسان کر۔ اور زمین میں (اپنے اس رویے سے) فساد نہ چاہ بلاشبہ اللہ فسادیوں کو پسند نہیں فرماتا" تو وہ بولا کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اپنے ذاتی علم ولیاقت اور ہنرمندی کی بنا پر ہی ملا ہے۔

اس آیت نے اسلام کے فلسفۂ ملکیت کو خوب کھول کر بیان کر دیا ہے کہ

(ا) انسان کے پاس جو کچھ مال و دولت ہے وہ اللہ کا عطا کردہ ہے (اٰتَاكَ اللّٰهُ)۔

(ب) چونکہ مال و دولت اللہ کا دیا ہوا ہے لہٰذا اس پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے تابع ہوگا۔ اب حکم خداوندی کی دو شکلیں ہیں۔

ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ مال کا کچھ حصّہ کسی دوسرے کو دیدے۔ اس کی تعمیل اس لیے ضروری ہے کہ اللہ نے اس پر احسان کیا ہے تو وہ اسے دوسرے ضرورتمندوں اور حاجتمندوں پر احسان کا حکم دے سکتا ہے (وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔

دوسری شکل یہ ہے کہ وہ انسان کو اس دولت کے تصرف سے روک دے اس کا بھی اس کو اختیار ہے کیونکہ وہ اسے دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین و معاشرے میں شر و فساد پھیلے (وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ)۔

معیشت میں انصاف اور مؤاسات نہ کہ مساوات

قبل اس کے کہ یہ عرض کیا جائے کہ اغنیاء کے مال و دولت میں مال و دولت کے اصل اور حقیقی مالک (اللہ) نے غرباء مساکین مفلسوں یتیموں، اپاہجوں ضرورتمندوں حاجتمندوں یتیموں بیواؤں محروم المعیشت لوگوں اور معاشی زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کا لازمی حق رکھا

ہے، یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ اسلام میں اغنیار اور فقرار کی یہ درجہ بندی اور تقسیم کیوں ہے۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اسلیے اسلام اپنے احکام و قوانین میں کہیں بھی فطری چیزوں کو مٹانا نہیں چاہتا۔ فطرت اور طبیعت کو جہاں بھی مسخ کرنے کی کوشش کی جائے گی اس کا انجام انسانی معاشرے کے لیے نقصان وہ ہی ثابت ہوگا۔ معیشت میں لوگوں کے درمیان تفاوت یعنی کسی کا دولت مند ہونا اور کسی کا حاجتمند، کسی کا امیر ہونا اور کسی کا غریب کسی کا غنی ہونا اور کسی کا فقیر یہ تکوینی مصالح کے تحت ہے نہ کہ تشریعی مصالح کے تحت سورۂ الانعام کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ۔

"(اور وہ (اللہ کریم) وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا اور تم میں سے ایک کے رتبے دوسرے پر بلند کئے تاکہ وہ تمہیں ان چیزوں میں آزمائے جو اس نے تم کو دے رکھی ہیں)۔

یہاں مراد طبعی اور تکوینی فرق مراتب سے ہے کہ کوئی تندرست ہے کوئی بیمار، کوئی قوی کوئی کمزور کوئی حاکم کوئی محکوم، کوئی مرد کوئی عورت، کوئی زردار کوئی نادار، اور ساتھ ہی اس کی علت بھی بتا دی گئی ہے کہ فرقِ مراتب سے مقصود انسانوں کی آزمائش کرنا ہے کہ جس آدمی کو اللہ کریم نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں وہ کہاں تک اپنے مالک کے کہنے اور اس کی مرضی پر ان نعمتوں کو کام میں لاتا ہے اور جسے کسی تکوینی مصلحت کے تحت کوئی چیز کم دی گئی ہے وہ اس پر کہاں تک صابر و شاکر اور قانع رہتا ہے اور کس حد تک حسد کی آگ سے بچا رہتا ہے۔ ہم تکوینی نظام کے مکلف نہیں بلکہ اللہ کے بھیجے ہوئے آخری رسول کے عطا کردہ "تشریعی نظام کے مکلّف ہیں تشریعی احکام ہی سے ہمیں اللہ کی پسند اور ناپسند کا پتہ چلتا ہے۔ اب شریعت میں "درجات معیشت" میں تو فرق کی گنجائش ہے مگر "حق معیشت" میں تفاوت و فرق کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ "حق معیشت" میں مساوات قائم رکھنے کے لیے شریعت نے اللہ کے نائب یعنی خلیفہ کو بہت سے اختیارات دیے ہیں۔ جن کو بروئے کار لا کر وہ اس مساوات کو قائم رکھے گا۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کریم نے قیامت تک زمین کو انسانوں کے ذریعے ہی آباد رکھنا ہے۔ دنیا کی اس آبادی، چہل پہل، رنگا رنگی، حسن اور انتظام کے لیے بھی عقلی طور پر لازمی ہے کہ لوگوں کے درمیان رزق اور معیشت کے معاملے میں تفاوت قائم رہے ورنہ اس نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس چیز کی طرف اشارہ قرآن مجید نے یوں فرمایا ہے!

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا[1]

"ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی دنیوی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کے درجے دوسرے سے بلند کر رکھے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔"

ظاہر ہے لوگوں کا رزق میں ایک دوسرے پر تفوّق صلاحیتوں اور قابلیتوں میں تفوق و برتری کی مانند ہے۔ جس طرح انسانوں میں بعض پست قد ہیں اور بعض دراز قد، بعض بدصورت ہیں اور بعض خوبصورت، بعض محنتی ہیں اور بعض کام چور و بے کار، بعض کند ذہن ہیں اور بعض زیرک، بعض کمزور ہیں اور بعض طاقتور اسی طرح بعض تنگدست ہیں اور بعض کشادہ رزق اور یہ بات اس دنیاوی زندگی کے مزاج و فطرت کے عین مطابق ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو ارادہ و اختیار کی قوت دے کر اسے ابتلاؤ امتحان میں ڈالا ہے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا اس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ انسانوں میں رزق کے معاملے میں فرق مراتب ہو۔ المختصر مال کی کمی بیشی کسی ذاتی زوال وکمال کی دلیل نہیں بلکہ خدا کی تقسیم کردہ معیشت میں بندوں کا پرچہ امتحانی ہے۔ احساس ذمہ داری کا امتحان، اجتماعی اخوت کا امتحان۔ خدا کے بندوں تک ان کا گم شدہ حصہ رزق پہنچانے کی دیانت کا امتحان اور یہ امتحان کہ کمی پر صبر کرنے والے اور بیشی پر شکر کرنے والے اور ان دونوں جذبوں کا حق ادا کرنے والے کون لوگ ہیں۔

اس سلسلے میں معروف ہندی محدث علی متقی نے کنز العمال میں ایک بڑی ایمان افروز اور حقیقت نما

---

[1] سورۃ الزخرف: ۳۲

روایت نقل کی ہے کہ

"اللہ کریمؒ نے حضرت موسیٰ بن عمران کی طرف وحی نازل فرمائی ...... فرمایا اے موسیٰ! میں نے فقیروں اور غریبوں کو (غربت و افلاس میں) اس لیے مجبور نہیں کیا ہے کہ میرا خزانہ ان کے لیے تنگ ہے اور میری رحمت میں ان کے لیے گنجائش نہیں بلکہ یہ چیز اس وجہ سے ہے کہ میں نے مالداروں کے مال میں غرباء کے لیے اتنا فرض قرار دیا ہے جو ان کے لیے کافی ہو۔ میں نے ارادہ کیا کہ مالداروں کی آزمائش کروں کہ غریبوں کے لیے ان کے مال میں میں نے جو کچھ واجب کیا ہے اس کے بارے میں ان کی روش کیسی ہے کیونکہ میں نے ان پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اور دنیا میں ان کے لیے کئی گنا اضافہ کیا کم از کم ایک نیکی کا صلہ دس گناہ۔

اے موسیٰ! غریبوں کے لیے خزانہ بن کر کمزور کیلیے مستحکم قلعہ اور پناہ چاہنے والے کیلیے پناہ دینے والے بنکر رہو گے تو ہر سختی میں میں تمہارا ساتھی اور تنہائی میں تمہارا انیس و غمخوار رہوں گا اور ہمیشہ تمہاری نگرانی و حفاظت کروں گا"[1]

اسلام میں درجاتِ معیشت کے اندر بعض تکوینی مصالح کے تحت فرق ضرور ہے مگر حق معیشت میں اسلام انصاف مؤاسات، ہمدردی اور غمخواری کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ امت مسلمہ کے مختلف افراد کے درمیان اتنا تفاوت پایا جائے کچھ لوگ تو عیش و عشرت کی زندگی گزاریں اور دوسرے لوگ خستہ حال اور پریشان ہوں اور یہ خستہ حالی مفلسی فاقہ کشی اور کپڑوں سے ننگے رہنے کی حد تک جا پہنچے۔ مسلم شریف میں حضرت جریرؓ سے مروی ہے کہ ہم ایک مرتبہ شروع دن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ کچھ لوگ ننگے پاؤں ننگے جسم دھاری دار چادریں پہنے اور تلواریں لٹکائے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ لوگ قبیلہ مضر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اس فقر و فاقہ اور خستہ حالی کو دیکھکر آپؐ کا چہرہ مبارک "متغیر" ہو گیا۔ پریشانی میں آپؐ کبھی اندر تشریف لے جاتے اور کبھی باہر

---

[1] علی متقی: کنز العمال: ۳: ۲۹۳ (حدیث نمبر ۴۸۶۱) طبع حیدر آباد ۱۳۱۲ھ

تشریف لے آتے۔ پھر آپ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز کے بعد آپ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ خطبے میں آپؐ نے سورۃ نساء کی ابتدائی آیت کریمہ اور سورۃ الحشر کی آیت "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" پڑھ کر لوگوں کو اپنے غریب مفلس اور حاجتمند بھائیوں پر صدقے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ ہر آدمی چاہے اس کے پاس ایک ہی دینار ہو، ایک ہی درہم ہو ایک ہی کپڑا ہو ایک صاع گندم کا یا ایک صاع کھجور کا ہو اس میں سے صدقہ کرے حتی کہ اگر اس کے پاس ایک کھجور رہ گئی تو کھجور کے ٹکڑے سے بھی اپنے بھائیوں کی مدد کرے۔ آپ کا فرمانا تھا کہ لوگ گھروں کو دوڑ کھڑے ہوئے اور دھڑا دھڑ حسب توفیق چیزیں لانے لگے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں کپڑوں اور کھانے کے دو ڈھیر لگ گئے۔ صحابہ کرامؓ کے اس جذبۂ ہمدردی اور مؤاسات کو دیکھ کر دوسرے فقراء کی ضرورت کو اس طرح پورا ہوتے دیکھ کر

رأیت وجہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یتھلل کانہ مذھبۃ[1]

میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور خوشی سے یوں کھل اٹھا گویا کہ وہ چمکتا ہوا سونے کا ایک ٹکڑا ہے۔

اسلام نے اس چیز کو ایمان کے ہی منافی قرار دیا ہے کہ ایک آدمی خود تو خوب سیر ہو کر کھالے اور اس کے پڑوس میں رہنے والا رات بھوکے ہی بسر کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔

لیس المؤمن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان[2]

"وہ شخص کامل مؤمن نہیں جو خود تو سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا پڑا ہو"

یہ انسانی طبیعت اور فطرت ہے کہ ہر آدمی مالی خوشحالی، فارغ البالی اور مکان لباس خوراک

---

[1] مسلم شریف کتاب الزکوٰۃ باب الحث علی الصدقۃ ج اص ۳۲۷ طبع قدیمی کتب خانہ کراچی۔
[2] مشکوٰۃ۔ کتاب الآداب باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ص ۴۲۴ طبع سعید کمپنی کراچی۔

وغیرہ کے معاملے میں وسعت و فراخی چاہتا ہے۔ اسلام نے ایمان کا ایک اصول اور تقاضا بنایا ہے کہ جو چیز تم اپنے لیے پسند کرتے ہو جب تک وہی چیز دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرو گے کامل الایمان نہیں کہلاؤ گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ [1]

"تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل ایماندار نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو وہ اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔"

قرآن اپنے ماننے والوں کو جابجا ایثار انفاق الطعام اور ضرورت مندوں پر صدقہ خیرات کی ترغیب دیتا ہے اور ایسا کرنے والوں کی تعریف کرتا ہے۔ انصار کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اللہ کریم نے فرمایا:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ [2]

"اور وہ اپنی ذات کے مقابلے مہاجرین کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود فاقے میں ہی ہوں۔"

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور دیگر ابرار و مومنین کے بارے میں ارشاد ہوا۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا [3]

"اور وہ کھانا کھلاتے رہتے ہیں مسکینوں یتیموں اور غریبوں کو اللہ کی محبت سے۔"

علاوہ ازیں متعدد آیات و احادیث میں غربا و مساکین اور حاجتمندوں پر خرچ کرنے کی ترغیب اور شوق دلایا گیا ہے۔ اور اس امر کو "دین" کی تکذیب کے مترادف ٹھہرایا گیا ہے کہ ایک آدمی کسی یتیم و مسکین کی دلجوئی یا حاجت براری کے بجائے اسے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دے اتنا سنگدل اور بیدرد ہو کہ نہ خود انہیں کھلائے اور نہ ہی دوسروں کو اس بات پہ آمادہ کرے۔

---

[1] بخاری شریف کتاب الایمان ج ۱ ص ۶ طبع کرزن پریس دہلی۔

[2] سورۃ الحشر آیت ۹

[3] سورۃ الدھر: ۸

سورۃ الماعون میں ہے :

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝[1]

"بھلا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے؟ سو وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کے لیے کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔"

غرض اسلام اولاً اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے امارت و غربت کے طبقاتی احساس کو مٹا کر اخوت بھائی چارے ہمدردی غمخواری خیر خواہی اور مؤاسات کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ اسلام ایسے انسانی معاشرے کا خواہاں ہے جس میں معذور و ذی استطاعت اور غرباء و امراء میں باہمی تکافل و تعاون اور ہمدردی کی ایسی فضا قائم رہے جس میں غریب و تنگدست کو اپنی غربت و افلاس کا احساس ہی نہ ہونے پائے اس کی جملہ ضروریات باحسن طریق پوری ہوتی رہیں اور اس کے دل میں امراء کے خلاف کبھی بھی آتش حسد نہ بھڑکے۔ اور اس طرح معاشرہ ایک خاندان کے چھوٹے بڑے افراد کی مانند باہم مل جل کر پیار و محبت اور اطمینان و سکون سے زندگی گزارے۔ یہ بات عدل و انصاف اور اسلام کے مزاج کے خلاف ہے کہ کمزور و نادار افراد بھوکے رہیں، اور فقراء و مساکین خورد و نوش اور لباس و رہائش کی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہیں ایک طبقہ عیش و عشرت، تعیشات عیاشیوں فضول خرچیوں اور رنگ رلیوں میں مصروف ہو اسے اپنی زمینوں آمدنیوں اور دولت کا صحیح اندازہ ہی نہ ہو اور دوسرا طبقہ نانِ جویں کو ترستا ہو مناسب خوراک لباس اور ضروری تعلیم سے بھی محروم ہو۔ ایک طبقہ کے شکاری کتوں کی خوراک کے لیے دیسی گھی ان کی مالش کے لیے بادام روغن آرام کرنے کے لیے ریشمی رضائیاں اور علاج کے لیے سپیشلسٹ ڈاکٹر ہوں اور دوسری طرف غرباء و مساکین اور ان کے لختِ جگر مناسب علاج نہ کرا سکنے، معقول ڈاکٹر سے مشورہ نہ کر سکنے اور دوائی کے لیے اخراجات نہ رکھنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ ایک گروہ کے ہر ہر فرد کے پاس سفری سہولتوں کے لیے

---

[1] سورۃ الماعون ۱ - ۳ -

ائیرکنڈیشنڈ گاڑیاں ہوں اور دوسرے لوگوں کے پاس بائیسکل تک موجود نہ ہو۔ امیر خاندانوں کے لیے میلوں میں پھیلی ہوئی محل نما فلک بوس اور شاندار کوٹھیاں ہوں ان میں چھوٹے سے بڑے تک ہر فرد کے لیے تمام ضرورتوں اور آسائش و تعیشات سے پُر علیحدہ علیحدہ کمرہ ہو، ڈائننگ روم الگ ہو۔ ٹی وی لان الگ ہو، سٹڈی روم الگ ہو۔ تفریح کے لیے لان پارک اور باغیچے الگ ہوں گیراج میں ہر مکین کے لیے الگ الگ گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوں ۔ ان کے باورچی خانوں میں ہمہ وقت ہر موسم کے مطابق انواع و اقسام رنگا رنگ اور مرغن قسم کے کھانے پینے کے سامان تیار رہیں ۔ ان کے اٹیچی اور صندوق طرح طرح کے نفیس سوٹوں اور کپڑوں سے بھرے پڑے ہوں ان کے گھر رات کو بھی دن کا نظارہ پیش کرتے ہوں ۔ معاشی دوڑ اور رنگ و دو میں ترقی کے لیے قرضے اور دیگر سرکاری مراعات ان ہی کے لیے ہوں اور ان کے مقابلے میں انہی کے شہر میں انہی کے محلے میں انہی کی بستی میں اور انہی کے ملک میں بیشمار ایسے لوگ خاندان اور گھرانے موجود ہوں جن میں دس بارہ افراد پر مشتمل خاندان کے سر چھپانے کے لیے ایک جھونپڑی تک نہ ہو۔ اور اگر کسی گھرانے کے لیے "تین مرلہ" یا "پانچ مرلہ" اسکیم کے ایریے میں کوئی چھوٹا موٹا اور ٹوٹا پھوٹا مکان ہو تو ایک ایک کمرے میں ماں باپ بچے اور شادی شدہ نوجوان میاں بیوی اکٹھے رہنے پر مجبور ہوں ۔ جون جولائی کی گرمی اور تپش میں جب سارا دن محنت مزدوری کر کے اور سرمایہ داروں کی فیکٹریوں اور جاگیرداروں کی زمینوں میں بے گار کا خون پسینہ دے کر شام کو واپس تھکے ماندے لوٹیں تو پینے کے لیے فریجوں کی برف اور خوش ذائقہ مشروبات تو کجا ٹھنڈا اور صاف پانی بھی مہیا نہ ہو۔ مرغ پلاؤ گوشت بریانی تو بہت دور کی چیزیں ہیں انہیں روکھی سوکھی دال روٹی بھی صحیح مقدار اور مناسب معیار میں مہیا نہ ہو۔ ان کے نونہالوں کی قسمت میں علم کے حصول کی بجائے بڑوں کے حقے تازہ کرنا اور زندگی بھر جھڑکیں کھا کھا کر اور گالیاں سُن سُن کر مفت میں خدمت کرنا ہو ان کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے کوئی ڈھب کا لباس نہ ہو۔ سردیوں سے بچنے کے لیے ان کے لیے صرف "لنڈا بازار" رہ گیا ہو ۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور عزت کی روٹی کمانے کے لیے انکے واسطے سرکاری طور پر کوئی قرضہ اور رعایت نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ ۔ بہرحال کم از کم ایک اسلامی معاشرے میں اس چیز کی کوئی گنجائش اور جواز نہیں کہ صورتِ حال کچھ یوں ہو سے

ہے اِدھر بھی آدمی ، ہے اُدھر بھی آدمی
اِس کے جوتے پر چمک اُس کے چہرے پر نہیں

فقراء کا حق اسلام نے اگرچہ جگہ جگہ اور بار بار اہل ثروت اور دولتمند حضرات کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دی ہے۔ انہیں فقراء و مساکین، یتامیٰ، بیوگان اور نادار و کمزور لوگوں کی امداد اور فلاح و بہبود پر ابھارا ہے ان کے ساتھ مالی تعاون کی ترغیب اور شوق دلایا ہے اور اس امداد و تعاون اور کارِ خیر پر دنیا و آخرت میں بہترین صلے کا وعدہ فرمایا ہے ترغیبی اور تحریصی ہدایات سے قرآن و سنت بھرے پڑے ہیں اور اسلام نے زیادہ تر اس مقصد کو انہی ترغیبی ہدایات اور اختیاری احکام کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی ہے تاہم جس ذات نے اسلام کو بطور دین انسانوں کے لیے پسند کیا ہے وہ انسان کی خالق ہے اور وہ انسان کی نفسیات اور طبیعت و فطرت سے بھی واقف ہے کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ٥ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ٥ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ٥ (سورۃ المعارج : ۱۹-۲۱)

"بلاشبہ انسان بے ہمت اور لالچی و بخیل پیدا کیا گیا ہے کہ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب اسے خوشحالی ملتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا :

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۔ (سورۃ النساء : ۱۲۸)

"اور انسانی طبیعتوں میں بخل رکھ دیا گیا ہے۔"

اس لیے اس نے صرف ترغیب و تحریص پر اکتفا نہیں کیا اور محض انفرادی و اختیاری صدقہ و احسان پر انحصار کر کے معاشرے کے تنگ دست، مجبور، محروم المعیشت، زندگی کی دوڑ میں کسی طرح پیچھے رہ جانے والے اپاہجوں کمزوروں اور نادار افراد کو اہل ثروت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے اہل ثروت کے مالوں میں قانونی طور پر غرباء کی مالی اعانت کے لیے کچھ لازمی حقوق رکھے ہیں۔ اور اللہ کے نائب یعنی خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ اہل ثروت اگر از خود ان حقوق کو ادا نہیں کر رہے تو ان کی ادائیگی پر انہیں قانوناً مجبور کرے۔

اصحاب ثروت لوگوں کے اموال میں واجبی اور لازمی حقوق میں سب سے بڑا اہم اور ضروری حق " زکوۃ " ہے جسے نبی اکرمؐ نے اسلام کا ایک " بنیادی رکن " قرار دیا ہے۔ جسے تسلیم کئے بغیر کوئی آدمی مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا جسے ہر قیمت پر وصول کیا جاتا ہے۔ اور جس کی عدم ادائیگی کی صورت میں آخرت کے دردناک اور دائمی عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس کا اولین مقصد ہی یہ ہے کہ اس کے ذریعے فقراء و مساکین کی تنگدستی اور محتاجی کا ایسے باعزت طریقے سے علاج کیا جائے جس سے ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ زکوۃ کے ہشتگانہ مصارف میں فقراء و مساکین کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ بعض مقامات پر تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کا مصرف ہی یہ بتایا ہے کہ اسے فقراء و مساکین پر خرچ کیا جائے جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت فرمایا:

تؤخذ من اغنیاء ھم وترد علی فقراء ھم [1]

"یہ زکوۃ ان (اہل یمن) کے اغنیاء سے وصول کی جائے گی اور وہاں کے فقراء پر خرچ کر دی جائے گی۔"

نقد روپیہ مال تجارت سونا چاندی زرعی پیداوار اور مویشی پر سال میں ایک دفعہ مقررہ شرح سے زکوۃ کے علاوہ ایک دوسری قسم کی زکوۃ بھی ہے جو افراد اور اشخاص پر لگتی ہے اسے زکوۃ فطر یا فطرانہ کہتے ہیں۔ یہ واجب زکوۃ اختتام رمضان اور عید الفطر کے آنے پر عائد ہوتی ہے۔ صدقۃ الفطر کے واجب کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے مساکین کے کھانے پینے اور انہیں عید کی خوشیوں میں شامل کرنے کا اہتمام کیا جا سکے [2]

علاوہ ازیں غرباء و مساکین ضرورتمندوں اور حاجتمندوں کی مالی اعانت کے لیے اسلام نے اور بھی کئی ایک واجبی اور لازمی شکلیں متعین کی ہیں مثلاً قسم توڑنے کی کفارے کی ایک شکل ہے۔

فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ ۔ (سورۃ المائدہ ۵ : ۸۹)

---

[1] صحیح بخاری شریف کتاب الزکوۃ ج ۱ ص ۲۰۳ طبع کرزن پریس دہلی۔

[2] مشکوۃ المصابیح باب صدقۃ الفطر ص ۱۶۰ طبع سعید کمپنی کراچی۔

"سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو دیا کرتے ہو یا انہیں کپڑا دینا"

اسی طرح ظہار کے کفارے اور رمضان کا روزہ توڑنے کی سزا کے طور پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مناسک حج کے دوران بعض کوتاہیوں پر "دم" کے نام سے مالی جرمانے اور عید الاضحیٰ کے دن اصحاب ثروت پر قربانی کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ وظیفوں اور مال غنیمت میں خمس، مال فی اور غیر مسلم رعایا پر جذیہ اور خراج وغیرہ سب غربا کی مالی اعانت کے ذریعے ہیں ان تمام چیزوں کی تفصیلات اور متعلقہ مسائل تو ہمارے موضوع سے خارج ہیں تاہم اتنی بات یقینی ہے کہ ان تمام شرعی احکام سے مقصود غربا و مساکین کی مالی حالت کو سدھارنا، بہتر بنانا اور معاشرے میں انہیں ایک باعزت مقام دلوانا ہے۔ اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ مندرجہ بالا ذرائع آمدن کو بروئے کار لاکر غربا و مساکین اور محروم المعیشت لوگوں کی معقول گزران اور بسر اوقات کا انتظام کرے۔ ان کے لیے مناسب کھانے پینے رہائش لباس علاج معالجے اور ضروری تعلیم کا بندوبست کرے۔ اور اس کی حدود کے اندر بسنے والا انسان تو کجا کوئی ذی روح اور جاندار بھی بھوکا نہ مرے۔ اسلام کے نامور اور مایہ ناز خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت کے معاشی مقاصد کو اپنے ایک مختصر قول میں جس عمدگی سے واضح کیا ہے اس سے بڑھ کر کوئی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ فرمایا:

لو مات جمل جیاعا علی شط الفرات لخشیت ان یسألنی الله عنه [1]

"اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بھی بھوکا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلبی کرے گا"

زکوٰۃ کے علاوہ حق

مندرجہ بالا تمام لازمی اور واجبی ذرائع و وسائل کو بروئے کار لانے کے باوجود بھی اگر معاشرے کے ضرورتمند اور مفلوک الحال لوگوں کی ضرورتیں پوری

---

[1] ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ: ۳ : ۳۱ طبع بیروت ۱۹۵۷ء

نہ ہو رہی ہوں تو اسلام اس بات کو جائز قرار دیتا ہے اور اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اصحابِ ثروت کے مالوں میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ٹیکس لگائے جائیں۔ کیونکہ مال میں صرف "زکوٰۃ" ہی لازم نہیں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں۔ سورۃ الذاریات میں متقین کے اوصاف اور مدح بیان کرتے ہوئے اللہ کریم نے فرمایا:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات : ۱۹)

"اور ان کے مالوں میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق رہتا ہے"

اس آیت کے ماتحت امام رازی، قرطبی اور علامہ آلوسی وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہاں حق سے مراد "زکوٰۃ" نہیں بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ حق ہے جس پر ان کی مدح وثنا کی جارہی ہے ورنہ "زکوٰۃ" تو کوئی امتیازی وصف نہیں یہ تو سارے مسلمان دیتے ہی ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی مالدار آدمی پر مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی صراحت فرما دی ہے۔ حضرت فاطمہ بنت قیس بیان کرتی ہیں کہ آنجناب علیہ التحیۃ والتسلیم سے زکوٰۃ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

ان فی المال لحقاً سوی الزکوٰۃ [1]

"بیشک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے"

اس کے بعد بطور استدلال آپ نے سورۃ البقرہ کی آیت لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ (آیت: ۱۷۷) تلاوت فرمائی۔ کیونکہ اس آیت میں "وَاٰتَى الزَّكٰوةَ" کا عطف "اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ" پر ہے اور ظاہر ہے معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان ہمیشہ مغائرت ہوا کرتی ہے۔ دوسرے اس آیت میں پہلے خویش واقارب یتامیٰ اور مساکین کو مال عطا کرنے کو نیکی کہا گیا ہے اس کے بعد اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے جو بجائے خود نیکی اور تقویٰ کے عناصر وارکان ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خویش واقارب اور مساکین وغیرہ پر خرچ کرنا زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔

---

[1] ترمذی شریف ابواب الزکوٰۃ ص ۱۱۹ طبع نور محمد کراچی

مزید انفاق کی حدود

رہا یہ سوال کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد اہلِ ثروت پر مزید انفاق کی کیا حدود ہیں؟ تو اس سلسلے میں قرآن نے اصول یہ بتایا ہے کہ مزید انفاق کا تعلق ذاتی املاک و اموال کے صرف اسی حصے سے ہے جو انسان کی اپنی، اپنے اہل عیال اور اپنے زیرِ کفالت لوگوں کی ضروریات سے فاضل ہو۔ شریعت کے کسی حکم میں تنگی نہیں تکلیف مالا یطاق اسلام کا مزاج ہی نہیں۔ کوئی آدمی اس بات کا قطعاً مکلف نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں اور اپنے زیرِ کفالت لوگوں کو بھوکا پیاسا چھوڑ کر اور انہیں بھک منگا بنا کر دوسرے اہلِ حاجت کی حاجت روائی اور صدقہ و خیرات میں مصروف ہو اور خود دربدر بھیک مانگتا پھرے۔ یہ حوصلہ ہر انسان کا نہیں ہو سکتا ہے۔ عام اصول یہ ہے:

وَيَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ط (سورۃ البقرہ: ۲۱۹)

"اور یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں آپ فرما دیں کہ جو کچھ (تمہاری اپنی ضروریات سے) فاضل ہو۔"

اکثر مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہ آیت حکمِ زکوٰۃ سے منسوخ ہے تاہم کئی علماء کا کہنا ہے کہ

ھی محکمۃ وفی المال حق سوی الزکوٰۃ [1]

یعنی یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور اس کا ثبوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔

امام ابو عبید القاسم بن سلام جنہیں اسلامی معاشیات اور مالیات میں ایک سند کا درجہ حاصل ہے، نے بھی کتاب الاموال حصہ دوم اردو ترجمہ مطبوعہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے صفحہ نمبر ۹۳ تا نمبر ۹۶ میں آیات و احادیث فقہاء صحابہ اور فقہاء تابعین کے حوالے سے اسی بات کو ثابت کیا ہے کہ امراء کے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی غرباء کے حقوق ہیں تفصیل اور مزید اطمینان کے لیے اصل کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔

علمی دنیا کی ایک اور معروف اور نامور شخصیت علامہ یوسف القرضاوی نے امام رازی

---

[1] القرطبی: الجامع لاحکام القرآن: ۳: ۶۱-۶۲ طبع قاہرہ

کے حوالے سے اغنیاء کے فاضل اموال میں فقراء کے حق کا کیا تعلق ہے اور کیوں ہے؟ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں۔

"پہلی بات یہ ہے کہ کسی انسان کو اگر بقدرِ ضرورت مال مل جائے تو وہ زیادہ حقدار ہے اس بات کا کہ اسے اپنے قبضے میں رکھے، کیونکہ دوسرے ضرورت مندوں کی طرح اسے بھی مال کی ضرورت ہے اور اس صورت میں صاحب مال کا حق دوسروں پر مقدم ہے۔ البتہ جب مال اس کی ضرورت سے زائد ہو اور کوئی دوسرا حاجتمند انسان بھی موجود ہو، تو یہاں دو اسباب ایسے جمع ہو جاتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ جہاں تک مال کے مالک کا تعلق ہے اس نے حصولِ مال میں چونکہ محنت و کوشش کی ہے اس لیے اس کا اپنے مال کے ساتھ ایک دلی تعلق ہے اور جہاں تک غریب و محتاج کا تعلق ہے، اسے چونکہ مال کی ضرورت ہے اس لیے وہ بھی مال کے ساتھ ایک قسم کا تعلق رکھتا ہے جب یہ دو متضاد اسباب اکٹھے ہو جائیں تو پھر حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں اسباب میں ہر سبب کا امکان بھر لحاظ رکھا جائے۔ چنانچہ کہا جائے گا کہ مالک کو چونکہ اپنے مال پر حقِ اکتساب اور دلی تعلق کا حق حاصل ہے اور فقیرِ بے نوا کو صرف حقِ احتیاج، لہٰذا ہم مالک کے حق کو اس حد تک ترجیح دیں گے کہ اسے مال کے بیشتر حصّے پر قابض رہنے دیں گے اور غریب کو اس میں سے ایک حصّہ دلوائیں گے تاکہ دونوں کو تاحدِّ امکان مطمئن کیا جا سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی مالدار اپنی اصلی ضروریات سے زیادہ مال کو روکے رکھے اور مال جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اس سے پورا نہ کیا جائے تو یہ ایک طرح سے اللہ کی حکمت تکوینی کو ظہور پذیر ہونے سے روکنے کی کوشش ہوگی جو بالکل جائز نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مال کا ایک حصّہ غریبوں کی طرف لوٹا دیا جائے تاکہ یہ حکمتِ الٰہی معطل نہ ہو کر رہ جائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ فقراء و مساکین اللہ کا کنبہ ہیں اور امراء و اغنیاء اللہ کے خزانچی ہیں کیونکہ ان کے پاس جو مال ہے وہ سب اللہ کا ہے اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ کوئی مالک اپنے خزانچی سے کہے کہ میرے خزانے میں سے کچھ مال میرے کنبے کے

غرباء و مساکین کو دے دے لے

اپنی اصل ضرورت سے زائد مال میں غرباء و مساکین کے "حق" کے پائے جانے کے بارے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا نے ایک عقلی اور منطقی دلیل دی ہے۔ یہ دلیل بھی انتہائی قابلِ توجہ ہے، فرماتے ہیں :

جملہ اشیاء عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان " خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا " تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس ہے اور کوئی شے فی حد ذاتہ کسی کی مملوک خاص نہیں۔ بلکہ ہر شے فی حد ذاتہ کسی کی مملوک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے۔ ہاں بوجہ رفع نزاع و حصول انتفاع قبضہ کو علت ملک مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی رہے اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے کیونکہ باعتبار اصل دونوں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے اور انبیاء و صلحاء اس سے نہایت مجتنب رہے چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہ و تابعین وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمایا۔ بہرکیف غیر مناسب و خلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجۃ سے تو اس کی کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک "من وجہ" اس میں موجود تو گویا شخص مذکور من وجہ مال غیر پر قابض و متصرف ہے اور اس کا حال بعینہ مال غنیمت کا سا تصوّر کرنا چاہیے وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ کل مال غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت و حصول انتفاع "بقدر حاجت" ہر کوئی

لے مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام (اردو ترجمہ) ص ۸۲ طبع البدر پبلیکیشنز۔ لاہور

مال مذکور سے منتفع ہو سکتا ہے۔ ہاں حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے (یعنی خائن شمار ہوگا)[1]

جب کچھ لوگ محتاج اور ضرورت مند ہوں تو اس وقت اپنی ضرورت سے زائد مال دے دینے کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ترغیب ہی نہیں دی بلکہ حکم فرمایا ہے۔ مسلم شریف میں حضرت ابو سعید خدری رض بیان کرتے ہیں کہ :

بینما نحن فی سفر مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ جاءہ رجل علی راحلۃ لہٗ قال فجعل تصرف بصرہٗ یمینًا وشمالا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان معہ فضل ظہر فلیعد بہ علی من لا ظہر لہٗ ومن کان لہٗ فضل من زاد فلیعد بہ علی من لا زاد لہٗ قال فذکر من اصناف المال ما ذکر حتی رأینا انہ لا حق لاحد منا فی فضل[2]

"ایک دفعہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ایک جگہ ایک آدمی اپنی سواری پر سوار آپ ص کے پاس آیا اور (سوال بھری نگاہوں سے) دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ نبی اکرم ص نے اس کی اس احتیاج کو دیکھا تو صحابہ کرام سے فرمایا جس آدمی کے پاس فاضل سواری ہو وہ سواری اس آدمی کو لوٹا دے جس کے پاس سواری نہیں اور جس کے پاس فاضل زاد راہ ہے وہ اس بھائی کو دے دے جس کے پاس زاد راہ نہیں۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے مختلف قسم کے اموال کا ذکر اسی طرح کیا یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے فاضل مال میں کوئی حق نہیں"۔

یہ روایت سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب حقوق المال میں بھی الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔ اس روایت میں " فلیعد بہ "کے الفاظ بڑے قابل غور

---

[1] مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی : اسلام کا اقتصادی نظام : ۴۲-۴۳ مطبوعہ دہلی (بحوالہ ایضاح الادلہ: ۲۶۸)

[2] صحیح مسلم (کتاب اللقطہ) ج ۲ ص ۸۱ طبع قدیمی کتب خانہ کراچی۔

اور معنی خیز معلوم ہوتے ہیں۔ "فلیعط بہ "، یا فلیؤت نہیں فرمایا کہ فاضل سواری یا فاضل توشہ کو اس آدمی کو "عطا" کر دو جس کے پاس سواری یا توشہ نہیں بلکہ "فلیعد بہ" کے الفاظ سے حکم دیا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ وہ فاضل چیز کو "لوٹا دے"، اور کسی شے کو کسی کی طرف "لوٹانے" کا مطلب یہی ہے کہ وہ چیز اسی آدمی کے پاس سے آئی ہوئی تھی۔

یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ فرد کی ضرورت سے زائد مال پر بقدر ضرورت غربار و مساکین کا حق شرعاً ثابت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اپنے قول و عمل سے اسی بات کو ترجیح دی ہے اور یہی بات پسند فرمائی ہے کہ مشکل تکلیف تنگی اور عام افلاس میں افراد کو یہ بھول جانا چاہیے کہ ان کے پاس جو زائد از ضرورت مال ہے وہ ان کی ذاتی ملکیت ہے اور باہم تعاون اور مؤاسات کے ذریعے اللہ کی مخلوق اور اپنے بھائی بندوں کو اس مصیبت اور پریشانی سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلے کی صرف زبانی کلامی نہیں بلکہ عملی ایثار و مؤاسات اور ان کے عام معمول کی ایک مثال دیتے ہوئے ان کے عمل کو اپنی خوشنودی کی سند عطا فرمائی۔ فرمایا :

ان الاشعریین اذا ارملوا فی الغزو او قل طعام عیالھم بالمدینۃ جمعوا ما کان عندھم فی ثوب واحد ثم اقتسموا بینھم فی اناء واحد بالسویۃ فھم منی وانا منھم[1]

"بے شک اشعری قبیلے کے لوگوں کا جب سفر جہاد میں توشہ ختم ہو جاتا ہے یا مدینہ منورہ میں ان کے اہل و عیال کا کھانا کم ہو جاتا ہے تو ان کے پاس (مجموعی طور پر) جو کچھ ہوتا ہے اسے ایک کپڑے میں اکٹھا کر لیتے ہیں پھر اسے ایک برتن کے ذریعے آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں لہٰذا وہ لوگ مجھ سے ہیں (یا میرے ہیں) اور میں ان میں سے ہوں (ان کا یہ عمل میرا عمل ہے)۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیادی ضروریات زندگی یا

---

[1] بخاری شریف (کتاب الشرکہ) ج ۱ ص ۳۳۸ طبع کرزن پریس دہلی

قوتِ لایموت جس پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے، کی فراہمی میں مساوات ہی کو پسند فرمایا ہے اور یوں حقِ معیشت میں اغنیاء اور محروم المعیشت لوگوں کے برابر ہونے کی تلقین فرمائی ہے۔ معروف جدید شاعر احمد شوقی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس غریب پرور پالیسی کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

انصفت اهل الفقر من اهل الغنى   فالكل فى حق الحياة سواء

فلو ان انسانا تخير ملة   ما اختار الا دينك الفقراء

الاشتراكيّون وانت امامهم   لولا دعاوى القوم والعلواء

"اے نبی محتشم! آپ نے غریبوں کو اہلِ ثروت سے پورا پورا انصاف کر کے ان کا حق دلوایا جس سے پتہ چلتا ہے کہ سارے انسان (غرباء و امراء) حقِ زندگی میں برابر ہیں۔ حقِ معیشت میں ان کے درمیان کی تفاوت نہیں۔

۲۔ اگر کوئی آدمی اپنی مرضی سے کسی دین کو اختیار کرے تو یہ بات یقینی ہے کہ کم از کم فقیر لوگ تو آپ کے دین ہی کو اختیار کریں گے۔

۳۔ اشتراکی اور سوشلسٹ لوگ اگر بے جا دعوے نہ کریں اور اپنے فلسفے میں غلو سے کام نہ لیں تو آپ ان کے امام ہیں۔"

ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبِ استطاعت مہاجرین و انصار کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ جن لوگوں کے پاس مال نہیں ہے اور نہ ہی ان کا کوئی قریبی عزیز ہے تو وہ کہاں جائیں؟ فرشتے تو ان کی ضروریات کا انتظام نہیں کریں گے وہ تمہارے مسلمان بھائی ہیں لہٰذا ان بے سہارا لوگوں کی امداد کرو۔ انہیں اپنے ساتھ ملاؤ اور اس طرح ان کی تنگدستی اور مفلوک الحالی کا علاج کرو۔ امام غزالی کی "الاسلام والمناہج الاشتراکیۃ" کے حوالے سے معروف محقق اور ماہر معاشیات ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے یہ روایت لکھی ہے:

عن جابر بن عبد الله انه قال النبى صلى الله عليه وسلم: يا معشر المهاجرين والانصار ان من اخوانكم من ليس له مال ولا عشيرة فليضم احدكم اليه الرجلين

والثلاثة قال جابر فضممت الی اثنین او ثلاثة ومالی الا عقبة کعقبة احدھم من جملی [1]

"حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ؐ نے فرمایا : اے مہاجرین و انصار کی جماعت ! تمہارے بعض بھائی ایسے ہیں جن کے پاس نہ کوئی مال ہے اور نہ ان کا کوئی قبیلہ ہے (کہ ان کی نگہداشت کرے لہذا انہیں چاہیے کہ ایک آدمی ان میں سے دو تین آدمیوں کو اپنے ساتھ (کھانے پینے اور کاروبار وغیرہ میں) شریک کرے ۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ساتھ دو یا تین آدمیوں کو ملا لیا حالانکہ میرے پاس بھی دوسرے لوگوں کی طرح صرف اونٹوں کا ایک گلہ تھا۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیق ؓ بیان کرتے ہیں کہ

ان اصحاب الصفة کانوا ناسا فقراء وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان عندہ طعام اثنین فلیذھب بثالث ومن کان عندہ طعام اربعة فلیذھب بخامس اوسادس [2]

"اصحاب صفہ فقیر لوگ تھے ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا : جس آدمی کے پاس دو آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ (اصحاب صفہ میں سے) تیسرے آدمی کو لے جائے اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں یا چھٹے آدمی کو لے جائے ۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی عادلانہ ، منصفانہ اور ہمدردانہ پالیسی پر بوقت ضرورت صحابہ کرام نے بھی عمل کیا ۔ یعنی جب کچھ لوگوں کے پاس ضرورت سے زائد تھا اور بعض ایسے تھے جن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا تو ایسے حالات میں پیش آمدہ مشکل اور تنگی سے نکالنے کے لیے فاضل سامان یا خوراک میں

---

[1] ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی : اسلام کا نظریہ ملکیت : ۲ : ۲۲۷ طبع اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۶۸ء

[2] ابن حزم : المحلی جلد ۳ : ص ۴۵۴ مسئلہ ۷۲۵ طبع مصر

سب برابر کر دیا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساحل کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو اس لشکر کا امیر مقرر فرمایا یہ لشکر تین سو افراد پر مشتمل تھا اور میں (جابر بن عبداللہ) بھی ان میں شامل تھا۔ ہم مدینہ منورہ سے چل پڑے راستے میں ایک جگہ ہمارا زادِ راہ ختم ہو گیا حضرت ابو عبیدہؓ نے لشکریوں میں سے جس کے پاس جو کچھ زادِ راہ تھا لے کر جمع کر لیا تو یہ کھجور کے دو تھیلے بن گئے۔ آپ ہمیں تھوڑا تھوڑا کر کے روزانہ کھانے کو دیتے رہے یہانتک کہ وہ بھی ختم ہو گیا اس دوران ہمیں صرف ایک ایک کھجور ملا کرتی تھی ......[1]

زمانۂ قحط میں امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی یہ تہیہ کر لیا تھا کہ آئندہ سال تک اگر قحط سالی ختم نہ ہوئی تو ہر کھاتے پیتے گھرانے میں ان کی تعداد کے برابر مزید مفلوک الحال اور قحط کے شکار افراد کو داخل کر دیں گے تاکہ سب لوگ ہلاکت سے بچ جائیں[2] یہ الگ بات ہے کہ اللہ کریم نے کرم فرمایا اور قحط سالی دور ہو گئی اور سیدنا فاروق اعظم کو اپنے اس پختہ ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت پیش نہ آئی۔

حضرت عمر فاروقؓ کا ایک اور قول ابن حزم نے یوں لکھا ہے!

لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنياء فقسمتها على فقراء المهاجرين[3]

"جس بات کا اندازہ مجھے اب ہوا ہے اگر اس کا اندازہ پہلے سے ہو جاتا تو میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلاشبہ ارباب ثروت کی فاضل دولت لے کر فقراء مہاجرین پر تقسیم کر دیتا۔

اغنیاء کے اموال میں فقراء کا کتنا حق ہے؟ اور کتنا ضروری ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں اس پر کتنی وعید ہے؟ اس کا اندازہ باب العلم سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس فرمان

---

[1] بخاری شریف (کتاب الشرکۃ) ج ۱ ص ۳۳۷ طبع کرزن پریس دہلی

[2] ابن سعد: الطبقات الکبری: ۳: ۳۱۶ - ۳۱۷ طبع بیروت ۱۳۷۷ھ

[3] ابن حزم: المحلی جلد ۳ ص ۴۵۵ (مسئلہ ۷۲۵) طبع مصر۔

سے لگایا جا سکتا ہے کہ

ان اللّٰہ تعالیٰ فرض علی الاغنیاء فی اموالھم بقدر ما یکفی فقراءھم فان جاعوا او عروا وجھدوا فبمنع الاغنیاء وحق علی اللّٰہ تعالیٰ ان یحاسبھم یوم القیامۃ ویعذبھم علیہ [1]

اللہ تعالیٰ نے اہل دولت پر ان کے اموال میں ان کے فقراء و مساکین کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ پس اگر فقیر لوگ بھوکے ننگے یا معاشی تنگی میں مبتلا ہوں گے تو اس لیے ہوں گے کہ اغنیاء نے ان کے حق کو روک لیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ یہ امر لازم ٹھہرا رکھا ہے کہ بروز قیامت وہ ان (امراء) کا محاسبہ کرے گا اور فقراء کی اس حق تلفی پر انہیں عذاب دے گا۔

اندلس کے مشہور محدث و فقیہ ابو محمد بن حزم نے "المحلی" میں مسئلہ نمبر ۷۲۵ کے تحت آیات احادیث اور آثار صحابہ سے استدلال کرتے ہوئے اغنیاء کے اموال میں فقراء کے حق اور غرباء کو بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنے کی جو ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے، کے بارے میں جو حتمی فیصلہ یا فتویٰ دیا ہے وہ قابل دید ہے فرماتے ہیں۔

وفرض علی الاغنیاء من اھل کل بلد ان یقوموا بفقرائھم ویجبرھم السلطان علی ذالک ان لم تقم الزکوات بھم ولا فی سائر اموال المسلمین بھم فیقام لھم بما یأکلون من القوت الذی لا بد منہ ومن اللباس للشتاء والصیف بمثل ذالک وبمسکن یکنھم من المطر والصیف والشمس وعیون المارۃ [2]

"اگر کسی علاقے کی زکوٰۃ اور مسلمانوں کے اموال فی سے وہاں کے فقراء کی ضروریات

---

[1] ابن حزم: المحلی جلد ۳ ص ۴۵۵ (مسئلہ نمبر ۷۲۵) طبع مصر

[2] ابن حزم: المحلی جلد ۳ ص ۴۵۲ طبع مصر

زندگی پوری نہ ہو رہی ہوں تو اس علاقے کے اغنیاء پر فرض ہے کہ وہ فقراء و مساکین کی کفالت کا انتظام کریں اور اگر وہ از خود ایسا نہیں کرتے تو بادشاہِ وقت انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ لہٰذا فقراء و مساکین کے لیے اتنی خوراک جس کے بغیر چارہ کار نہیں، اتنا لباس جو انہیں سردی و گرمی سے بچا سکے اور اس قدر مکان جو ان کی بارش گرمی، دھوپ اور سیلاب سے حفاظت کر سکے۔ کا انتظام ہر قیمت پر کیا جائے گا۔

اس کے بعد ابن حزم نے مصری خط کے تقریباً چار صفحات پر مشتمل قرآن و حدیث اقوال صحابہ پر مبنی بڑا جاندار استدلال کیا ہے۔ مزید تفصیلی و تحقیق کے لیے اصل کتاب سے رجوع کیا جائے۔

مندرجہ بالا تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کریم نے اہل ثروت اور غنی لوگوں کے اموال میں فقراء و مساکین، ضرورت مندوں۔ حاجت مندوں، بیوگان، یتامیٰ، اپاہجوں۔ مفلوک الحال محروم المعیشت تنگدست اور فقر و فاقہ میں مبتلا انسانوں کے بہت سے واجبی اور رضا کارانہ حقوق رکھے ہیں اور "حق" وہ چیز ہے جس کا قانوناً مطالبہ کیا جا سکتا ہے اللہ کریم جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اور اس نے ہر جاندار کے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ اس ذمہ داری کو اپنے نائب اور خلیفہ کے ذریعہ پورا کرانا چاہتا ہے۔ جس معاشرے میں معاشی توازن اور اعتدال نہیں۔ جہاں کچھ لوگ بنیادی ضروریاتِ زندگی سے ہی محروم ہوں۔ جہاں بعض لوگوں کے پاس رمقِ حیات باقی رکھنے کے لیے ضروری خورد و نوش کا سامان نہ ہو تو ظاہر ہے وہاں کے اہل دولت لوگ (جیسا کہ حضرت علی المرتضیٰ کا قول ابن حزم کے حوالے سے اوپر گزرا) غرباء کی حق تلفی کر رہے ہیں ورنہ ایسی صورت حال پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہمارے ملک جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، کے اندر جو معاشی ناہمواری۔ ناانصافی عدم توازن اور عدم اعتدال نظر آتا ہے اس کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں کے وڈیرے سرمایہ دار جاگیردار زمیندار صنعت کار اور بڑے بڑے کاروباری لوگوں پر غرباء و مساکین اور بے سہارا لوگوں کی کفالت کے لیے اضافی ٹیکس تو کجا وہ زکوٰۃ نہ دیں تو بھی ان کی گرفت کے لیے حکومت کے پاس کوئی قانون نہیں۔ بنکوں میں ان حضرات کے کھاتے عموماً "کرنٹ اکاؤنٹ" میں ہوتے ہیں اور "کرنٹ اکاونٹ" میں جمع اربوں کھربوں رقم سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی۔ لے دے کے "سیونگ اکاؤنٹ"

کے کھاتوں سے ہر سال یکم رمضان کو زکوٰۃ کاٹ جاتی ہے مگر ان کھاتوں سے بھی یکم رمضان سے قبل ہی اکثر لوگ زکوٰۃ سے بچنے کی خاطر پیسہ نکلوا لیتے ہیں۔ جہاں اہل ثروت از خود پوری پوری زکوٰۃ نہ دیتے ہوں اور نہ ہی حکومت کے پاس وصولی کا کوئی قانون ہو جہاں کے سرمایہ دار غریب مزدوروں کے خون پسینہ کی راہ سے کمائی ہوئی دولت کو بیرون ملک منتقل کر دیتے ہوں جس پر نہ کوئی زکوٰۃ اور نہ کوئی دیگر ٹیکس بلکہ سود کی شکل میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا رہتا ہو۔ پھر باہر سے امداد کے نام پر جو پیسہ آتا ہو اس کا بڑا حصہ بھی اپنے سیاسی اثر و رسوخ سے قرضوں کے نام پر یہی سرمایہ دار لے لیتے ہوں اور بعد میں بلیک میلنگ کے ذریعے معاف بھی کرا لیتے ہوں تو وہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر کیوں نہیں ہوگا۔ وہاں سے غربت و افلاس کا خاتمہ کیسے کیا جائے گا؟

ع این خیال است و محال است و جنوں

اللہ کرے ہماری حکومتوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ شریعت کے مطابق ملک کے معاشی نظام کو استوار کریں۔ شریعت یہی چاہتی ہے کہ درجات معیشت میں تفاوت کے باوجود حق معیشت میں مساوات رہے۔ امراء و غرباء میں باہمی ہمدردی، خیر خواہی، غمخواری، ایثار اور تکافل و تعاون کی ایسی فضا قائم ہو کہ اسلامی حکومت میں بسنے والا کوئی انسان بغیر کسی تخصیص کے بھوکا پیاسا اور محتاج نہ رہے۔ کوئی آدمی ایسے فقر، تنگدستی اور قلت سے دوچار نہ ہو جس سے بعض اوقات انسان "احسن تقویم" سے گر کر "اسفل سافلین" میں جا پڑتا ہے جو تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی گراوٹ کا باعث بنتی ہے جس کی وجہ سے انسان کے اندر شریعت کے مطلوبہ اوصاف اور خوبیاں پیدا نہیں ہو سکتیں جو انسان کو بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتی ہے اور جس سے خود رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عالی ہمت ذات نے پناہ مانگی ہے۔ بہر حال شریعت کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ؎

نکتہ شرع مبین این است و بس
در جہاں محتاج باشد نہ کس

ٹیکس کی شرعی حیثیت

جناب مولانا فضل الرحمٰن بن محمد

ٹیکس انگریزی کا لفظ ہے اور یہ اس رقم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو حکومت کے چلانے کے لیے مختلف صورتوں میں لوگوں سے وصول کی جاتی ہے۔ اس کی وصولی ایک نظام کے تحت ہوتی ہے اور جن لوگوں پر ٹیکس عائد ہو جاتا ہے۔ اگر وہ وقت مقررہ پر ادائیگی نہ کریں تو ان کے خلاف باقاعدہ قانونی کاروائی کی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں ٹیکس کی عمومی دو صورتیں ہیں۔ ایک بالواسطہ اور دوسری بلاواسطہ۔

بالواسطہ سے مراد وہ ٹیکس ہیں جو عوام الناس ادا تو کرتے ہیں لیکن ان کو پتہ نہیں چلتا۔ جیسے پیٹرول، بجلی، گیس اور دوسری وہ اشیاء کہ جن کی خرید و فروخت میں ٹیکس شامل ہوتا ہے اور جو ٹیکس کسی شخص کی ذاتی آمدنی اور کمائی پر عائد ہوتا ہے۔ اس کو بلاواسطہ کہا جاتا ہے۔

ٹیکس کی تاریخ

کہا جاتا ہے کہ یونان اور روم میں سب سے پہلے استعمال ہونے والی اشیاء پر ٹیکس لگایا گیا۔ درآمدی ڈیوٹی کو اندرونِ ملک بننے والے مال پر وصول ہونے والی ڈیوٹی پر ترجیح دی جاتی تھی۔ جنگ کے دنوں میں جائداد پر بھی عارضی طور پر ٹیکس عائد کر دیا جاتا تھا۔ پھر اس کا دائرہ کار جائداد کی خرید و فروخت تک وسیع کر دیا گیا۔ یونان اور روم میں آزاد اور غلام اور اسی طرح قومی اور غیر قومی باشندوں میں ٹیکس کے بارے میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ روم میں استعمال ہونے والی اشیاء اور درآمدات پر ڈیوٹی کے علاوہ اور بھی بلاواسطہ ٹیکس تھے۔ ان میں اصول یہ کارفرما تھا کہ ہر شخص خراج ادا کرے۔ جولیس سیزر کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ایک فیصد سیلز ٹیکس (SALESTAX) نافذ کیا گیا۔ صوبوں کی آمدنی کا زیادہ تر دارومدار شخصی اور زرعی

زمینوں پر عائد کردہ ٹیکسوں پر تھا۔ آغاز میں یہ نہ دیکھا جاتا تھا کہ زمین آباد ہے یا غیر آباد۔ جیسا کہ فارس اور مصر میں بھی کیا گیا لیکن بعد میں زمین کی پیداوار کا دسواں حصّہ (۱/۱۰) زمیندار سے وصول کر لیا جاتا تھا۔

جولیس سیزر سے پہلے ٹیکسوں کو اکٹھا کرنے کی ذمہ داری زمینداروں میں سے کسی شخص کے سپرد کر دی جاتی اور ٹیکسوں میں سے کچھ فیصد حصّہ اس کو معاوضہ کے طور پر دے دیا جاتا۔ لیکن جولیس سیزر نے یہ ذمہ داری سرکاری افسروں کو سونپ دی۔ قرونِ وسطیٰ میں بالواسطہ ٹیکسوں کی جگہ بلاواسطہ ٹیکسوں نے لے لی۔ جن میں زیادہ تر درآمدی ڈیوٹی اور مارکیٹ فیس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ شہروں میں لوگ ٹیکس ادا کرنے کے عادی ہو گئے۔ کھانے پینے کے سامان پر تجّار اور خریداروں نے ٹیکس کا بوجھ اٹھا لیا۔ جرمنی اور اٹلی میں بھی چند بلاواسطہ ٹیکس عائد کیے گئے جو غریبوں کی ذات اور امیروں کے مال پر ہوتے تھے[1]

سب سے پہلے جس ملک نے عام انکم ٹیکس کے نظام کو اپنایا وہ برطانیہ ہے۔ نپولین بونا پارٹ کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے برطانوی حکومت نے ۱۷۹۹ء میں دو سو[2] پونڈ سے زیادہ ہونے والی آمدنی پر دس فیصد ٹیکس لگا دیا لیکن ساٹھ پونڈ سے کم آمدی کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

۱۸۱۰ء میں جب لڑائی ختم ہوئی تو ۱۸۴۲ء تک برطانوی باشندوں کو ٹیکس کے بوجھ سے آزاد کر دیا گیا۔ لیکن وزیرِ اعظم سر روبرٹ پیل (SIR ROBERT PEEL) نے بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے پھر سے ہنگامی طور پر ہر پونڈ پر سات پنس ٹیکس عائد کر دیا۔ ۱۸۸۰ء تک برطانوی رعایا ٹیکس ادا کرنے کی عادی ہو گئی۔ جس کی وجہ سے ٹیکس ہمہ وقتی معمول بن گیا۔ ۱۹۱۰ء میں ٹیکس دہندہ میں سے جس کی آمدنی پانچ سو پونڈ سے زیادہ نہ ہوتی اس کو ہر بچہ کے لیے دس پونڈ کی چھوٹ دے دی گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر چھ شلنگ کے حساب سے سوپر ٹیکس (SUPER TAX) بھی عائد کر دیا گیا[2]

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۷ ص ۱۰۷۷ تا ۱۰۷۸

[2] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۹ ص ۲۷۵

جرمنی کے صوبہ پروسیا میں ۱۸۵۱ء میں ٹیکس لگانے کی کوشش کی گئی لیکن ۹۲-۱۸۹۱ء میں اصلاح کے بعد اسے از سر نو مرتب کیا گیا۔ ۱۹۱۳ء تک جرمنی کے سارے صوبوں میں باقاعدہ نافذ ہو گیا۔

فرانس میں ٹیکس لگانے کی کوشش کا آغاز ۱۸۷۰ء میں ہوا لیکن نفاذ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم سے دو ہفتے پہلے ہوا[1]

اٹلی میں پہلی بار آمدنی، زمین، عمارات اور منقولہ دولت پر ۱۸۶۴ء میں ٹیکس عائد ہوا۔

سویڈن میں ٹیکس لگانے کی ابتدا ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔

امریکہ میں صحیح طور پر ٹیکس کا نفاذ ۱۹۱۳ء میں دستور کی سولہویں ترمیم کے ذریعے ہوا۔ حالانکہ امریکہ کی باہمی خانہ جنگی کے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۲ء تک چھ سو ڈالر سے زائد آمدنی پر تین فیصد اور دس ہزار ڈالر پر پانچ فیصد وصول کیا جاتا تھا بعد میں ایک ترمیم کے ذریعے پانچ ہزار ڈالر سے زائد آمدنی پر دس فیصد شرح کر دی گئی۔

۱۸۹۳ء میں صدر امریکہ گروور کلیولینڈ GROVER CLEVELAND نے جب دوبارہ ٹیکس لگانے کی کوشش کی تو سپریم کورٹ نے اسے غیر دستوری قرار دے کر ختم کروا دیا لیکن دستور میں ترمیم کے بعد جب ٹیکس کا نفاذ ہوا تو اس وقت زیادہ سے زیادہ شرح پانچ لاکھ ڈالر سے زیادہ آمدنی پر چھ فیصد رکھی گئی۔ لیکن پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان شرح اس تیزی سے بڑھی کہ جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو اس وقت کم سے کم شرح تئیس ۲۳ فیصد اور زیادہ سے زیادہ چورانوے ۹۴ فیصد تھی۔ ٹیکس سے محفوظ حد صرف پانچ سو ڈالر رہ گئی[2]

انگریز حکومت نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ ۱۸۶۰ء میں انکم ٹیکس ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت ٹیکس نافذ کیا۔ جسے ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۷ء تک معطل کر دیا گیا لیکن ۱۸۶۷ء میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد دی لائسنس ایکٹ آف ۱۸۶۷ء کے نام پر پھر سے جاری ہو گیا۔ جس کے تحت دو سو روپیہ

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۹ ص ۲۷۵

[2] دی ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا ج ۹ ص ۸۸

سے زائد آمدنی پر دو فیصد ٹیکس عائد کر دیا گیا۔

۱۸۲۸ء میں اسی ایکٹ کا نام سرٹیفیکیٹ ایکٹ ۱۸۶۸ء رکھ دیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت ٹیکس کی شرح کم کر کے ۳/۵ ا کر دی گئی۔ ٹیکس سے مستثنیٰ رقم دو سو سے بڑھا کر پانچ سو کر دی گئی۔ ۱۸۶۹ء کے دوران کمپنیوں پر ۱/۲ ا فیصد اور گورنمنٹ سیکورٹیز پر ۱/۲ ۲ فیصد ٹیکس لگا دیا گیا۔ دوسرے ذرائع سے وصول ہونے والے ٹیکسوں کی شرح کو دوگنا کر دیا گیا۔

۱۸۷۲ء میں ٹیکس سے مستثنیٰ رقم کو پہلے ساڑھے سات سو اور پھر ایک ہزار کر دیا گیا۔

یکم اپریل ۱۸۷۳ء میں دوسری مرتبہ چار سال کے لیے لوگوں کو عارضی طور پر ٹیکس سے نجات ملی۔ لیکن ۱۸۷۷ء میں لائسنس ٹیکس ایکٹ ۱۸۷۷ء کے تحت ہندوستان کے باسیوں پر پھر سے ٹیکس مسلط کر دیا گیا۔

۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء تک انکم ٹیکس ایکٹ میں ۱۳ ترامیم ہوئیں اور دو مرتبہ معطل ہوا۔ لیکن ۱۸۸۶ء میں اسے ایسی صورت دے دی گئی کہ پھر تیس[۳۰] سال نافذ العمل رہا جس کے تحت پانچ سو روپے سے کم آمدنی کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ سود اور تنخواہوں کی رقم جو پانچ سو سے دو ہزار تک ہوتی اس پر ۴ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس لیا جاتا۔ دوسری عام آمدنیوں پر جو دو ہزار سے زیادہ ہوتیں۔ ان پر ۵ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس وصول کیا جاتا۔

۱۹۱۶ء میں نئی ترمیم کے ذریعہ تنخواہوں۔ بونس۔ سالانہ وظائف پنشن اور سرکاری عطیات پر ایک ہزار سے دو ہزار روپے پر ۴ پائی فی روپیہ سے ٹیکس کا نیا شیڈول دیا گیا۔ اسی طرح دوسری آمدنیوں پر یعنی دو ہزار سے پانچ ہزار پر ۵ پائی فی روپیہ، پانچ ہزار ایک روپے سے دس ہزار تک ۶ پائی فی روپیہ، دس ہزار ایک سے پچیس ہزار روپے پر ۹ پائی فی روپیہ اور پچیس ہزار سے اوپر رقم پر ۱۲ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس کا نیا نظام قائم ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ مکمل آمدنی (TOTAL INCOME) اور قابل ٹیکس آمدنی (TAXABLE INCOME) کا تصوّر دیا گیا۔ آل انڈیا کمیٹی کے ذریعے انکم ٹیکس ایکٹ کو انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء کا نام دے دیا گیا۔[۱]

---

[۱] انکم ٹیکس لاء از خواجہ امجد سعید ص ۲ اور ص ۳

اگرچہ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۴ء، اور ۱۹۴۵ء میں بھی معمولی ترامیم ہوئیں لیکن یہی وہ ایکٹ ہے جو فقید المثال قربانی کے بعد ملنے والے پاکستان کو انگریزی سرکار سے ورثے میں ملا اور وہ آج بھی اپنی اصل کے ساتھ پورے پاکستان میں رائج ہے۔

مکس اسلام سے پہلے انسانی معاشرے میں جو مختلف قسم کے ٹیکس رائج تھے۔ ان میں ایک مکس تھا۔ جو زمانہ جاہلیت میں لوگوں سے زبردستی وصول کیا جاتا تھا[1]

علامہ ابن منظور نے نقل کیا ہے۔

دراھم کانت توخذ من بائع السلع فی الاسواق فی الجاھلیۃ[2]

یہ وہ درہم تھے جو جاہلیت کے زمانے میں بازاروں میں مال فروخت کرنیوالوں سے وصول کئے جاتے تھے۔

ایسے شخص کے بارے میں سیّد الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان صاحب المکس فی النار[3]

بے شک ٹیکس وصول کرنے والا جہنم میں ہوگا۔

لایدخل الجنۃ صاحب مکس یعنی العشّار[4]

تجارتی عشر وصول کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

حافظ ذکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری المتوفی ۶۵۶ھ نے لکھا ہے۔

اما الان فانھم یاخذون مکسا باسم العشر ومکوسا اخر لیس لھا اسم بل شیٔ یاخذون حراما سحتا ویاکلونہ فی بطونھم نارا حجتھم فیہ داحضۃ عند ربھم وعلیھم غضب۔

---

[1] کتاب الاموال ص ۶۹۴ مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۹ الفتح الربانی ج ۱۵ ص ۱۰۰ الترغیب والترھیب ج ۱ ص ۵۶۸

[2] لسان العرب ج ۶ ص ۲۲۰

[3] کتاب الاموال ص ۶۹۴ مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۹ الفتح الربانی ج ۱۷

"آج کل عشر کے نام پر جو ٹیکس یا مکوس لوگ وصول کر رہے ہیں۔ اس کا کوئی نام نہیں۔ بلکہ وہ ناجائز اور حرام ہے وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔ اپنے ربّ کے پاس ان کی حجّت نہیں چلے گی اور ان پر غضب ہوگا۔

ولهم عذاب شديد[1]

اور ان کے لیے سخت عذاب ہوگا۔

مسند احمد کے شارح احمد عبدالرحمٰن البنا الساعتی نے بھی واضح کیا ہے۔

ان المكس من اعظم الذنوب وذلك لكثرة مطالبات الناس ومظالماتهم وصرفها في غير وجهها[2]

"بے شک ٹیکس گناہ کبیرہ میں سے ہے۔ اس لیے کہ لوگوں سے کثرت کے ساتھ مطالبے کیے جاتے ہیں اور نہ وصول ہونے کی صورت میں ان پر ظلم کیے جاتے ہیں اور وصول کر کے ان کا غلط استعمال ہوتا ہے۔"

انہوں نے یہ بھی نقل کیا ہے۔

انما كان في النار لظلمه الناس واخذ اموالهم بدون حق شرعي فان استحل ذلك كان في النار خالدا فيها ابدًا لانه كافر والا فيعذب فيها مع عصاة المؤمنين ما شاء الله ثم يخرج ويدخل الجنة[3]

"صاحب المکس جہنم میں اس لیے جائے گا کہ اس نے لوگوں پر ظلم کیا۔ ان سے شرعی حق کے بغیر مال وصول کیا۔ اگر اسے حلال سمجھے گا تو آگ میں ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے کہ وہ کافر ہے۔ اگر حلال نہیں سمجھے گا تو گنہگار ہوگا۔ نافرمان اہل ایمان

---

[1] الترغیب والترھیب ج ۱ ص ۵۶۷

[2] حاشیہ الفتح الربانی ج ۱۵ ص ۱۸

[3] حاشیہ الفتح الربانی ج ۱۵ ص ۱۷

کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہے گا آگ سے نکال کر اسے جنت میں داخل کر دے گا۔

معلوم ہوا کہ "مکس" جہالت کے ٹیکسوں میں سے ایک ٹیکس تھا۔ جس کے وصول کرنے والے کو اسلام نے جہنم کی آگ کی وعید سنائی ہے۔

جزیہ | یہ وہ ٹیکس تھا جو غیر مسلمان سے ان کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کے بدلے وصول کیا جاتا تھا [1]

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے مطابق یہ ۸ھ یا ۹ھ میں اس وقت وصول کیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا [2]

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ [3]

"اہل کتاب میں سے جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حرام کیا ہے۔ اس کو حرام نہیں کرتے اور دین حق کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ اس وقت تک قتال کریں کہ جب تک وہ ذلیل و رسوا ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ نہیں دے دیتے۔

اسی آیت مبارکہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ اہل کتاب کے بارے میں حکم ہے حضرت عمر فاروق کو مجوسیوں سے جزیہ وصول کرنے میں تردد تھا۔ لیکن جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے گواہی دے دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے مجوسیوں سے جزیہ وصول کرنا شروع کر دیا [4]

---

[1] مفردات القرآن ۔ جزیہ۔ تفسیر کبیر ج ۴ ص ۶۱۸
[2] فتح الباری ج ۶ ص ۲۵۹
[3] سورۃ التوبۃ آیت ۲۹
[4] دارقطنی ج ۲ ص ۱۵۵ کنز العمال ج ۴ ص ۵۰۲

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جریرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
لیس علی مسلم جزیۃ [1]
مسلمان پر جزیہ نہیں۔
امام ترمذی نے اپنی جامع الترمذی میں باب باندھا ہے۔
باب ما جاء لیس علی المسلمین جزیۃ [2]
اس کا باب کہ مسلمانوں پر کوئی جزیہ نہیں۔
پھر انہوں نے حضرت ابن عباسؓ والی روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔
والعمل علی ھذا عند عامۃ اھل العلم۔
عام اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے۔
امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔
تسقط الجزیۃ بالاسلام والموت عند ابی حنیفۃ لقولہ علیہ السلام لیس علی مسلم جزیۃ [3]
امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک (غیر مسلم) کے مسلمان ہو جانے یا مر جانے کی وجہ سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلم پر جزیہ نہیں۔

خراج یہ ٹیکس بھی غیر مسلم اہل ذمہ پر لگایا جاتا تھا۔ درحقیقت یہ ان کی زمینوں پر لگان تھا مفتوحہ علاقوں میں زمینوں کو ان کے سابقہ مالکوں کے قبضے میں رہنے دیا جاتا اور ان کے علاقے کے اعتبار سے ان سے خراج وصول کیا جاتا۔
امام غزالیؒ سے منقول ہے کہ حکومت وقت اگر مسلمانوں سے خراج کے طور پر مال لیتی

---

[1] ابو داؤد ص ۴۳۳ مسند احمد ج ا ص ۲۲۳ ایضاً ص ۲۸۵
[2] جامع الترمذی ج ا ص ۱۰۹ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۱۹۷
[3] تفسیر کبیر

ہے تو وہ ناجائز ہے [1]

حضرت علاءؓ بن الحضرمی سے مروی ہے۔

بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی البحرین فکنت اٰتی الحائط یکون بین الاخوۃ یسلم احدھم فاٰخذ من المسلم العشر والمشرک الخراج [2]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بحرین کی طرف بھیجا۔ پس میں ایسے باغ میں آتا کہ جس میں کئی بھائی شریک ہوتے۔ ان میں سے ایک مسلمان ہوتا۔ میں مسلمان سے عشر لیتا اور مشرک سے خراج وصول کرتا۔

خراج اس غلام سے بھی لیا جاتا تھا جو کسی ہنر میں مہارت رکھنے کی بنا پر کمائی کرتا اور اپنے آقا کو طے شدہ خراج ادا کرتا۔

مصنف ابنِ ابی شیبہ میں منقول ہے

کان ابوحنیفۃؒ یقول لا یجتمع خراج و زکوۃ علی رجل [3]

امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسی شخص پر خراج اور زکوٰۃ جمع نہیں ہو سکتے۔

ضریبۃ یا غلّۃ | یہ بھی ٹیکس کی ایک صورت تھی جو غلاموں اور غیر مسلموں پر عائد ہوتا تھا مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے:

حجم ابوطیبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فامر لہ بصاع اوصاعین من طعام وکلم موالیہ فخفف عن غلۃ اضریبۃ [4]

---

[1] کیمیائے سعادت اردو ص ۳۰۱

[2] مسند احمد ج ۵ ص ۵۲ ابن ماجہ ص ۱۳

[3] مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۰۱

[4] صحیح بخاری ص ۲۸۳

"ابوطیبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینگی لگائی پس آپ نے اناج کے ایک یا دو صاع اس کو دینے کا حکم فرمایا اور اس کے مالکوں سے اس کی سفارش کی۔ پس اس کے ٹیکس میں تخفیف کر دی گئی۔"

عشور عشر کی جمع ہے اور اس سے مراد اسلامی عشر یا صدقات نہیں بلکہ یہ وہ تجارتی امپورٹ ڈیوٹی تھی جو یہود و نصاریٰ اور ذمیوں کے ان مالوں پر وصول کی جاتی تھی جو وہ تجارت کرنے کی خاطر مسلمانوں کے علاقوں میں لایا کرتے تھے۔

حسنؒ سے مروی ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے حضرت عمر فاروقؓ کو لکھا

ان تجارا من قبلنا من المسلمين ياتون ارض الحرب فياخذون منهم العشر۔

"ہمارے ملک کے مسلمان تاجر جب حربی علاقوں میں جاتے ہیں تو وہ ان سے مال کا دسواں حصّہ وصول کرتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو جواب میں حکم دیا۔

خذ انت منهم كما يأخذون من تجار المسلمين وخذ من اهل الذمة نصف العشر ومن المسلمين من كل اربعين درهما درهما وليس فيما دون المائتين شئ فاذا كانت مائتين ففيها خمسة دراهم وما زاد فبحسابه[1]

"تم بھی ان سے اسی طرح دسواں حصّہ وصول کرو کہ جس طرح وہ مسلمان تاجروں سے وصول کرتے ہیں۔ ذمیوں سے بیسواں اور مسلمانوں سے ہر چالیس پر ایک ایک درہم وصول کیا کرو۔ دو سو درہموں سے مال کم ہو تو اس پر کچھ وصول نہیں کرنا۔ جب مال دو سو درہموں کا ہو جائے تو اس میں سے پانچ درہم لینے ہیں اور اگر مال دو سو درہموں سے زیادہ ہو جائے تو پھر حساب لگا کر رقم وصول کرو۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۳۵

عمرو بن شعیب کی روایت کے مطابق حربیوں میں سے اہل مَنْبِج نے حضرت عمر فاروق رضی کی خدمت میں تحریراً عرض کیا۔

دعنا ندخل ارضك تجارا وتعشرنا فشاور عمر اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ فی ذلك فاشاروا علیه به فكانوا اول من عشر من اهل الحرب [1]

"ہمیں اپنے ملک میں تجارت کے لیے آنے کی اجازت دیں اور ہم سے دسواں حصہ وصول کیا کریں عمر فاروق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی سے اس اس بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے اس کے حق میں رائے دی۔ چنانچہ وہ پہلی حربی قوم تھی کہ جس سے عشر لیا گیا۔

معلوم ہوا کہ تجارتی عُشر یعنی امپورٹ ڈیوٹی کی ابتدا حضرت عمر فاروق رضی کے عہد خلافت میں اس وقت ہوئی جب حربی قوم کے تجار نے اہل اسلام کے علاقوں میں تجارت کی اجازت ملنے پر خود ہی اپنے مالوں کا دسواں حصہ اسلامی خزانے میں جمع کروانے کی پیش کش کی۔

دوسری روایت کے مطابق جب مسلمان تجار سے حربیوں نے دسواں حصہ وصول کرنا شروع کیا تو اس کے جواب میں امیر المؤمنین کی اجازت سے حربی تجار سے بھی مسلمانوں نے دسواں حصہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ خیال رہے کہ مسلمانوں سے جو ڈیوٹی وصول ہوتی تھی اس کی وہ حیثیت نہ تھی جو کہ غیر مسلموں سے ہونے والی ڈیوٹی کی تھی۔

قاضی ابو یوسف رح نے اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

وكل ما اخذ من المسلمين من العشور فسبيله سبيل الصدقه وسبيل ما يوخذ من اهل الذمة جميعا واهل الحرب سبيل الخراج [2]

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۲۵

[2] کتاب الخراج ص ۱۳۴

"اور مسلمان سے جو ڈیوٹی کے طور پر وصول کیا جائے گا۔ اس کی حیثیت زکوٰۃ جیسی ہوگی اور جو ذمیوں اور حربیوں سے وصول ہوگی اس کی نوعیت خراج جیسی ہوگی"۔

زیاد بن حدیر سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھے عُشر پر عامل بنا کر حکم دیا:

ان اٰخذ من تجار المسلمین ربع العشر۔

کہ میں مسلمان تجار سے ۲½ فیصد وصول کروں۔

دوسری روایت کے مطابق۔

من تجار اهل الذمة مثل ما اخذ من تجار المسلمین[1]

"اہل ذمہ کے تجار سے وہ وصول کروں کہ جو مسلمان تجار سے ان کے علاقوں میں وصول کیا جاتا ہے۔

انسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے ان سے فرمایا:

خذ من المسلمین من کل اربعین درهما درهما ومن اهل الذمة من کل عشرین درهما وممن لا ذمة له من کل عشرة درهما درهما[2]

"کہ مسلمانوں سے ہر چالیس درہموں پر ایک درہم (۲½ فیصد) اہل ذمہ سے ہر بیس درہموں پر ایک درہم (۵ فیصد) اور جو اہل ذمہ نہیں۔ ان سے ہر دس درہموں پر ایک درہم (۱۰ فیصد) وصول کروں۔

قاضی ابو یوسفؒ نے خلیفہ ہارون رشید پر یہ بھی واضح کر دیا تھا۔

اذا مر التاجر علی العاشر بمال او متاع وقال قد ادیت زکاته وحلف علی ذٰلك فان یقبل منه ویکف عنه ولا یقبل فی هذا من الذمی ولا من الحربی لانه لا زکوٰة علیهما[3]

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۳۴

[2] کتاب الاموال

[3] المحلی لابن حزم ج ۶ ص ۱۱۵

"اگر کوئی تاجر مال و متاع کے ساتھ عاشر کے پاس سے گزرے اور حلف اٹھا کر کہے کہ میں نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی ہے تو اس کی یہ بات مان لی جائے اور اس سے ڈیوٹی وصول نہ کی جائے کیونکہ ان پر زکوٰۃ واجب نہیں۔"

قاضی ابو یوسفؒ کی اس ہدایت سے معلوم ہوا کہ مسلمان تاجروں سے جو تجارتی ڈیوٹی وصول کی جاتی تھی۔ وہ ان کے مالوں کی زکوٰۃ ہوتی تھی۔ اگر تجار حلف اٹھا کر کہہ دیتے کہ ہم نے اپنے مالوں کی زکوٰۃ پہلے ہی ادا کر دی ہے تو پھر ان سے کوئی ڈیوٹی وصول نہ کی جاتی تھی۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ عمر فاروقؓ نے مسلمانوں سے بھی تجارتی عشر وصول کیا تو یہ بات کسی بھی صورت میں درست نہیں ہوگی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام سے ایسا عشر وصول کرنے سے منع فرمایا لہٰذا جس کام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا وہ عمر فاروق کیسے کر سکتے تھے۔

حرب بن عبید الثقفی کے خالو سے مروی ہے کہ میں نے اپنی قوم بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔

اعشرھا فقال انما العشور علی الیھود والنصاری ولیس علی اھل الاسلام عشور [1]

"کیا میں اپنی قوم سے عشر وصول کروں؟ آپ نے فرمایا۔ بے شک عشور یہود و نصاریٰ پر ہے۔ اہل اسلام پر عشور نہیں۔

یہی روایت امام ابو داؤد اور امام ابن ابی شیبہ نے وائل کے خالو سے نقل کی ہے [2]

سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یا معشر العرب احمدوا اللہ الذی رفع عنکم العشور [3]

اے عرب کے لوگو! اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرو کہ جس نے تم سے عشور کو ہٹا دیا۔

---

[1] مسند احمد ۳ ص ۴، ۴

[2] ابو داؤد ص ۴۳۲ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۱۹۲

[3] مسند احمد ج ۱ ص ۱۹۰ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۱۹۷، مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۸۷

احمد عبدالرحمٰن البنا الساعاتی نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔
یعنی ما کانت تاخذ ملوکھم و رؤساء قبائلھم منھم
من الضرائب والعشور و نحو ذٰلک[1]
"یعنی ان کے بادشاہ اور قبائل کے سردار ٹیکس اور عشور اور ان کی مثل ان سے جو وصول کیا کرتے تھے۔

امام ابو عبیدؒ نے نقل کیا ہے۔
انه قد کان له اصل فی الجاهلیة یفعله ملوك العرب والعجم جمیعًا فکانت سنتهم ان یاخذوا من التجار عشر اموالهم اذا مروا بهم[2]
"اس کی بنیاد جہالت کے زمانے میں رکھی گئی کہ جب عرب و عجم کے بادشاہوں کا طریقہ بن گیا کہ اپنے پاس سے گزرنے والے تاجروں سے دس فیصد ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔

مسلمانوں پر صرف زکوٰۃ اور عشر فرض ہے

مذکورہ روایات سے عیاں ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے صرف زکوٰۃ اور عشر ادا کرنے کا پابند بنایا ہے۔ اگر کوئی اس کے علاوہ بارگاہ اللہ میں صدقہ پیش کرتا ہے یا انفاق فی سبیل اللہ کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو اپنے اس عمل سے وہ عنداللہ اپنے درجات کو بلند کرواتا ہے۔ زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ اس پر کوئی ایسا ٹیکس واجب نہیں ہو سکتا کہ جس کی اصل جاہلیت کے زمانہ تھی۔

اسی لیے علامہ شوکانیؒ نے فیصلہ دیا ہے۔
لیس علیهم غیر الزکوٰة من الضرائب والمکس

---

[1] الفتح الربانی ج ۱۵ ص ۱۹

[2] کتاب الاموال ص ۴۷۲

ونحوھا [1]

"کہ ان پر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس اور اس کی مثل واجب نہیں"

علامہ الساعاتی کا بیان ہے۔

ای غیر ما فرضہ اللہ علیھم فی الصدقات فلا یوخذ من المسلم ضریبۃ ولا شیء یقرر علیہ فی مالہ لانہ یصیر کالجزیۃ [2]

"یعنی صدقات کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر جو فرض کیا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں پس مسلمان سے کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے اور نہ کچھ اس پر مقرر کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو وہ جزیہ کی صورت اختیار کر جائے گا۔"

ظاہر ہے کہ مسلمان سے جزیہ وصول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جزیہ تو غیر مسلموں پر واجب ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

اذا ادیت زکوٰۃ مالك فقد قضیت ما علیك [3]

"جب تو نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو جو تجھ پر فرض تھا اسے تو نے پورا کر دیا۔

امام ترمذیؒ نے پہلے اس حدیث کو باب بنایا۔ پھر روایت کے طور پر نقل کرنے کے بعد مزید وضاحت یوں کی ہے کہ اور طریقے سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا۔

---

[1] نیل الاوطار ج ۸ ص ۴۶

[2] الفتح الربانی ج ۱۵ ص ۱۷

[3] ترمذی ج ا ص ۱۶ ابن ماجہ ص ۱۲۸ فتح الباری ج ۳ ص ۲۷۳ زوائد ابن حبان ص ۲۰۴ کنز العمال ج ۶ ص ۲۹۳ السنن الکبری ج ۴ ص ۸۴

هل علیّ غیرھا؟ قال لا الا ان تطوع۔

"کیا اس کے علاوہ بھی کچھ مجھ پر فرض ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اگر تو رضاکارانہ طور پہ دینا چاہے تو اجازت ہے۔"

یہی الفاظ امام بخاریؒ کی ایک نقل کردہ روایت کے ہیں؛ [1]

فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لیس فی المال حق سوی الزکوٰۃ [2]

"مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کچھ اور فرض نہیں۔"

امام شعرانی نے علمائے کرام کا اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

اسی حدیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام ماوردی نے لکھا ہے۔

لا یجب علی المسلم فی مالہ حق سواھا [3]

"کہ مسلمان کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کوئی حق فرض نہیں ہوتا۔"

اگر کہا جائے کہ فاطمہ بنت قیس سے یہ بھی مروی ہے۔

فی المال حق سوی الزکوٰۃ۔

"مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔"

جامع الترمذی میں یہ دونوں روائتیں موجود ہیں۔ امام ترمذیؒ نے خود ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ "مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق ہے۔" والی روایت کی سند درست نہیں۔ کیونکہ اس روایت کے ایک راوی ابوحمزہ میمون الاعور کو ضعیف کہا گیا ہے۔

جامع الترمذی کے شارح علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری نے نقل کیا ہے کہ امام احمدؒ نے ابوحمزہ میمون کے بارے میں فرمایا کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ یعنی اس

---

[1] صحیح بخاری ص ۱۲

[2] المغنی لابن قدامہ ج ص ۳، ۵ کنز العمال ج ۶ ص ۳۲۳ المیزان الکبریٰ ج ۲ ص ۲ ابن ماجہ ص ۱۲۸۔

[3] الاحکام السلطانیہ ص ۱۱۳

کی حدیث قبول نہیں کی جاتی ۔ امام دارقطنی نے کہا کہ وہ ضعیف ہے ۔ امام بخاریؒ کا کہنا ہے کہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک مضبوط نہیں ۔ امام نسائیؒ کا قول ہے کہ وہ ثقہ نہیں لے

امام بیہقیؒ کی تحقیق ہے کہ یہ حدیث ابوحمزہ میمون الاعور کوفی کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے ۔ امام احمد بن حنبلؒ یحییٰؒ بن معین اور ان کے بعد آنے والے حفّاظ حدیث نے اس پر جرح کی ہے ۔ ہمارے ساتھی تعالیق میں جو روایت نقل کرتے ہیں وہ " لیس فی المال حق سوی الزکوٰۃ " ہے یعنی مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی حق نہیں ۔

اس ساری بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان اگر صاحب نصاب ہے تو وہ صرف زکوٰۃ اور عشر ادا کرنے کا پابند ہے ۔ اگر وہ اس کے علاوہ اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر ضرورت مندوں پر خرچ کرتا ہے تو وہ عند اللہ ماجور ہوتا ہے ۔

حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے حضرت انسؓ کو جب بحرین کا حاکم بنا بھیجا تو ان کو زکوٰۃ کے بارے میں تحریری ہدایت نامہ دیا ۔

هذه فريضة الصدقة التى فرض رسول الله صلى الله عليه وسلم على المسلمين التى امر الله بها رسوله فمن سئلها من المسلمين علىٰ وجهها فليعطها ومن سئلها فوقها فلا يعط ٢ے

" یہ وہ صدقہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض کیا یہ وہی ہے کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ۔ پس مسلمانوں میں سے فریضہ کے مطابق جس سے طلب کیا جائے وہ ادا کر دے اور جس سے فرض کردہ سے زیادہ مانگا جائے وہ نہ دے "

صحیح بخاری جو آج کل مدارس میں متداول ہے ۔ اس میں " فلا یعط " کے نیچے بین السطور لکھا ہوا ہے ۔

لے تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۲ میزان الاعتدال ج ۴ ص ۲۳۴

۲ے صحیح بخاری ص ۱۹۵ نسائی ج ا ص ۲۷۳ ابن حبان ج ۱۱۱ الام ج ۲ ص ۴

ای زائدًا علی الفریضة المعینة -

"یعنی فرض معینہ سے جب زیادہ طلب کیا جائے -

شاہ ولی اللہؒ نے بھی یہی لکھا ہے [1]

ضحاک بن مزاحم سے تو یہ بھی مروی ہے -

نسخت الزکاۃ کل حق فی المال [2]

زکوٰۃ نے مال کے ہر حق کو منسوخ کر دیا ہے۔

جب زکوٰۃ و عشر کے بارے میں یہ حکم ہے کہ صاحب نصاب مسلمان پر جتنی فرض ہوتی ہے اس سے زیادہ اس سے وصول نہ کی جائے تو اس پر زکوٰۃ و عشر کے علاوہ کوئی اور ٹیکس کیسے لگایا جا سکتا ہے؟

ایک مال پر ایک ہی بار زکوٰۃ و عشر اور ٹیکس کا واجب ہونا

اسلامی نظام زکوٰۃ و عشر اور ٹیکس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ امیں مسلم یا غیر مسلم کے ایک مال پر سال میں ایک ہی مرتبہ زکوٰۃ و عشر یا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے - اس کے برعکس دنیا میں مروجہ نظام ٹیکس کے تحت ایک ہی آمدنی یا ایک ہی مال پر کئی ٹیکس وصول کیے جاتے ہیں - جیسا کہ انکم ٹیکس، سوپر ٹیکس، سرچارج، ویلتھ ٹیکس، سیلز ٹیکس - امپورٹ ڈیوٹی اور ایکسائز ڈیوٹی وغیرہ -

اسلام میں اسکی بالکل اجازت نہیں کہ ایک مال پر بار بار زکوٰۃ یا عشر وصول کیا جائے یا زکوٰۃ اور عشر کی شرح میں اضافہ کر دیا جائے اسی طرح غیر مسلم کے مال پر بار بار تجارتی ڈیوٹی واجب کر دی جائے یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈال دیا جائے۔

علامہ ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل سرخسی نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں اسلام کی عظمت کو اجاگر کرنے والا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک عاشر نے رومی تاجر سے اس کے گھوڑے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۵۳ (مترجم)

[2] المحلی ابن حزم ج ۶ ص ۱۵۸ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۴۵

کا عشر وصول کر لیا۔ اتفاق سے اس تاجر کا گھوڑا فروخت نہ ہُوا۔ جب وہ اپنے گھوڑے سمیت واپس ہوا تو عاشر نے اس سے پھر عُشر طلب کیا۔ نصرانی نے عاشر سے کہا کہ میں جب تمہارے پاس سے گزرا تو تمہیں عشر ادا کر دیا تھا۔ اب مجھ پر کچھ بھی ادا کرنا باقی نہیں۔ جب عاشر نے اصرار کیا تو اس نے اپنا گھوڑا عاشر کے پاس چھوڑا اور خود مدینہ طیبہ پہنچ گیا۔ اس نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضؓ کو مسجد نبوی میں اس طرح پایا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی کتاب یا خط کو دیکھ رہے تھے۔ نصرانی نے مسجد کے دروازے سے آواز لگائی کہ میں نصرانی شیخ ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے جواب میں فرمایا۔ میں دین حنیف کو ماننے والا شیخ ہوں۔ کیا بات ہے؟ نصرانی نے عاشر کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو سنا دی۔ حضرت عمر فاروق اس کی بات سُن کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ نصرانی نے خیال کیا کہ امیر المؤمنین نے اس کی بات کو قابل توجہ نہیں سمجھا۔ لہٰذا وہ عاشر کے پاس واپس آیا اور دوبارہ عشر ادا کرنے پر تیار ہو گیا۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے عاشر کے پاس امیر المؤمنین کا حکم نامہ پہنچ چکا تھا۔ اگر اس سے ایک عشر لے چکے ہو تو دوسری بار مت لینا۔

نصرانی نے کہا کہ جس دین میں عدل و انصاف کی یہ صفت موجود ہو وہی حق ہونے کے لائق ہے اور وہ وہیں مسلمان ہو گیا [1]

جب غیر مسلم سے اس پر واجب ہونے والی ڈیوٹی سے زیادہ وصول کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا تو اسلامی ریاست میں مسلمانوں سے غیر اسلامی ٹیکس وصول کرنیکی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے؟

علامہ علاؤ الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی المتوفی ۹۷۰ھ نے نقل کیا ہے:

ان تمام اسلامکم ان تودوا زکوٰۃ اموالکم [2]

تمہارا اسلام کو پورا کرنا یہ ہے کہ تم اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔

---

[1] المبسوط ج ۲ ص ۲۰۱

[2] کنز العمال ج ۶ ص ۲۹۶ الترغیب والترہیب ج ۱ ص ۵۲۰

لہذا واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں کسی بھی غیر شرعی ٹیکس کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اسلام نے ان تمام ٹیکسوں کو ختم کر دیا تھا جو عرب میں اس وقت رائج تھے۔ مسلمانوں پر صرف زکوٰۃ وعشر کی ادائیگی فرض ہے اور جو صاحب نصاب اس کی ادائیگی کا منکر ہو تو حاکم وقت اس سے زبردستی وصول کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے اپنے خلافت کے آغاز میں کیا تھا۔

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین۔

پاکستان میں نظامِ زکوٰۃ و عشر کی اصلاح

کے لیے تجاویز و منصوبۂ عمل

محمد ایوب کراچی

پاکستان کو فلاحی مملکت بنانا حکومت کا اوّلین فریضہ ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور حکومت کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں مسلمانوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔ زکوٰۃ بشمول عُشر اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے جس کی بنیادی غرض و غائیت حاجتمندوں ناداروں غریبوں اور معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے طبقوں کی مدد کر کے پورے معاشرے کی فلاح کو یقینی بنانا ہے۔ صاحبِ نصاب مسلمانوں پر زکوٰۃ و عشر کا ادا کرنا اور مملکت پر ان کی مناسب تحصیل و تقسیم کا انتظام کرنا فرض گردانا گیا ہے۔ دستورِ پاکستان کی دفعہ ۳۱ بھی مملکت پر یہ لازم قرار دیتی ہے کہ وہ زکوٰۃ کی مناسب تنظیم کا اہتمام کرنے کے لیے کوشش کرے۔

حکومت نے اپنی مذہبی و آئینی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کافی غور و خوض اور تحقیق و جستجو کے ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد زکوٰۃ و عشر کا آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء جاری کیا اور اس طرح پاکستان عالمِ اسلام کا وہ واحد ملک بن گیا جس میں اسلام کے فلاحی معاشی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے عشر و زکوٰۃ کا ایک مربوط نظام موجود ہے۔ رقوم کی تشخیص وصولی، صَرف اور تنظیم و انصرام کے لیے مرکزی، صوبائی، ضلعی، تحصیل اور مقامی سطحوں کی کمیٹیوں، بینکوں، مالیاتی اداروں، محکمہ مال اور دیگر منہا کنندگان اور انتظامیہ کے بے شمار افراد مامور کیئے گئے ہیں۔

مصنف اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے شعبۂ تحقیق (اسلامک اکنامکس ڈویژن) سے منسلک ہے اس مضمون میں پیش کردہ آرا ان کی ذاتی ہیں۔

پہلی جدول میں رکھے گئے گیارہ اموالِ ظاہر پر سے زکوٰۃ لازمی طور پر سرِ ماخذ سے ہی منہا کرلی جاتی ہے (Deduction AT SouRce) جبکہ دوسری جدول میں مندرج اثاثہ جات پر زکوٰۃ کی ادائیگی مالکِ اثاثہ کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے۔ نظامِ زکوٰۃ ۲۰ جون ۱۹۸۰ء سے ہی قائم کر دیا گیا تھا جبکہ عُشر سے متعلق دفعات کو ۱۵ مارچ ۱۹۸۳ء (ربیع-۱۹۸۳ء) کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

دس سال کا عرصہ کسی بھی نظام یا انتظام کی افادیت جانچنے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اب اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آیا یہ نظام ایسے نادار لوگوں کے لیے بنیادی ضرورت کی اشیاء فراہم کرسکا ہے جو بوجوہ معاشرے میں بنیادی ضروری وسائل حاصل نہ کرسکتے ہوں اور کیا غربت و افلاس کو کم کرکے غربا و مساکین کی مستقل بحالی کے ضمن میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔

جب ہم زکوٰۃ و عشر کے نظام کی کارکردگی، افادیت اور معاشرے پر اس کے اثرات پر غور کرتے ہیں تو صورتِ حال کچھ زیادہ خوش کن نظر نہیں آتی۔ اس کی وجوہات دو طرح کی ہیں ایک تو ابتدا ہی وصولی و تقسیمِ زکوٰۃ کے نظام میں کچھ خامیاں موجود تھیں۔ دوسری قسم کی وجوہات کا تعلق بدانتظامی اور معاشرے کے اہل کاران کے مجموعی مزاج سے ہے۔ وصولیٔ زکوٰۃ کی شرح اضافہ اثاثہ جات کی شرح اضافہ سے کم رہی ہے۔ جہاں زکوٰۃ کی مقدار ۱۰ سالوں میں تقریباً ۲۰۰ فیصد بڑھی، بینک امانتوں میں ۲۵۰ فیصد اضافہ ہوا۔ وصولیٔ عُشر نہایت تشویشناک حد تک کم ہوگئی۔ عشر کی تشخیص کردہ مقدار جو ۱۹۸۳ء میں ۳۲۷ ملین روپے تھی، ۱۹۸۹ء میں ۱۶۶ ملین روپے رہ گئی حالانکہ زرعی پیداوار کا اشاریہ (۱۰۰ = ۸۱-۱۹۸۰) جو ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۹۵ تھا ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۱۳۷ ہوگیا رضاکارانہ طور پر جمع کروائی گئی زکوٰۃ جو ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۲ ملین روپے تھی، ۹۰-۱۹۸۹ء میں صرف ۰.۴ ملین روپے رہ گئی۔

زکوٰۃ کی تقسیم اور معاشرے پر اس کے اثرات کے سلسلے میں بھی کوئی اچھی صورت سامنے نہیں آئی اور یہ نظام جسے شروع میں عوام کی طرف سے کافی پذیرائی ملی تھی اب عوام کا اعتماد کھو بیٹھا ہے۔ اگر تقسیمِ زکوٰۃ کے اثرات و مضمرات حوصلہ افزا اور قابلِ ستائش ہوتے تو نہ صرف جدولِ اوّل کے اثاثہ جات پر لوگ دل جمعی اور رغبت سے زکوٰۃ ادا کرتے بلکہ اموالِ باطنہ پر بھی زکوٰۃ رضاکارانہ طور پر انتظامیہ کو وصول ہونا شروع ہو جاتی۔ کیونکہ اس طرح

لوگوں کو خود بخود یہ احساس ہوتا کہ ان کی ادا کردہ زکوٰۃ واقعی ملک سے فقر و افلاس کے خاتمے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ فلاحی معاشی نظام کے قیام کے لیے اسلام کے اس اہم ترین رکن کی یہ عملی صورت جو ہمیں پاکستان میں نظر آرہی ہے کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہے حکومت پاکستان نے بھی اس میں اصلاحات کے لیے ایک گیارہ رکنی کمیٹی قائم کر رکھی ہے جسے تجاویز و سفارشات پیش کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ راقم بھی اپنی ذاتی حیثیت میں کچھ تجاویز اس عرضداشت کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے کہ علماء، متعلقہ اہل کاران اور حکومت کی ایجنسیوں کے ذمّہ دار اصحاب معاشرے کی موجودہ حالت کو مدّنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ اور عشر کے نظام میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے نہ صرف ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ اپنی اپنی جگہ پر اس کے لیے بھرپور سعی بھی کریں۔

اموالِ زکوٰۃ کی وصولی، تقسیم اور انتظام و انصرام کے بارے میں تجاویز بیان کرنے سے پہلے بنیادی اہمیت کے کچھ امور کا احاطہ نہایت ضروری ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ صرف نظامِ زکوٰۃ و عشر کے نفاذ سے فلاحی معاشرہ وجود میں نہیں آجائے گا اور اگر کوئی ایسی توقع رکھتا ہے تو اس کی سوچ غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ چنانچہ سماجی و سیاسی طور پر اصلاحِ معاشرہ کے ساتھ ساتھ ایک منظم رضاکارانہ شعبے کا قیام بھی ہمارا مطمحِ نظر ہونا چاہیے۔ دوسری اہم بات یہ کہ پاکستان میں ٹیکسوں کی چوری اور لوٹ کھسوٹ کے سابقہ تجربہ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے نئے نظام میں احتساب کے لیے خصوصی اقدامات کی ضرورت ہے۔ احتساب کے بغیر حکومت اپنی ذمہ داری اُس دیانتداری سے اور صحیح طور پر انجام نہیں دے سکے گی جس کا یہ نظام متقاضی ہے۔ اور اس صورت میں اس کے قیام کا اختیار ہی ختم ہو جائے گا۔ ایک اور بات یہ ہے کہ نظامِ زکوٰۃ و عشر بالکل نئے سرے سے ایک ایسے ملک میں شروع کیا گیا ہے جہاں کی اکثریت جاہل ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے مختلف میڈیا پر ایک مؤثر تعلیماتی و ترغیباتی مہم کی ضرورت ہے جس میں نہ صرف عوام الناس کو اس مالی عبادت کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے بلکہ انہیں قانونی و انتظامی امور سے بھی روشناس کروایا جائے۔ میرے ذہن میں ایک اور بنیادی بات یہ ہے کہ جزوی طور پر نافذ کردہ نظامِ زکوٰۃ ہماری توقعات کو کبھی بھی پورا نہیں کر سکے گا اس لیے اسے

وسیع البنیاد بنا کر پورے معاشرے میں کلّی طور پر نافذ کرنا ہوگا۔
راقم کی تجاویز کو چار حصّوں میں پیش کیا جاتا ہے۔
۱۔ ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے ملکی وحدت کا فروغ اور پوری قوم کو ساتھ لے کر چلنا۔
۲۔ نظامِ زکوٰۃ وعشر کی انتظامیہ اور مختلف زکوٰۃ کونسلوں کمیٹیوں کے طریقہ ہائے کار میں بہتری۔
۳۔ زکوٰۃ اور عشر کی وصولی میں بہتری کے اقدامات۔
۴۔ حاصل کردہ زکوٰۃ فنڈز کی تقسیم اور فلاحی معاشرہ کے قیام کے لیے جہات کا تعین۔
۵۔ اموالِ زکوٰۃ کے مؤثر استعمال کے لیے قلیل وطویل مدت عملی منصوبہ۔

معاشرے کا من حیث المجموع اعتماد اور ملکی وحدت کا فروغ

۲۰ جون ۱۹۸۰ء کو جاری کیے جانے والے آرڈیننس کا اطلاق پاکستان کے تمام مسلمان شہریوں پر ہوتا تھا۔ اگرچہ ابتداء سے ہی غیر مسلموں پر کسی بھی قسم کے ایسے ٹیکس سے استثنیٰ کے نتیجے میں طبقاتی عدمِ مساوات کا موقع فراہم کر دیا گیا تھا مگر ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۸۰ کو فقہ کی بنیاد پر ادائیگی زکوٰۃ سے استثنیٰ فراہم کر کے ایک نئے نظام میں مزید خلا پیدا کر دیا گیا۔ اس ترمیم کے مطابق اگر کوئی شخص محسوس کرتا ہے کہ وصولیٔ زکوٰۃ کا نظام اُس کی فقہ اور عقیدے کے مطابق نہیں ہے تو وہ استثنیٰ کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ لیکن عملی طور پر صرف اہلِ تشیع کو ہی مستثنیٰ کیا گیا۔ اِس خلا کا یہ اثر سامنے آیا کہ کچھ دوسرے لوگ بھی اس حق کا نہ صرف غلط استعمال بلکہ مطالبہ کرنے لگے اور اعتماد کے فقدان کا یہ عالم ہوا کہ حنفی فقہ کے کچھ لوگوں نے بھی عدالت سے رجوع کیا کہ چونکہ ترمیم شدہ آرڈیننس کے مطابق کوئی بھی شخص اپنے خیال کے مطابق ادائیگی زکوٰۃ سے چھوٹ حاصل کر سکتا ہے اس لیے انہیں بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

چونکہ جدید دور میں اور خصوصاً ہمارے ملک میں حکومت کی تشکیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہونے یا نہ ہونے کا کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا اور عام مشاہدے کے مطابق اہلِ تشیع کو حکومت میں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ حصّہ ملتا ہے اس لیے ان کے علماء کو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنے اس عقیدے کو کہ "کوئی حکومت اس وقت تک زکوٰۃ وصول نہیں کر سکتی

جب تک کہ وہ رسولؐ کی جائز اور قانونی وارث نہ ہو"۔ (جو کسی نص سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے دینِ اسلام کا جزو نہیں ہے) بالائے طاق رکھتے ہوئے فقر و افلاس کے خلاف جنگ میں پوری قوم کے شانہ بشانہ چلتے۔ مگر سیاسی اختلافات کی بناء پر اس وقت کی حکومت کو مصلحت پسندی پر مجبور کر کے استثنیٰ حاصل کر لیا گیا۔ اس صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو تجویز میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص سے خواہ کسی بھی مذہب یا فقہ کا ماننے والا ہو سماجی بھلائی کے لیے ٹیکس لیا جائے۔

زکوٰۃ اگرچہ عبادت ہے تاہم اس کی ایک محاصلی اہمیت بھی ہے۔ دیگر محاصلات کی موجودگی میں اس کی ادائیگی بلاشبہ ایک اضافی بار ہے۔ چنانچہ ملک کی تمام آبادی کے کچھ طبقوں کو مذہبی یا فقہی اختلاف کی بناء پر زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دینا غیر منصفانہ ہی نہیں بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ساتھ امتیازی سلوک بھی ہے۔ میری تجویز ہے کہ قابلِ زکوٰۃ اموال کا تفصیل کے ساتھ تعیّن کیا جائے اور ملک کی تمام آبادی کی حد تک ان اموال پر ڈھائی فیصد اور زرعی پیداوار پر ساڑھے پانچ فیصد کی یکساں شرح سے بلا لحاظِ مذہب و فقہ ایک فلاحی ٹیکس عائد کر دیا جائے۔ اس ٹیکس کے اندر یہ رعایت بھی رکھ دی جائے کہ جن اموال یا زرعی پیداوار پر زکوٰۃ و عشر کی ادائیگی ثابت کر دی جائے گی ان سے فلاحی ٹیکس کی وصولی صرف نصف فیصد ہو گی جبکہ دیگر صورت میں فلاحی ٹیکس پوری شرح سے وصول کیا جائے گا۔ اس طرح اس ٹیکس کے اندر زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی اور صاحبِ استطاعت آبادی کا کوئی طبقہ فلاحی ٹیکس کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ نہ رہے گا۔ فلاحی ٹیکس کی شرح زکوٰۃ سے نصف فیصد اس لیے زیادہ تجویز کی گئی ہے کہ معاشرے کے تمام اہلِ ثروت بلاتفریق مذہب و عقیدہ معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کی بہبود میں شامل ہو کر سماجی انصاف اور قومی یکجہتی کا سبب بنیں۔ فلاحی ٹیکس سے حاصل شدہ آمدنی بلاامتیاز مذہب و ملّت ملک کے تمام مفلس و مفلوک الحال افراد کی بحالی کے لیے استعمال ہو سکے گی۔

زکوٰۃ کمیٹیوں اور کونسلوں کے طریق کار کی اصلاح

ملک بھر میں مختلف درجوں کی زکوٰۃ کمیٹیوں سے اس وقت تقریباً تین لاکھ افراد منسلک

ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کے چیدہ اور بااثر لوگ ہیں اگر ان کی کارکردگی کو منظم شکل دے کر مطلوبہ ضوابط و نگرانی کے تحت لایا جائے تو ملک سے نہ صرف فقر و افلاس ختم ہو جائے گا بلکہ ملک سماجی و معاشی لحاظ سے بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔ مرکزی و صوبائی زکوٰۃ کونسلوں کا یہی سب سے بڑا امتحان ہے کہ وہ مقامی، تحصیل و ضلع زکوٰۃ کمیٹیوں کے اہل کاران کو اس مذہبی و سماجی فریضہ کی کما حقہٗ ادائیگی پر کس طرح برضا و رغبت آمادہ کرتے ہیں کہ ان میں ہر ایک احتساب و ذمہ داری کی زنجیر کی ایک کڑی بن جائے۔ پالیسی بنانے اور اس پر عملدرآمد کے لیے ہدایات جاری کرنے کی ذمہ داری مرکزی زکوٰۃ کونسل پر ہے تو مقامی کمیٹیوں (LZCS) کا کام ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ تحصیل، ضلع و صوبائی کمیٹیاں مرکزی کردار ادا کرنے والی مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں اور مرکزی زکوٰۃ کونسل کی معاون / مشیر کے طور پر کام کرتی ہیں ہمیں اصل توجہ مقامی کمیٹیوں پر مرکوز کرنا ہو گی جن کی تعداد اس وقت ملک میں چالیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ عشر کی وصولی کا کل انحصار ان پر ہے۔ مستحقین کی نشاندہی اور ان کی بروقت امداد و مستقل بحالی کا کام بھی مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں کی کارکردگی پر منحصر ہے۔ اس کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

مقامی کمیٹیوں کے ارکان کی تعداد متعین نہ کی جائے جیسا کہ آج کل سات ہے۔ جب انہوں نے رضاکارانہ طور پر کام کرنا ہے تو کم سے کم تعداد سات رکھ کر زیادہ سے زیادہ کے لیے آبادی یا محلّے والوں کی صوابدید پر چھوڑ دی جائے۔ ارکان کا چناؤ گاؤں کے کھلے اور عام اجلاس (GENERAL BODY MEETING) میں کیا جائے۔ ضلعی یا تحصیل زکوٰۃ کمیٹی کا کوئی نمائندہ اِس چناؤ کی کاروائی کی نگرانی کرے۔ کم سے کم تین دن پہلے پورے گاؤں میں چناؤ اجلاس کا اعلانِ عام کیا جائے۔ چونکہ یہ نظام مذہب کا ایک اہم جزو ہے اس لیے ترجیحاً یہ اجلاس آبادی کی جامع مسجد میں بلایا جائے مقامی کمیٹی کا ممبر بننے کیلیے رکھی گئی شرائط کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنایا جائے۔ اور پھر لوگوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ارکان کیلیے نام پیش کریں۔ ضرورت پڑنے پر ووٹنگ کرائی جائے اور پھر اسی اجلاس میں ہی ارکان میں سے سب سے زیادہ نیک و پرہیزگار اور ترجیحاً پڑھے لکھے شخص کو چیئرمین چُن لیا جائے ممبر بننے کی شرائط یہ ہو سکتی ہیں۔ (i) پانچوں نمازیں پڑھنے والا اور ترجیحاً باجماعت ادا کرنے والا۔ (ii) اپنے گاؤں اور قرب و جوار میں ظلم و حق تلفی میں ملوّث نہ رہا ہو اور اگر چناؤ

اجلاس میں کوئی شخص اس کے کردار پر انگلی اٹھائے تو اسے امیدوار نہ سمجھا جائے۔ (iii) وہ سیاست میں اس طرح حصّہ نہ لیتا ہو جس سے خدشہ ہو کہ وہ کمیٹی کے کام میں مکمل غیر جانبداری سے کام نہیں لے گا۔ (iv) ترجیحاً تعلیم یافتہ ہو اور اس کا ذریعہ روزگار ایسا ہو کہ وہ کمیٹی کے کام کے لیے کچھ وقت نکالنے پر قادر ہو۔ خصوصاً چیئرمین ایسے شخص کو بنایا جائے جو انتظامیہ کی طرف سے موصول ہونے والی دستاویزات کو پڑھ کر ان پر عملدرآمد کو یقینی بنا سکے۔

مقامی زکوٰۃ کمیٹی کے ارکان میں ترجیحاً تکنیکی ماہرین بھی شامل ہونا چاہیں (مرد و خواتین) گاؤں یا متعلقہ آبادی کے سکول کا ایک استاد بھی جو اسی گاؤں کا رہنے والا ہو بطور رکن کمیٹی کے کام میں بہت معاون ثابت ہوگا۔ ارکان کی مدت نمائندگی کے تعین کی بھی ضرورت نہیں ہے جب تک کوئی رکن دیانتداری اور محنت سے کام کرتا ہے اُسے اِس خدمت کا موقع دیا جانا چاہیے۔ کوئی ممبر اگر بدنظمی مقامی کھاتوں میں خرد برد یا کمیٹی کے کام میں عدمِ دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے تو تین چوتھائی ارکان کے فیصلے اور پھر ہر سہ ماہی میں ہونے والے عام اجلاس میں اس کی ممبرشپ ختم کر کے اس کے خلاف حسبِ ضرورت تادیبی کاروائی کی جائے۔ تحصیل کی سطح پر دو تنخواہ دار ارکان کی ایک کمیٹی بنائی جائے جسے مقامی زکوٰۃ ——————— کمیٹیوں کی نگرانی و رہنمائی کا کام سونپا جائے۔ انتظامیہ کا یہ فرض ہے کہ ان دو آدمیوں کا چناؤ خالصتاً ان کی مہارت دیانتداری، فہم و فراست اور علاقہ کے عوام پر ان کے دائرۂ اثر کی بنیاد پر کرے۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ پورے علاقہ میں ان خصوصیات کے دو آدمی تو مل جائیں گے۔ یہ ارکان مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں کے تمام تنظیمی و تکنیکی کام کی نگرانی کریں گے عُشر کے تعین اور وصول میں ان کی راہنمائی کریں گے، سماجی بھلائی کے لیے منصوبہ جات کو آخری شکل دیں گے اور مقامی کھاتوں کے محاسبہ کا بندوبست کریں گے۔ اس سے اوپر والی کمیٹیوں اور کونسلوں کے احتساب کا بھی مؤثر انتظام ضروری ہے۔ جو مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں کی طرح پیچیدہ نہیں ہے صرف محنت اور دل جمعی سے ذمہ داری نبھانے کا احساس ضروری ہے۔ مرکزی اور صوبائی زکوٰۃ کونسلیں عملے کے لئے رہنما اصول مرتب کریں اور ان پر عملدرآمد کو یقینی بنا کر عوام الناس کے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کریں۔

زکوٰۃ وعُشر کی وصولی

زکوٰۃ : نظامِ وصول میں بہتری لانے کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں ۔

(i) تجارتی و صنعتی اموالِ تجارت (INVENTORIES OR STOCKS IN TRADE) پر لازمی زکوٰۃ پہلے مرحلہ میں خود تشخیص کی بنیاد پر عائد کی جائے ۔ شہروں و قصبوں میں مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں کی تنظیمِ نو اور ان میں ماہر ارکان کی موجودگی پر تشخیص کا کام خود حکومت بھی اپنے ذمہ لے سکتی ہے ۔ فی الحال صرف چنیدہ افراد کی خود تشخیص کو چیک کیا جائے ۔ دولت کی اتنی اہم مدّ کو جدول دوم میں رکھنے یعنی اختیاری امر بنانے کے بُرے نتائج نکلیں گے ۔ خوشحال تاجر طبقے اور صنعتی اداروں کے اموال تجارت کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنے سے نظامِ زکوٰۃ کی انصاف پسندی اور موزونیت بری طرح متاثر ہوئی ہے اور زکوٰۃ کی رقوم میں نمایاں کمی ہوئی ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل بھی اس بات کی بھرپور سفارش کر چکی ہے ۔

(ii) ایسی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد جو کوئی شخص آگے بیچنے کے لیے خریدے اس کی حیثیت مالِ تجارت (STOCK IN TRADE) کی ہو گی اس لیے سالِ زکوٰۃ کے آخر میں اس کی بازاری مالیت پر ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی جائے ۔ ان میں پلاٹ ، مکان اور ایسی صنعتی جائداد شامل ہے جو آگے بیچ کر منافع کمانے کی غرض سے خریدی جائے ۔

(iii) زرِ مبادلہ کے بنک اکاؤنٹس سے ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ لازمی طور پر وصول کی جائے ۔

(iv) حصص اور سرٹیفکیٹس وغیرہ پر زکوٰۃ ان کی اُس وقت کی بازاری مالیت کے حساب سے کاٹی جائے جب ان پر منافع دیا جاتا ہو ۔

(v) کمپنیوں کے قابلِ وصول قرضوں (BOOK DEBTS/ACCOUNTS RECEIVABLES) پر بھی زکوٰۃ عائد کی جانی چاہیے ۔ ان پر ادائیگیٔ زکوٰۃ کے وقت کے بارے میں کئی لوگوں نے اپنی مختلف رائے کا اظہار کیا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ حساب کتاب کی پیچیدگی سے بچنے کے لیے مندرج کھاتہ جات قرضوں پر ہر سال زکوٰۃ ادا کر دی جائے ۔ جن واجبات کو قابلِ زکوٰۃ اموال سے

نکالنا ہوگا ان میں صرف قابلِ زکوٰۃ اثاثہ جات کے حصول کیلئے لیے جانے والے قرضہ جات شامل ہیں ۔ ان کی مثال تجارتی قرض خواہان (TRAde CRediTORS) ہیں ۔

(vi) ایسی میعادی مالیاتی دستاویزات جو ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد فک (ENCASh) کروائی جاتی ہیں یا جن پر حاصل صرف ان کے فک کروانے پر ہی ملتا ہے ۔ ہر سال ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی جائے ۔ مثال کے طور پر موجودہ صورت حال میں این آئی ٹی یونٹس اور سپیشل سیونگ سرٹیفکیٹس پر تو ہر سال زکوٰۃ عائد کی جاتی ہے مگر ڈی ایس اور طویل المیعاد کھاتوں وغیرہ سے زکوٰۃ صرف ان کی (ENCAShMENT) یا پختگی کے وقت ایک دفعہ ہی ۲½ فیصد کے حساب سے منہا کی جاتی ہے ۔ یہ بات تحصیلات زکوٰۃ میں کمی کے ساتھ ساتھ ناانصافی کا سبب بنی ہے ۔

(vii) اداروں کی طرف سے جاری کئے جانے والے مختلف اقسام کے بانڈز اور اسناد وغیرہ کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنے کا کام فوراً روک دیا جائے ۔ ایک آرڈیننس کے ذریعے اس سے پہلے جاری کئے جانے والے بانڈز وغیرہ پر سے بھی زکوٰۃ لازمی طور پر منہا کی جائے ۔ بعد میں اسے باقاعدہ قانونی شکل دی جائے ۔

(viii) انعامی بانڈز اور لاٹریز کا کاروبار اگرچہ دیگر سودی وثیقہ جات کی طرح اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا مگر جس طرح حکومتی تمسکات اور سودی دستاویزات پر سے بسر ماخذ زکوٰۃ کاٹی جاتی ہے اسی طرح ۵۰۰۰ روپے اور اس سے زیادہ کی انعامی رقوم پر ۲۰ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ لی جائے ۔ اس لیے کہ یہ انعام رکاز (TReASURe TROVeS) کی تعریف میں آتے ہیں ۔ ان پر سے انکم ٹیکس ختم کر دیا جائے ۔

(ix) ایسے اموال مستفاد (باقاعدگی سے حاصل ہونے والی آمدنی) جو کسی شخص کے زائد از ضرورت اثاثہ جات مثلاً کرائے پر دیے گئے مکانات سے حاصل ہوں ان پر زکوٰۃ کے بارے میں علماء اور خاص طور پر اسلامی نظریاتی کونسل کوئی متفقہ فیصلہ کریں ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ عموماً زکوٰۃ بچتوں پر لگتی ہے نہ کہ آمدنی پر، اس لیے مشینری ، بسوں ، ٹرکوں اور مکان کے کرایہ پر زکوٰۃ عائد نہ کی جائے حالانکہ مویشیوں اور زرعی پیداوار کی زکوٰۃ بچتوں پر نہیں بلکہ تعداد یا مقدار کے حساب سے

عائد ہوتی ہے۔ میرے خیال میں مشینری اور بسیں وغیرہ ایسی سرمایہ کاری ہیں جن سے روزگار کے مواقع اور قومی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے زکوٰۃ ان کے مالکان کی بچت پر ہی عائد کی جائے مگر کرائے پر دیے گئے مکان کے کرایہ پر ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ عائد کرنے کے معاملے پر غور کیا جانا چاہیے۔ بشرطیکہ ان کے مالکان مستحقین زکوٰۃ میں شامل نہ ہوں۔ (مال مستفاد حاصل کرنے والے تنخواہ دار طبقے کی بچت پر ہی زکوٰۃ عائد ہوگی)۔

زکوٰۃ کٹوتی کے سلسلے میں ضمناً کچھ امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ اولاً، زکوٰۃ کی ادائیگی پر آمدنی ٹیکس میں چھوٹ دی جاتی ہے۔ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ اس سے صاحب مال پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا بوجھ نصف سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے طور پر زیادہ رقم دینے کی کوئی رغبت بھی نہیں ہے مزید برآں اس طرح کی چھوٹ کا دعویٰ عام طور پر امیر لوگ ہی کرتے ہیں اور درمیانہ طبقے کے لوگ زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ ثانیاً، نصاب زکوٰۃ کے بارے میں بعض لوگ اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ چاندی کو بنیاد بنا کر مقرر کیا جانے والا نصاب حقیقت پسندانہ نہیں ہے میری رائے میں یہ نصاب صحیح اور زکوٰۃ کی روح کے مطابق ہے۔ بچت کھاتوں اور حصص وغیرہ کے ضمن میں چاندی کے نصاب کو بنیاد بنانے میں اس مفروضے سے فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ ان کھاتوں کے مالکان کی عمومی مالی حالت، ان کے گھروں میں موجود نقد رقوم، سونے چاندی کے زیورات، حصص میں سرمایہ کاری اور انعامی بانڈز اور دیگر مالی تمسکات کے مملوکات کے باعث اچھی ہے اسی لیے ان کے بچت کھاتوں میں نصاف کے برابر یا اس سے زیادہ رقم بچ رہتی ہے۔ بچت کھاتوں کے سلسلہ میں تعیین نصاب کے لیے چاندی کو اس لیے بھی بنیاد بنایا گیا ہے کہ نقد رقوم یا اس سے ملتے جلتے اثاثوں (جیسے کہ بچت کھاتے ہیں) کے لیے چاندی کا نصاب ہی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے جو زکوٰۃ کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے انفع للفقراء والمساکین ہے۔ چنانچہ زکوٰۃ وعشر آرڈیننس ۱۹۸۰ء کے تحت طے کردہ نصاب اس سلسلہ میں بہترین بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اور قیاساً بھی چاندی کے نصاب کو ترجیح حاصل ہے۔ لہٰذا کسی نئے فارمولے یا سونے کو نصاب کی بنیاد بنانے کا کوئی جواز نہیں۔

زکوٰۃ کی منہا کار ایجنسیوں کے اہل کاران کی مطلوبہ ٹریننگ بھی وصولئ زکوٰۃ کے نظام کو بہتر

بنانے کے لیے بہت ضروری ہے مرکزی زکوٰۃ کونسل اس سلسلے میں واضح اور عام فہم احکامات جاری کرے کہ مختلف قسم کے اثاثہ جات پر زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی کب اور کس طرح ہونی چاہیے اس کے علاوہ عوام میں اس مذہبی فریضہ کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے ترغیباتی مہم بھی کبھی وقفے وقفے سے جاری رہنی چاہیے۔

عُشر وصولی عشر کا انتظام زکوٰۃ کی نسبت زیادہ اصلاح کا متقاضی ہے۔ کم آمدنی والے طبقوں کا ایک بہت بڑا حصہ ہمارے دیہات میں رہتا ہے دیہات سے غربت و افلاس کو ختم کرنے کے لیے عشر کی زیادہ سے زیادہ وصولی اور اس کا بہتر استعمال بہت ہی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں لوٹ کھسوٹ، چوری اور ادائیگی سے فرار کے بھی بہت مواقع ہیں۔ استطاعت سے زیادہ اور ناجائز بوجھ بھی دیہات کے محنت کش عوام میں حوصلہ شکنی اور مذہبی روایات سے دوری کا سبب بن سکتا ہے اس لیے نفاذِ عشر کے سلسلے میں بہت زیادہ فہم و فراست اور بہتر انتظام و انصرام کی ضرورت ہے۔

عُشر کے بارے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ یہ زمین کا یا کاشتکار کی آمدنی کا ٹیکس نہیں بلکہ کسی شخص کی زمین سے حاصل شدہ پیداوار (HARVEST) پر عائد ہوتا ہے۔ اس طرح ہر فصل میں نصاب کا تعین بھی الگ الگ ہوگا اور کسی قطعۂ زمین پر بوئی جانے والی ہر فصل خواہ وہ سال میں کتنی ہی دفعہ بوئی جائے، پر عائد ہوگا۔ فصل تباہ ہونے پر عشر نہیں لگے گا۔ زکوٰۃ و عُشر آرڈیننس ۱۹۸۰ء کسی شخص کو لازمی ادائیگی عشر سے اس صورت میں مستثنیٰ کرتا ہے، جب اس کی اراضی سے پیداوار ۹۴۸ کلو گرام گندم یا اس کی مساوی مالیت کے برابر ہو۔ اس میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ پیداوار کی مالیت ہر فصل کے لیے الگ الگ شمار کی جائے گی۔ اسی طرح پیداوار کی مقدار کے تعین کے لیے بھی کوئی واضح طریقہ کار نہیں بنایا گیا اس لیے ملک کے مختلف حصوں میں تشخیصِ عُشر کے الگ الگ معیار مقرر کیے گئے ہیں۔ کئی ضلعوں میں تو پٹواری یا تپے دار کے زیر کاشت رقبے سے متعلق ریکارڈ کی بنیاد پر ہی عُشر لگا دیا جاتا ہے اس کے لیے کئی جگہوں پر تو نمونے کی کٹائی (Model HARVEST) کر کے پیداوار کا اندازہ اور فی ایکڑ عشر کا تعین کر دیا جاتا ہے اور کہیں صرف اندازوں سے کام چلایا جاتا ہے۔ بعض علاقوں کے بارے میں یہ

بھی پتہ چلا ہے کہ وہاں عشر کی تشخیص و وصولی کا کام ہوتا ہی نہیں چونکہ عشر اسی علاقے میں خرچ ہونا ہے جہاں سے لیا جاتا ہے اس لیے ایسے علاقوں میں انتظامیہ کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا نوٹس ہی نہیں لیتی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پٹواری جس طرح خرابہ فصل کی بنیاد پر رشوت لیتا ہے اسی طرح عشر جیسے مذہبی فریضے میں بھی کھلم کھلا خورد برد کرتا ہے۔ بہت کم جگہیں جہاں کی مقامی کمیٹی کے لوگ ذمہ دار دیانتدار اور پڑھے لکھے ہیں ایسی ہیں جہاں کسی حد تک مقدار پیداوار کے بعد عشر کی تشخیص کی جاتی ہے اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ تخمینہ کی بنیاد (ESTIMATION BASIS) کو اصل پیداوار کی بنیاد (ACTUAl PROduce BASIS) سے بدل دیا جائے۔ گاؤں میں اکثر لوگ ایک دوسرے کی زمین سے حاصل ہونے والی فصل کی مقدار وغیرہ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ خاص طور پر گنا، گندم، کپاس، دھان اور دیگر بڑی فصلوں کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔

فصل کی کٹائی کے کچھ عرصہ کے اندر اندر جب مقامی کمیٹی کے ارکان مناسب سمجھیں، گاؤں والوں کا ایک عام / کھلا اجلاس گاؤں کی جامع مسجد میں بلائیں اس اجلاس میں ہر کاشتکار اپنی اپنی فصل کی مقدار سے کمیٹی کو آگاہ کرے۔ گاؤں کے سب لوگوں کی موجودگی میں کوئی شخص غلط بیانی نہیں کر سکے گا یا اس کا احتمال بہت کم ہوگا۔ مثال سے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ افضل نے دو ایکڑ گنا اپنی زمین میں، ایک ایکڑ ٹھیکے پر لی ہوئی زمین میں اور ایک ایکڑ حصہ (مضارعت) پر لی گئی زمین میں بویا وہ گنا اس نے شوگر مل پر بھیج دیا۔ وہ مقامی کمیٹی کو بتائے گا کہ ۱۰۰۰ من گنا اس کے اپنے کھیتوں سے ۶۰۰ من ٹھیکے کی زمین سے اور ۲۰۰ من مزارعت پر لی گئی زمین سے بطور حصہ ملا۔ اس طرح اس کی گنے کی فصل کی کل مقدار ۱۸۰۰ من ہو گئی جس کی مالیت مقدار نصاب (تقریباً ۲۶۵۵ روپے) سے زیادہ ہے۔ (اس میں وہ جھوٹ نہیں بول سکے گا کیونکہ اس کی اصل پیداوار بہت لوگوں کے علم میں ہوتی ہے) اب اگر زکوٰۃ و عشر آرڈیننس کی دفعہ ۶ کی ذیلی دفعہ ۲ میں دی گئی ایک چوتھائی چھوٹ بطور پیداواری اخراجات دی جائے تو ۴۵۰ من کی چھوٹ نکال کر قابل زکوٰۃ مقدار ۱۳۵۰ من رہ جائے گی۔ چونکہ ۱/۴ حصہ کی چھوٹ

اسے پہلے ہی دے دی گئی ہے اس لیے مزید چھوٹ دیے بغیر اِل کی قیمت خرید (PROCUREMENT PRICE) کے حساب سے اس کی مالیت لگا کر ۵ فیصد کی شرح سے عشر عائد کر دیا جائے۔ اگر قیمت ۱۵ روپے فی من ہے تو مالیت ۲۰۲۵۰ روپے بنے گی اور اس پر عشر کی مقدار ۱۰۱۲ء۵۰ روپے ہو گی۔ ایسا کاشتکار جو اپنی یا کرائے پر لی گئی زمین کے بجائے صرف مضارعت پر فصل بوتا ہے اسے زکوٰۃ آرڈیننس کے تحت مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ عام حالات میں صرف مضارعت پر کاشتکاری کرنے والوں کی مالی حالت خستہ ہی ہوتی ہے مگر مخصوص صورتوں میں اگر گاؤں والے اور کمیٹی کے ارکان یہ سمجھتے ہوں کہ کوئی شخص کافی مقدار میں زرخیز زمین پر کاشتکاری کر رہا ہے فصل اچھی ہے اور اس کی مالی حالت بھی اچھی ہے تو اس پر بھی عشر عائد کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسری تجویز یہ بھی ہے صرف اُن مزارعین کو مستثنیٰ قرار دیا جائے جو زکوٰۃ کے مستحقین میں شامل ہوں۔

درج بالا طریقے کے تحت ہر کاشتکار اپنی پیداوار کے حساب سے عشر دے گا جبکہ موجودہ نظام میں فی ایکڑ عشر کا اعلان کر دیا جاتا ہے مثلاً گنے پر ۱۵۰ روپے گندم پر ۷۵ روپے کپاس پر ۱۰۰ روپے فی ایکڑ۔ پھر پٹواری کے ریکارڈ کے مطابق ہر کاشتکار کے عشر کی تشخیص کی جاتی ہے جس سے ان لوگوں پر تو ظلم ہوتا ہے جن کی فصل کسی آفت سے تباہ ہو جاتی ہے یا پیداوار کم ہوتی ہے چنانچہ وہ عشر سے معافی کی درخواست دیتے ہیں اور پٹواری صاحبان رشوت لے کر خرابیٔ فصل کا سرٹیفکیٹ دے دیتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جن کی فصل بہت اچھی ہوتی ہے وہ عشر کی پوری ادائیگی سے بچ جاتے ہیں۔ اگر اصل پیداوار کو بنیاد بنایا جائے تو اس سے ایک طرف تو مجموعی طور پر عشر کی وصولی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا اور دوسری طرف ظلم و ناانصافی کا تدارک ہو سکے گا۔ اس طریقۂ کار کو استعمال میں لانے کا یہ مطلب بھی ہو گا کہ عشر کی تشخیص کے کام کو عام ریونیو سے الگ کر دیا جائے۔

زکوٰۃ کی طرح عشر کے سلسلے میں بھی یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ قطعِ نظر مذاہب و فقہ کے، نصاب اور اصل پیداوار کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام زمینوں پر مساوی محصول عائد کیا جائے۔ صرف مسلمانوں یا کچھ فرقوں کی زرعی پیداوار کو زیرِ محصول لانا اور دوسروں کو مستثنیٰ قرار دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔ مذہب سے ہٹ کر بھی تمام اہلِ ثروت و استطاعت کا یہ سماجی فریضہ

ہے کہ افلاس سے دو چار اپنے اہل محلہ و گاؤں اور ہم وطنوں کی حالت بہتر بنانے میں اپنا حصّہ ادا کریں۔ زرعی پیداوار پر اس محصول کی حیثیت ایک مذہبی فریضہ کی یا سوشل ویلفیئر ٹیکس کی ہوگی۔

زکوٰۃ کی طرح عشر کے بارے میں بعض محققین کی طرف سے ایک باریک نکتے کی نشاندہی کی گئی ہے اگر الف کی پیداوار ۹۸۰ کلوگرام ہو تو اس پر عشر ۴۹ کلوگرام لگے گا اور اس کے اپنے پاس ۹۳۱ کلو رہ جائیں گے جبکہ اگر ب کی پیداوار ۹۴۰ کلوگرام ہوئی تو وہ ویسے ہی مستثنیٰ سمجھا جائے گا۔ علماء اور اسلامی نظریاتی کونسل کو اس سلسلے میں اجتہاد کرنا چاہیے۔ البتہ میرے ذہن میں اس کا ایک حل یہ ہے کہ عشر کا نفاذ اس طرح کیا جائے کہ ادائیگی کے بعد ۹۴۸ کلوگرام گندم یا اس کے مساوی فصل کسان کے پاس بچ جائے۔ مثلاً مذکورہ بالا الف کی پیداوار پر ۱۹ کلو کی بجائے ۳۲ کلوگرام عشر عائد کیا جائے۔

اس سلسلے میں اصل اجتہاد طلب پہلو یہ ہے کہ ۵ وسق یا ۹۴۸ کلوگرام گندم کی مالیت کو نفاذِ عشر کی حد ہی رہنے دیا جائے یا چھوٹ کی حد (Exemption Limit) بنا دیا جائے۔ زکوٰۃ و عشر آرڈیننس ۱/۳ یا ۱/۴ حصّہ تک چھوٹ کی اجازت دیتا ہے اس کی بجائے اگر ۵ وسق پیداوار تک چھوٹ دے دی جائے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی اور عشر کی مجموعی وصولی پر اس کا اثر پڑے گا؟ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ مقدارِ نصاب کو چھوٹ قرار دینے کے بعد ۳۰۰۰ کلوگرام پیداوار پر عشر ۱۰۲،۵۰ کلو اور ۱۰،۰۰۰ کلوگرام پر ۵،۵۴ کلو ہوگا۔ جبکہ پہلی صورت حال میں عشر کی مقدار بالترتیب ۱۲۴،۵ کلو اور ۳۷۵ کلو ہوتی۔ (زکوٰۃ کے سلسلے میں چونکہ کوئی چھوٹ نہیں دی جاتی اس لیے اس میں اس قسم کی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے) اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ۱/۳ یا ۱/۴ حصّہ کی چھوٹ کو ختم کر کے ۵ وسق کو چھوٹ کی حد بنا دیا جائے تو عشر ایک (Progressive) ٹیکس بن جائے گا۔ کم پیداوار کے لیے چھوٹ نسبتاً زیادہ ہوگی۔ اس سے فقہی اختلاف بھی بے معنی ہو جائے گا کہ زرعی پیداوار پر اُٹھنے والے اخراجات کو منہا کیا جائے یا نہیں کونسے اور کتنے اخراجات منہا کئے جائیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اس سے عشر کی مجموعی مقدار میں اضافہ ہوگا جو انفع للفقراء ہونے کی بنا پر زیادہ بہتر صورت ہے۔ علماء سے اس سلسلے میں عمیق سوچ و بچار کی درخواست

کی جاتی ہے۔

عشر سے حاصل ہونے والی رقوم اگرچہ زیادہ تر اُسی علاقے میں خرچ ہونا ہیں جہاں سے اکٹھی ہوں، اس میں شرعی لحاظ سے کوئی قباحت نہیں بلکہ یہ بہتر ہے مگر ضروری ہے ایک مرتبہ ساری رقوم تحصیل یا ضلع کی سطح پر عشر فنڈ میں جمع ہوں۔ پھر وہاں سے ان کی تقسیم کی جائے۔ اس سے مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں کی کارکردگی کا احتساب آسان ہوگا اور رقوم کے زیادہ بہتر استعمال میں مدد ملے گی۔

موسمی حالات میں خرابی یا بعض دیگر وجوہات کی بنا پر عشر کی مقدار سال بہ سال کم یا زیادہ ہو سکتی ہے مگر مجموعی یا طویل المدت رجحان اضافے کی طرف ہوگا اس لیے فصلوں کی پیداوار کو مدنظر رکھے بغیر سالانہ سطح پر وصولیٔ عشر کا تقابل ممکن نہیں ہوگا۔

تقسیم زکوٰۃ و عشر کے بارے میں رہنما اصول

تقسیم صدقات یعنی زکوٰۃ کی آٹھ مدات قرآن پاک میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اس میں مفلس۔ محتاج یا مساکین، کارکنانِ زکوٰۃ اور تالیفِ قلوبِ المسلمین کے لیے قرآن نے حروف جار کے طور پر "ل" کا لفظ استعمال کیا ہے اور دوسری چار مدات یعنی غلاموں کے آزاد کرانے، قرضداروں (کے قرض ادا کرنے)، خدا کی راہ میں اور مسافروں کی بوقتِ ضرورت امداد کے لیے "فی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (ل اور فی کی وضاحت آگے دی گئی ہے) ان میں سے کچھ مدات وقتی حالات کے مطابق موقوف ہو سکتی ہیں اور حالات تبدیل ہونے اور ضرورت پڑنے پر دوبارہ شامل بھی کی جا سکتی ہیں۔ مستقل اور اہم مستحقینِ زکوٰۃ میں فقراء، مساکین، عاملین، فی سبیل اللہ ہیں۔ ان میں فقراء اور مساکین بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد ہی معاشرے سے فقر و افلاس کو ختم کرنا ہے چونکہ آج کل کے دور میں ملکی دفاع کا کام قومی سطح پر مربوط ہو گیا ہے، اور قومی میزانیہ اس کے تمام تر اخراجات برداشت کرتا ہے اس لیے "فی سبیل اللہ" کے مفہوم سے یہ مد فی الوقت نکل گئی ہے۔ اس طرح فقراء و مساکین کے علاوہ دین کی تعلیم تبلیغ اور یہ چار تقسیم زکوٰۃ کی اہم اور مستقل مدیں ہیں۔ البتہ ضرورت پڑنے پر جہاد، غارمین اور کسی مشکل میں پھنسے ہوئے مسافروں کے لیے بھی زکوٰۃ کی رقوم کو خرچ کیا جا سکتا ہے۔

صَرفِ زکوٰۃ کے لیے فقہ حنفی میں یہ شرط ہے کہ زکوٰۃ کی رقم وصول کرنے والے کی ملکِ تام ہو جائے تاکہ وہ اسے اپنی مرضی اور صوابدید کے مطابق استعمال میں لا سکے۔ چنانچہ ہمارے علماء کا خیال ہے کہ زکوٰۃ و عشر فنڈز کو ناداروں، حاجتمندوں، غرباء و مساکین، یتامٰی اور بیوگان کی مدد کے لیے تو استعمال کیا جائے مگر ہسپتالوں و سکولوں جیسے سماجی کاموں اور عام لوگوں کی فلاح کے لیے مطلوب بنیادی معاشی ڈھانچے کی فراہمی (جیسے سڑکوں و پلوں کی تعمیر) کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ یہ بات جزوی طور پر قرینِ قیاس بھی ہے کیونکہ سڑکوں کی تعمیر کے لیے استعمال میں لانے کے بعد اصل حق داروں کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔

البتہ علامہ رشید رضا جیسے جدید دور کے علماء اور قاضی ابو یوسفؒ، جو فقہ حنفی کے بانیاں اور صاحبین میں سے ایک ہیں، اپنی "کتاب الخراج" میں زکوٰۃ و صدقات کا ایک حصّہ سڑکوں کی بہتری کے لیے بھی تجویز کرتے ہیں کتاب کے الفاظ یہ ہیں۔ "وسَھمٌ فی اِصلاح طرق المسلمین" کچھ دوسرے محققین کا بھی نکتہ نظر یہ ہے کہ پہلی چار مدوں میں تملیک کی شرط لازم ہے جن میں فقراء، مساکین، عاملین اور مولفۃ قلوب شامل ہیں ان کے لیے قرآن پاک میں "ل" کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم انکے لیے ہیں یعنی ان کو دی جائیں تو وہ اس کے مالک شمار ہوں گے۔ جبکہ رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ اور مسافرین کے لیے "فی" کا لفظ استعمال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم اِن مصارف میں استعمال کی جائیں یہاں تملیک لازمی نہیں ہے۔ ویسے بھی رقاب اور غارمین میں رقم تو غلام کے مالک اور قرض خواہ کو ملے گی۔ قاضی ابو یوسفؒ نے سڑکوں کی اصلاح کے لیے اموالِ زکوٰۃ میں سے جو ایک حصّہ تجویز کیا ہے میری رائے میں ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے مال کے حصّہ زکوٰۃ میں سے عام لوگوں کی ضرورت کے مطابق ایک کنواں کھدوا دے۔ کنواں ایک وقف بن جائے گا اور کسی ایک کی ملکیت نہیں ہوگا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس میں اتنی تنگی نہیں ہے کہ اس نیکی و فلاح کے کام کو بھی زکوٰۃ کے دائرہ سے نکال دیا جائے۔ قدیم دور کی سڑکوں پر آج کل کی طرح اتنی لاگت بھی نہیں آتی ہوگی۔ اُن سے جھاڑیاں وغیرہ کاٹ دینا اور ان پر مسافر خانوں اور

کنوؤں کی تعمیر کی جاتی ہو گی جن کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ یہاں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ دیگر فقہی سکول تملیک کی شرط پر زور نہیں دیتے۔ اس ساری بحث کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کل کے معاشی و سماجی حالات کے مطابق تقسیم زکوٰۃ کا مسئلہ اجتہاد طلب ہے مگر ایک بات بالکل واضح ہے کہ جب ہم زکوٰۃ کو اسلام کا سماجی بھلائی کا یا فلاحی نظام گردانتے ہیں تو ہمیں مدات زکوٰۃ کی تشریح نص اور اصل روح کو مدنظر رکھتے ہوئے کھلے دل سے کرنی ہو گی۔ ورنہ معاشرے پر اس نظام کا اثر عارضی اور بالکل غیر محسوس ہو گا۔ چونکہ سنّی مسلک کے تین فقہی سکولوں اور فقہ جعفریہ کے علماء تملیک کی شرط عائد نہیں کرتے اس اس لیے فقہ حنفی کے اصول میں معمولی نرمی پیدا کر کے ہم یہ نتیجہ ضرور اخذ کر سکتے ہیں کہ انفرادی کی بجائے اجتماعی (Collective) تملیک کو مانتے ہوئے ایسی جگہوں پر صرفِ زکوٰۃ کی اجازت دے دیں جہاں مستحقین کی ملکیت اجتماعی ہو۔

تقسیم زکوٰۃ و عشر کا ایک اور پہلو تقسیم بلحاظ علاقہ ہے۔ اسلام کے دورِ اول کا طریقہ یہ تھا کہ مختلف علاقوں کے عاملین/گورنر زکوٰۃ وصول کرتے اور وہیں خرچ کر دیتے۔ البتہ اگر بچ جاتی تو دارالخلافہ میں امیر المؤمنین کے پاس بھیج دیتے ابو عبیدؒ کتاب الاموال" میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عمّالِ زکوٰۃ کو حکم دیا کہ وہ استطاعت نہ رکھنے والوں کے قرضہ ادا کریں، اُن کی شادی کے اخراجات برداشت کریں اور نادار غیر مسلم افراد کی ساری ضرورت پوری کریں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں معاذ بن جبلؓ نے یمن سے اموالِ صدقات میں سے ایک تہائی حصّہ خلیفہ کے پاس بھیج دیا حضرت عمرؓ ناراض ہوئے۔ اگلے سال نصف حصّہ اور اس سے اگلے سال سارا مال امیر المؤمنین کے پاس بھیج کر یہ وضاحت کی کہ" واللہ یہاں مجھے کوئی بھی ایسا ضرورت مند نہیں ملا جو مجھ سے کچھ صدقہ و زکوٰۃ لینے کا مستحق ہو!" حضرت عمرؓ نے بستر مرگ پر یہاں تک فرمایا کہ زکوٰۃ و صدقات جہاں سے لیے جائیں وہیں تقسیم کر دیے جائیں یہاں تک کہ ہر دیہاتی ..ا اونٹ کا مالک بن جائے۔ یہ روایات ہمارے زیر نظر مسئلہ کو بہت بڑی حد تک حل کر دیتی ہیں۔ اگر وسائل اجازت دیں تو نہ صرف غریب و مقروض مسلمانوں کے قرضے مال زکوٰۃ سے ادا کیے جا سکتے ہیں بلکہ مسلم حاجت مندوں کی مدد بھی کی جاسکتی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے اس فلاحی نظام میں کافی وسعت اور لچک موجود

ہے۔ ہمیں اپنے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے غربا، مساکین، (کم آمدنی والوں) کی حتمی بھلائی کے لیے کوئی مؤثر طریقہ اپنانا ہے۔ جس سے وسائل ضائع نہ ہوں، معاشرے پر دیرپا اور اچھے اثرات مرتب ہوں اور تمام طبقوں کی معاشی حالت بہتر ہونے سے سماجی و دینی بندھن مضبوط ہو جائیں۔

سرِ ماخذ سے لی گئی لازمی زکوٰۃ کی سب سے زیادہ مقدار بینکوں کی رقوم سے منہا کی جاتی ہے۔ بینک پورے ملک سے جمع کی گئی بچتوں اور ان کی زکوٰۃ کو اپنے صدر دفاتر تک پہنچا دیتے ہیں اس طرح زکوٰۃ پورے ملک سے مرکزی سطح پر کاٹی جاتی ہے۔ چنانچہ مرکزی زکوٰۃ کونسل پورے ملک میں دی گئی ترجیحات کے تحت اس کو تقسیم کرتی ہے۔ حتمی تقسیم مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں کی وساطت سے یا پھر مستحق اداروں کو عطیات کی شکل میں ہوتی ہے۔ عُشر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ موجودہ صورتِ حال تو یہ ہے کہ پورے ملک میں صرفِ عشر کا کوئی ایک طریقہ رائج نہیں اور نہ ہی مصارف متعیّن کیے گئے ہیں۔ البتہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ عشر جہاں سے لیا جائے، وہیں خرچ کیا جائے۔ میری رائے میں معاملہ کو اس طرح ادھورا چھوڑ دینے سے کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ کسی منصوبہ بندی کے بغیر نہ تو رقوم صحیح طور پر اکٹھی ہوں گی۔ اور نہ ہی سائنٹیفک بنیادوں پر ان کو زیادہ سے زیادہ بہتر انداز میں خرچ کیا جا سکے گا۔ حکومت کی طرف سے نگرانی، راہنمائی یا خبرگیری اور احتساب کے بغیر رقوم ضائع ہوں گی اور اگر عشر صرف ان علاقوں میں خرچ کر بھی دیا جائے جہاں سے حاصل ہو تو زیادہ زرخیز زمین یا زیادہ آمدنی والے کچھ علاقوں پر تو اچھے اثرات ہوں گے مگر علاقائی عدم مساوات کو مزید وسعت ملے گی جس سے آج کل کے دور میں کئی ایک مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

صرفِ عُشر کے سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ رقوم کو تحصیل و ضلع کے دائرہ میں لایا جائے۔ ملک میں آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور وسائل روزگار و بہتر سہولتوں کی تلاش میں شہروں کو منتقلی کا رجحان اس بات کا شدت سے متقاضی ہے کہ ہم زراعت پر مبنی گھریلو صنعتوں کے قیام سے دیہات میں ہی صنعتی انقلاب برپا کر دیں۔ چنانچہ رقوم تحصیل و ضلع کی سطح پر اکٹھی ہوں۔ بعد میں ضلعی انتظامیہ اور مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں سے مل کر رقوم کی تقسیم

کا تعین کیا جائے ۔ زکوٰۃ انتظامیہ کی طرف سے تقسیم کی جانے والی رقوم کا ایک کم سے کم مقرر حصّہ (مثلاً ۔ ۱فیصد) نقد عطیات یا غربا کی ضرورت پر خرچ کر دیا جائے اور زکوٰۃ و عشر کو دستکاری اور چھوٹے درجوں کے صنعتی منصوبوں میں لگایا جائے ۔ ان منصوبوں میں قالین، غالیچے، اشیائے خورد و نوش کی پراسیسنگ دھاگہ، سلے سلائے کپڑے، زرعی پیداوار کی پراسیسنگ پولٹری و ڈیری فارم، نہروں یا راجباہوں پر لگائے جانے والے بجلی پیدا کرنے کے چھوٹے یونٹ یا بائیوگیس پلانٹ، چھوٹا انجنیئرنگ کا سامان اور مختلف صنعتوں میں استعمال ہونے والے صنعتی اوزار کے کارخانے وغیرہ شامل ہیں ۔ تجربہ کامیاب ہونے پر ضلعی سطحوں پر کھاد، سیمنٹ اور چینی بنانے کے کچھ کارخانے بھی اس لسٹ میں شامل کیے جا سکتے ہیں ۔ تملیک کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اور مستحقین کے مفاد کو محفوظ بنانے کے لیے یہ منصوبہ جات متعلقہ مقامی زکوٰۃ کمیٹی کی اجتماعی ملکیت میں دیے جائیں ۔ ان کی آمدنی بھی کمیٹی کی آمدنی ہونے کی حیثیت سے غربا و مساکین کی ہی ہوگی ۔ ان میں ملازمت کے سلسلے میں پہلا حق مستحقینِ زکوٰۃ کا ہوگا ۔ اس میں بیواؤں جیسے مستحقین میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں تاکہ ان کی باعزت بحالی و امداد کا مستقل انتظام ہو سکے ۔

اموالِ زکوٰۃ سے غریب طبقہ کے لیے مکانات کی تعمیر راجح بات نہیں ہے ۔ کثیر رقم خرچ کرنے کے بعد بھی مفلسی اور محتاجی قائم رہے گی ۔ ترجیحاً زکوٰۃ اس طرح خرچ کی جائے کہ مستقل بحالی کا ہدف پورا کیا جا سکے ۔ پھر اس میں سیاسی و خاندانی بنیادوں پر جانبداری کا خدشہ بھی زیادہ ہے ۔

بجلی و ٹیلیفون کے کھمبوں و تاروں کی فراہمی اور سڑکوں اور پلوں کی تعمیر تو عشر کی رقوم سے نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ایک تو ان پر خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے اور دوسرے ان کا فائدہ غریبوں کی بجائے امیروں کو زیادہ ہوگا جو کہ زکوٰۃ کے نظام کی اصل روح کے خلاف ہے ۔ البتہ سکولوں اور ٹریننگ سنٹروں کا قیام وافر فنڈز کے میسّر ہونے کی صورت میں تقسیمِ عشر کی مدات میں آسکتا ہے ۔

جہالت بجائے خود غربت و افلاس کا ایک سبب ہے ۔ جب بے روزگار مردوں اور کام کرنے کی خواہش مند خواتین کو قالین بافی، کپڑوں کی سلائی، بان کی بٹائی، الیکٹرانکس یعنی بجلی کے سامان کی مرمت، فرنیچر سازی اور دیگر کام آتے ہی نہیں ہوں گے تو ان کی مستقل بحالی ایک خواب بن کر رہ جائے گی ۔ چنانچہ دو یا تین دیہات کی سطح پر تعلیم اور ٹریننگ کے لیے کمرشل

ٹریننگ سنٹر قائم کیئے جا سکتے ہیں جو زکوٰۃ کمیٹی کی ملکیت میں ہوں گے ۔ علاقے کے لوگوں کی آمدنی کے معیار کے مطابق حق دار لوگ یہ سہولت مفت حاصل کریں گے جبکہ خوشحالی اور استطاعت رکھنے والوں سے فیس لی جائے گی ۔ جب ان منصوبہ جات سے آمدنی شروع ہو جائے گی تو نہ صرف غربت و افلاس کے ستائے ہوئے طبقہ کی مالی حالت بہتر ہو گی ۔ بلکہ سماجی بہبود کے کام ایک منظم انداز میں کیئے جا سکیں گے اور ترقیاتی مقاصد کے لیے بھی ان کا اثر واضح اور دور رس ہو گا ۔

زکوٰۃ کی رقوم کے درج بالا اسکیم کے تحت ترقیاتی منصوبہ جات میں استعمال کا جواز ایک دوسری جہت سے بھی ملتا ہے ۔ گداگری ایک بہت بڑی برائی اور سماجی لعنت ہے ۔ یہ بات بالکل عام فہم ہے کہ زکوٰۃ کی رقوم سب سے پہلے غربا اور ناداروں میں تقسیم کی جائیں اور ایسے حالات پیدا کیئے جائیں کہ کسی شخص کو اپنی بنیادی ضروریات کے سلسلے میں سوال کرنے کی حاجت نہ رہے ۔ اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے ۔ مگر گداگری کا مسئلہ صرف غربت کا پیدا کردہ نہیں ہے ۔ اس کے اسباب و محرّکات میں فقر و افلاس ، بے روزگاری ، تن آسانی کی وجہ سے پیشہ ورانہ ترغیبات ، خرکار گروہوں کی کاروائیاں اور ان کا پولیس سے گٹھ جوڑ اور معذوری اور کسمپرسی شامل ہیں ۔ پچھلے چند سال کے گداگر خانوں کے تجربہ اور موجودہ صورت حال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غربت یا افلاس اس کا سب سے بڑا محرک نہیں ہیں ۔ عین ممکن ہے کہ گداگروں اور فقیروں کی کثیر تعداد کسی جبر و اکراہ کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہو ۔ راقم کی یہ تجویز ہے کہ گداگری کے خاتمہ کے لیے ایک کمیشن کی تشکیل کی جائے جو متعلقہ حل طلب مسائل اور امور پر غور و خوض کر کے اِنسداد کے لیے مؤثر تدابیر تجویز کرے ۔ اس ضمن میں قانونِ نفقات سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جس کے تحت محارم کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مفلس اقربا کی ضمانت لیں اور ہر مناسب و جائز حربہ کو استعمال لائیں جس سے ایسے اقربا کو گداگری سے بچایا جا سکے ۔

البتہ یہ بات حقیقت ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں اگر ہم زکوٰۃ و عشر کی تمام رقوم بھی گداگری کی لعنت کو ختم کرنے میں صرف کر دیں گے تو پھر بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا ۔ اس لیے اس مسئلہ کو دیگر اقدام سے حل کیا جائے جس میں انتظامیہ کی اصلاح اور پیشہ ور گروہوں کا استیصال بھی

شامل ہیں ۔ زکوٰۃ فنڈز کے خاطر خواہ حصّہ کو اس مد میں لگا کر ضائع نہ کیا جائے ۔ بلکہ درج بالا اسکیم کے تحت ملک میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کا قیام عمل میں لا کر نہ صرف بے روزگاری کو ختم کیا جائے بلکہ اپاہجوں اور معذوروں کے لیے مستقل ذریعۂ آمدنی کا اہتمام بھی کیا جائے تاکہ وہ غربت کی وجہ سے مانگنے پر مجبور نہ ہوں ۔

عشر کی مد سے دینی مدارس کی امداد بھی ہمارے دیہی معاشرے کے دینی مزاج رکھنے والوں کا ایک پہلو رہا ہے ۔ پچھلے ایک عشرے زکوٰۃ فنڈز سے کئی مدارس کو امداد فراہم کی جا رہی ہے جو عام طور پر صوبائی زکوٰۃ کونسل کے عطیہ کی شکل میں ہوتی ہے ۔ میری رائے میں ایسے انتظامات کی ضرورت ہے کہ سیاسی یا گروہی بنیادوں پر جانبداری کا مظاہرہ نہ کیا جا سکے چنانچہ مقامی زکوٰۃ کمیٹیاں اپنے کھلے اجلاس میں اس بات کا تعیّن کریں کہ ان کی تحصیل یا ضلع کے کس مدرسہ کی کتنی امداد کرنا ہے ۔ تحصیل کی سطح کے شعبہ زکوٰۃ کے نمائندے اس سلسلے میں رابطے کا فرض سرانجام دے سکتے ہیں وہ دیہی عوام کو ہر مدرسے کی تعلیمی صلاحیت اور وسائل کی ضرورت سے آگاہ کریں گے تاکہ ان کے استحقاق کا فیصلہ کیا جا سکے ۔

صَرفِ زکوٰۃ کا طویل المدت منصوبہ

گذشتہ صفحات میں بیان کی گئی اسکیم کے مطابق ایسے عملی اقدامات کی ضرورت ہے جس سے زکوٰۃ و عشر کی وصولی زیادہ سے زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ صَرفِ زکوٰۃ کا نظام بھی اس طرح قائم کیا جائے کہ اس کے اثرات سماجی فلاح و بہبود اور اقتصادی ترقی دونوں پر ہوں لیکن جب تک زکوٰۃ فنڈز میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا اس وقت تک زکوٰۃ کی رقوم کے بہتر سے بہتر استعمال کے لیے ایک طویل المدت زکوٰۃ فلاحی منصوبہ بنایا جا سکتا ہے ۔ اس منصوبے کے تحت زکوٰۃ فنڈز کا ایک معقول حصّہ (مثلاً فنڈز کا ۲۵ فیصد یا جتنا ضروری و مناسب ہو) ہر سال ملک کے چاروں صوبوں کے کچھ منتخب اضلاع (ہر صوبہ میں کم سے کم ایک) میں جو نسبتاً پسماندہ ہوں درج بالا اسکیم کے تحت اس طرح خرچ کیا جائے کہ سال کے خاتمہ تک کم سے کم اُن اضلاع کی حد تک مستحقین کا فقر و افلاس ختم ہو جائے اور آئندہ کے لیے جب تک تمام اضلاع میں باری

باری غربت ختم کرنے کے لیے ایسے ہی نہ کرلیا جائے اس وقت تک ان اضلاع کو زکوٰۃ کی حد تک غیر مستحق قرار دے دیا جائے ۔ اس منصوبہ پر عمل پیرا ہونے میں جو عملی دشواریاں پیش آسکتی ہیں ان کے تدارک کا پہلے سے بندوبست کرلیا جائے مثلاً مستحقین کی ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں نقل مکانی کر کے مکرر فائدہ اٹھانے کے رجحان کو ختم کرنے کے لیے ہر ضلع کے مستحقین کی فہرستیں ایک دفعہ مکمل کرلی جائیں اور منصوبے کے تحت صرف درج فہرست مستحقین کو ہی شامل سمجھا جائے۔

اس منصوبے کے ابتدائی مراحل تجویز کردہ اسکیم کی کارکردگی اور کامیابی کے لیے ایک نمونہ (Model) کا کام دیں گے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ گھریلو دستکاریوں وغیرہ کے قیام میں تمام معاشی و معاشرتی تحفظات کا دھیان رکھا جائے اور مؤثر احتساب کو یقینی بنایا جائے ۔ فقہاکی یہ رائے ہے کہ حکمرانوں اور انتظامیہ کے افراد کو اموالِ زکوٰۃ و صدقات کا بالکل اس طرح انتظام و انصرام کرنا چاہیے جس طرح یتیم کا ولی مالِ یتیم کے ضمن میں ذمہ دار اور جوابدہ ہوتا ہے ۔

خلاصہ

زکوٰۃ و عشر کی وصولی اور تقسیم کا موجودہ نظام اتنا غیر مؤثر ہے کہ اس سے زکوٰۃ کا بنیادی مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آتا ۔ اس کے لیے انتظام و انصرام میں اصلاح کے ساتھ ساتھ ایک طرف تو زکوٰۃ کی وصولیوں کو بڑھانے اور دوسری طرف اس کی بہتر سے بہتر تقسیم کے لیے منظم کوششوں کی ضرورت ہے ۔ ناانصافی اور حکومت کی طرف سے مصلحت پسندی کے احساس کو ختم کرنے کے لیے آبادی کے تمام طبقوں کو قطع نظر ان کے مذہب و عقیدہ کے سماجی بھلائی کے اس محصول کے تحت لایا جائے ۔ زیادہ سے زیادہ اموال پر لازمی زکوٰۃ عائد کی جائے ۔ خصوصاً تجارتی و صنعتی اموالِ تجارت پر زکوٰۃ کو ان کے مالکان کی صوابدید پر ہی نہ چھوڑا جائے ۔ عشر کی تشخیص کے کام کے لیے پٹواریوں اور ٹھیکے داروں کے ریکارڈ پر بھروسہ کرنے کی بجائے اصل پیداوار کو بنیاد بنایا جائے ۔ نمونے کی کاشت (Model HARVEST) کی بنیاد پر تمام کاشتکاروں پر ایک ہی شرح سے فی ایکڑ عشر کا نفاذ ناانصافی پر مبنی ہے ۔ علماء اور اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے مقدارِ نصاب (۹۴۸ کلوگرام گندم) کو "چھوٹ کی حد"

(EXEMPTION LIMIT) بنانے کے بارے میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں عشر کی رقوم اور دیہاتی آبادی کی آمدنی پر اس کے اثرات کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ آرڈیننس میں دی گئی ایک تہائی یا ایک چوتھائی کی چھوٹ کو ختم کر کے مقدارِ نصاب کی ہی چھوٹ دے دی جائے تو اس سے عشر کی وصولی اور لوگوں کی آمدنی کی تقسیم پر کیا اثر پڑے گا۔ زکوٰۃ و عشر کی رقوم کے استعمال کے ضمن میں انقلابی تبدیلی لائی جائے، اور عشر سے اکٹھی ہونے والی رقوم سے دیہات کی سطح پر گھریلو دستکاریوں اور دیگر چھوٹی صنعتوں کے یونٹ لگائے جائیں۔ ایسے یونٹ مقامی کمیٹی / مستحقین کی ہی ملکیت ہوں ان میں روزگار کا حق بھی پہلے اُنہیں کا ہو۔ ایسے معذوری کی وجہ سے کام نہ کر سکنے والے مردوں و بیوہ خواتین کو ان یونٹوں کے حصص دیے جائیں تاکہ ان کی ضروریات کا مستقل انتظام ہو سکے۔ مقامی سطح پر وصولی و صرفِ زکوٰۃ کے مؤثر احتساب کا انتظام کیا جائے۔ عوام کو اس محصول کی مذہبی حیثیت کے بارے میں وقفے وقفے سے آگاہ کیا جائے اور اس میں خرد برد کو نہ صرف مذہبی و سماجی برائی کے طور پر پیش کیا جائے بلکہ اس میں ملوّث افراد کو سبق آموز سزائیں بھی دی جائیں۔ گداگری کو ختم کرنے کے لیے زکوٰۃ کی رقوم کے استعمال سے زیادہ دوسرے محرّکات پر قابو پایا جائے جن میں انتظامیہ کی اصلاح اور حکومت کی طرف سے متمول محارم یعنی رشتہ داروں کو ان کے مفلس و محتاج عزیزوں کی خبر گیری کا احساس دلانا یا ذمہ دار ٹھہرانا بھی شامل ہیں۔ وصولی و تقسیم کے نظام کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے دو یا تین مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں کی سطح پر ایک ٹرسٹ بھی بنایا جا سکتا ہے جو درجِ بالا اسکیم کے مطابق ایک فلاحی معاشرے کے قیام کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب انتظامات کو یقینی بنائے۔ زکوٰۃ و عشر کو ایک کامیاب فلاحی معاشی نظام بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ملک سے رشوت، سفارش، اقربا پروری، اسمگلنگ، فحاشی اور قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ جیسی سماجی، اخلاقی اور معاشی برائیاں ختم کی جائیں تاکہ ایک دوسرے سے محبت، رضاکارانہ طور پر دوسروں سے ہمدردی اور قومی یکجہتی خود غرضی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے رجحان کی جگہ لے سکیں۔ نظامِ زکوٰۃ کو قومی و علاقائی سیاست سے الگ رکھا جائے۔ محض تخیلاتی بیانات اور نعرے بازی کی بجائے معاشرے اور نظام دونوں میں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں تاکہ عام آدمی کی فلاح و بہبود کے مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔

فقہی، علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی

منہاج

لاہور

جنوری ۱۹۸۳ء سے یہ مجلہ مرکزِ تحقیق دیال سنگھ لائبریری سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے مندرجہ ذیل نمبر شائع ہو چکے ہیں اور اہل علم کا خیال ہے کہ اس معیار کا علمی و تحقیقی مجلہ آج تک برِصغیر پاک و ہند میں اردو زبان میں شائع نہیں ہوا ہے۔

۱ پہلا	اجتہاد نمبر		قیمت۔۔۔ ۲۰ روپے
۲ دوسرا	عشر نمبر		قیمت۔۔۔ [illegible] روپے
۳ تیسرا	عظمت [illegible] نمبر		قیمت۔۔۔ ۱۰۰ روپے
۴ چوتھا	اسلامی نظامِ عدل نمبر	(جلد اوّل)	قیمت۔۔۔ ۳۶ روپے
۵ پانچواں	اسلامی نظامِ عدل نمبر	(جلد دوم)	قیمت۔۔۔ ۳۶ روپے
۶ چھٹا	حیثیت نسواں نمبر	(جلد اول)	قیمت۔۔۔ ۳۶ روپے
۷ ساتواں	حیثیت نسواں نمبر	(جلد دوم)	قیمت۔۔۔ ۳۶ روپے
۸ آٹھواں	حیثیت نسواں نمبر	(جلد سوم)	قیمت۔۔۔ ۳۶ روپے
۹ نواں	مصادر شریعت نمبر		قیمت۔۔۔ ۱۰۸ روپے
۱۰ دسواں	اسلامی معیشت نمبر		قیمت ۔۔/۱۶۰ روپے
۱۱ گیارھواں	نفاذ شریعت نمبر		قیمت ۔۔/۱۶۰ روپے

پوری فائل طلب کرنے پر خصوصی رعایت۔ علماء، وکلاء اور طلبہ کیلئے مزید رعایت ہوگی۔